شفیق الرحمٰن

دجلہ

شفیق الرحمٰن

۱۹۸۰

فہرست

نیل

قاہرہ پہنچ کر اپنی مصری دوست کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے نعرہ لگایا ”کہاں ہو؟“ میں نے بتایا کہ المصر میں ہوں، بلکہ قاہرہ میں۔

بولا ”بس ایک منٹ میں پہنچتا ہوں۔ تم کہیں اِدھر اُدھر مَت جانا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔“

چنانچہ جب وُہ مشرقی روایات کے مطابق تقریباً دو گھنٹے کے بعد پہنچا تو میں ہوٹل کے باہر اچھے خاصے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ یہ سب حضرات پھیری والے اور چھابڑی والے تھے جو نہایت ضروری اور کارآمد اشیاء پیش کر رہے تھے۔ ایک صاحب گھوڑے کی زین کوڑیوں کے مول بیچنا چاہتے تھے۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ اگر میں نے اس قدر بڑھیا اور سستا اُونٹ ہانکنے کا چابک نہ خریدا تو عُمر بھر پچھتاؤں گا۔ ساتھ ساتھ بچّوں کے پنگھوڑے، عورتوں کے لیے کشیدہ کاری کا سامان، پودے تراشنے کی مشین، مضبوط اور دیرپا قُفل، بجلی کے بلب اور فٹ بال

جن کی ضرورت سیّاحوں کو ہر وقت رہتی ہے دینا چاہتے تھے۔

میرے دوست نے ٹھیٹھ عربی میں اُن سے کچھ کہا اور وہ فوراً منتشر ہو گئے۔

بغل گیری کی اہم رسم کے بعد اس نے پوچھا۔ ”بتاؤ کیا دیکھو گے؟“

یہ سوال بالکل اس طرح کیا گیا تھا جیسے جنگلوں میں رہنے والے مہاتما کسی چیلے کی تپسّیا سے خوش ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ بول بچّہ کیا مانگتا ہے؟

سوال کی اہمیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میں نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ”یوں تو خُدا کا دیا سب کچھ ہے لیکن جب بھی اس شہر میں آیا حالات کو ساز گار نہ پایا۔ کبھی جنگ تھی اور کبھی امن۔ ہر مرتبہ قاہرہ نے مجھے دیکھا لیکن میں قاہرہ کو نہ دیکھ سکا۔“

”تو یوں کرو کہ کوٹ اور ٹائی اُتار کر ہوٹل میں رکھو۔ سَر کے بال پریشان کر لو۔ چہرے سے تجسس کا اظہار دُور کرو۔ چلتے وقت ہر راہگیر کو گھورو اور دوسروں کے معاملات میں بلا تکلّف دخل اندازی کرو۔ لوگ تمہیں اجنبی نہیں سمجھیں گے۔“

دِن بھر میں نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ نتائج نہایت تسلّی بخش تھے۔

شام کو ہم سابق شاہ فاروق کے عابدین محل میں داخل ہوئے، جو قرونِ وسطےٰ سے

کسی فرانسیسی بادشاہ کی رہائش گاہ معلوم ہوتی تھی، یا کسی اطالوی شہزادے کا وِلا۔

عالیشان عمارتیں، سنگِ مَر مَر کے بُت، خوشنما قطعے اور بوندیں بکھیرتے ہوئے فوّارے، دیوی وینس کا حسین و جمیل مجسمہ، بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مصنوعی چشمے رنگین قمقموں کی روشنی میں جھِل مِل کر رہے تھے۔

بے حد لمبی قمیض پہنے ہوئے ایک ویٹر آیا اور ہمیں تالاب کے کنارے لے گیا، جہاں ایک میز پر میرے دوست کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی اور بتایا۔ ”ابھی نیل کی سیر کا وقت نہیں ہوا۔“

”کوئی خاص وقت ہوتا ہے؟“

”چاند ابھی سَر پر ہے۔ کچھ دیر کے بعد کرنیں تِرچھی پڑیں گی۔ کِرنوں کا زاویہ صحیح ہولے پھر نیل کی سیر ہو گی۔“

یکلخت اس امر کا انکشاف ہوا کہ میرا دوست آرٹسٹ بھی ہے۔

MENU کے کارڈ کا مطالعہ کیا اور پوچھا۔ ”کباب اور کوفتے تو ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ وَہی نم؟ اس نام میں سراسر نسوانیت ہے۔۔ جیسے خانم۔۔۔۔“

"کھانے کی چیز ہے۔ دودھ جما کر بنائی جاتی ہے اور کھٹّی ہوتی ہے۔" اُس نے بتایا۔

کھانوں کے آخر میں پُڈنگ اور کافی کے بعد لکھا تھا۔۔ سمیعہ جمال (جسے مصری گمال پڑھتے ہیں)۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

"یہ واقعی لڑکی ہے۔ مشہور رقّاصہ۔ تم نے نام تُو سُنا ہو گا۔ آج رات اس کا ناچ ہے۔"

"کب ہو گا؟"

"کھانا ختم ہو لے تب۔ کھاتے وقت ہم اِدھر اُدھر نہیں دیکھا کرتے۔۔۔۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ تم نے کوفتے نہیں لیے۔۔۔۔"

"یہ تو کباب ہیں۔"

"کباب تو وہ ہیں۔" اس نے تِکّوں کی طرف اشارہ کیا۔

تالاب کے چاروں طرف لوگ بڑے انہماک سے کھانا کھا رہے تھے۔ دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لیبارٹری میں بہت سے سائنس دان خوردبینوں پر جھکے

ہوئے ہوں۔

ایک طرف آرکسٹرا مِسکی کرا سکو کی مشہور دُھن شہزادی بجارہا تھا۔ سِمفنی کا یہ وہ حصّہ تھا جہاں شہزادی بڑھتے ہوئے طوفان کا قصّہ سُناتی ہے۔

"یہ قصّہ بغداد کا ہے، دُھن اِس علاقے کی ہے، لیکن نغمہ نگار یورپین ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔" وہ بولا۔

"افسوس کی بات تو ہے لیکن کیا کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے موضوع تو یک طرف رہے، خود ہمارے علوم وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ مشرق پر ریسرچ اکثر برٹش میوزیم میں کی جاتی ہے۔ ابنِ خلدون، رازی، بو علی سینا، ابنِ بطوطہ ، بابر اور دیگر شہرۂ آفاق ہستیوں کی تصانیف ہم پہلے انگریزی

میں پڑھتے ہیں۔ رہ گئی ہماری موسیقی جس پر ہم اس قدر فریفتہ ہیں وہ سکھائی جاتی ہے پڑھائی نہیں جاتی۔ کسی نے اسے لِکھا اور چھاپا نہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ شاید اِس لیے کہ ہمارے علوم و فنون سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ ظاہر ہے

فنکار کا بٹیا سدا فنکار نہیں ہوتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ طبابت ورثے میں ملے۔ لہٰذا بہت کچھ ضائع ہوتا رہا ہے اور ضائع ہوتا رہے گا۔"

دہی نم ختم ہو چکی تو میں نے پوچھا۔ "سمیعہ جمال کب آئے گی؟"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ تھوڑے سے کوفتے اور لو۔"

میں نے چند کباب سامنے رکھ لیے۔

چاند ڈھل چکا تھا۔ اور لوگوں کو کھانا چڑھ رہا تھا اور وہ جمائیاں لے رہے تھے۔

دفعتاً ہلچل مچی۔ جیسے آدھی رات کو کسی برانچ لائن کے اسٹیشن پر ٹرین آنے سے پہلے ہوتا ہے۔

آرکسٹرا تبدیل ہو رہا تھا۔ لمبے لمبے چغوں والے حضرات تشریف لا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قبل از مسیح کے ساز تھے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے ایک الف لیلوی دُھن چھیڑی۔ جیسے کوئی فراق زدہ عاشق یا معشوق، یا دونوں، از حد کرب کی حالت میں بھَوں بھَوں کر رہے ہوں۔

سمیعہ کمال کیا آئی، طوفان آ گیا، زلزلہ آ گیا۔

ساز تھرّآے۔ واللہ کے نعرے لگے۔ اور رقص شروع ہوا۔ اس کی انگلیوں میں مجیرے تھے جنہیں وہ بڑی فیّاضی سے استعمال کر رہی تھی۔ جو تھوڑا سا لباس اس نے ازراہِ کرم پہن رکھا تھا، وہ ملتان کی گرمیوں کے لیے موزوں ہو سکتا تھا لیکن قاہرہ کی خنک رات کے لیے غالباً مناسب نہیں تھا۔

مشرقِ وسطےٰ کا یہ رقص خوب ہے۔ اس میں آرٹ کم ہے اور تھِرکنا زیادہ۔ جنبش اتنی تیز کہ نگاہیں ساتھ نہیں دے سکتیں۔ بالکل جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا جائے۔

پہلے تو وہ آرکسٹرا والوں کے قریب ناچتی رہی، پھر میزوں کا رُخ کیا۔ راستے میں ستون آیا تو اس کے گرد تین چار چکر لگا دیئے۔ ایک کُرسی سے کسی کا بچّہ اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا۔ بچّہ یا تو عادی تھا اور پہلے بھی اُچھالا جا چکا تھا یا بالکل سہما ہُوا تھا۔ وہ رویا نہیں۔

ناچتے ناچتے وہ پانی کے اتنے قریب آ جاتی کہ لگتا تھا کہ اب گری، اب گری، لیکن اس کا پاؤں ایک دفعہ بھی نہیں پھسلا۔ نہ اس پر کششِ ثقل کا اثر ہوا۔ ا

پہلی میز، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں۔۔۔۔ پھر ہماری باری آئی۔

ہمیں دیکھ کر وہ پہلے تو مُسکرائی، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجیرے بجے، بازو تھِرکے، اور قلابازی سی لگا کر وہ بالکل قریب آگئی۔ اب ہم تینوں کی ناکوں کے درمیان کُل پانچ چھ انچ کا فاصلہ ہو گا۔ مجیرے گویا کانوں میں بج رہے تھے۔

اس نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی اور مُسکرائی۔

''ہمیں بھی مُسکرانا چاہیئے۔'' میرے دوست نے سرگوشی کی۔

میں فوراً مُسکرانے لگا، ایک دفعہ تو میں نے آنکھیں بھی بند کیں۔

سمیعہ نے کندھے مٹکائے، کمر کو چار پانچ بَل دیئے اور چہرے کو آسمان کی طرف اُٹھالیا۔

''واللہ!'' ساتھ کی میز سے کسی نے نعرہ لگایا۔

خُنک جھونکوں سے اس کی زلفیں لہرا رہی تھیں۔ سازندوں نے ایک نغمہ چھیڑا اور مل کر گانے لگے۔

''یہ کیا گا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہایت مہمل گانا ہے۔ بالکل بے معنی اور لغو۔۔۔ یہ فلمی گیت ہے۔ تم باتیں

مت کرو۔ ”میرے دوست نے پھر سرگوشی کی۔

سمیعہ نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کرلیں۔ اب وہ خوب تھِرک رہی تھی اور دل لگا کر ورزش کر رہی تھی۔ جب وہ اگلی میز پر گئی تو میرے دوست نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

بقیہ میزوں کو بھگتا کر وہ واپس سازندوں کے پاس چلی گئی۔

”کیا خیال ہے؟“ میرے دوست نے پھر سرگوشی کی۔ حالانکہ کوئی بھی آس پاس نہیں سُن رہا تھا۔

”کِس کے متعلق؟“

”سمیعہ گمال کے متعلق۔“

”ہمارے ہاں گمال کو جمال پڑھتے ہیں۔“

”نہیں! اس کا رقص کیسا ہے؟“

”طبی نکتۂ نظر سے ایسی رقص صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس سے کمر کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ بھوک کھُل کر لگتی ہے اور متواتر اُچھل کود سے جگر بھی

بیدار رہتا ہے۔‘‘

’’ہائے، تم سمجھے نہیں۔ طبّی رائے کون لے رہا ہے؟فنّی زاویے سے بتاؤ۔‘‘

’’فن کا تو پتہ نہیں لیکن اگر ایسا ناچ اہرام سے برآمد کی ہوئی کسی فرعون کی ممّی کے سامنے کیا جائے تو ممّی چھلانگ مار کر اُٹھ کھڑی ہو۔‘‘

’’اس علاقے کا رقص ایسا ہی ہے۔ مگر پبلک تو بڑے شوق سے دیکھتی ہے۔ بلکہ حاضرین میں سے کئی تو تسبیح بھی پھیرتے رہتے ہیں، اگرچہ دوسرے ہاتھ میں مشروب ہوتا ہے۔‘‘

’’پبلک عادی ہو چکی ہے۔ پبلک اکثر عادی ہو جایا کرتی ہے۔‘‘

قمقمے بجھا دیئے گئے۔ ساز مدھم پڑ گئے۔ سمیعہ نے ایک ہلکا سا لبادہ اوڑھ لیا۔

اب ایک اور طرح کا رقص شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ موسیقی کے زیروبم کے ساتھ ساتھ وہ ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں تیر رہی تھی۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ دفعتاً سمیعہ کو دورہ سا اُٹھا۔ اس نے لبادہ ایک

طرف پھینک کر چھلانگ ماری، سازندوں نے بھی گیئر بدلا۔ اور وہی دھما چوکڑی پھر شروع ہو گئی۔

فاروق کے محل میں حُسن تھا، خمار تھا، چنچل پن، چھیڑ چھاڑ، راگ رنگ سب کچھ تھے۔ فقط فاروق نہیں تھا۔

ہم باہر نکلے تو میرے دوست نے چاند کا دوبارہ معائنہ کیا اور فیصلہ سُنایا۔ ابھی وقت نہیں ہوا۔ چلو مینا چلتے ہیں۔"

جنگ کے دونوں میں اہرام کے پاس مینا کیمپ تھا اور مینا ہاؤس ہوٹل۔ ہوٹل اب بھی ہے۔

میں نے اہرام کو بارہا دیکھا تھا۔ علی الصبح، غروبِ آفتاب کے وقت، چاندنی میں، چلچلاتی دھوپ میں۔

چاندنی میں اہرام کو دیکھ کر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ کسی اور عظیم عمارت کو دیکھنے سے نہیں ہوتے۔

اہرام خوشنما نہیں ہیں۔ نہ پُر ہیبت و سنگلاخ ہیں۔ انہیں نستعلیق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پتھروں کے یہ ڈھیر بے حد سادہ سے ہیں۔ جیسے ریاضی کے کسی طالبِ علم نے تکون بناتے وقت چند خطوط کھینچ دیئے ہوں۔ اس کے باوجود ان میں انوکھاپَن ہے۔ ان سے عظمت ہویدا ہے اور یہ پُر کشش ہیں۔

یہ انسانی تاریخ کا اوّلین ترین باب ہیں۔

یُونان کے عہدِ زرّیں سے صدیوں پہلے جب دنیا کے باشندے غاروں اور جھونپڑیوں میں رہتے تھے، تب مصر کے بادشاہوں کے دل میں لافانی بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کسی قسم کی مشینوں کی مدد کے بغیر انسان نے سینکڑوں میل دُور پہاڑوں سے پتھر کاٹے۔ نیل میں کشتیاں چلیں۔ پتھر آئے تو انہیں تراش کر محض بازوؤں کی قوّت سے ایک دوسرے کے اوپر تہوں میں بڑی نفاست سے چُنا گیا۔ بیس برس لگے لیکن انتظار کیا گیا اور چٹیل میدان میں پہاڑ کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد پانچ ہزار سال تک انسان نے اتنا زبردست تعمیری کارنامہ سر انجام نہیں دیا۔ پوری پچاس صدیاں گزرنے پر امریکہ میں جدید ترین مشینوں سے بولڈر ڈیم بنا، جسے خوفو کے ہَرم سے بڑا ہونے کا فخر نصیب ہُوا۔

اہرام نے تہذیبوں کا مدّوجزر دیکھا ہے۔ تہذیبیں پھیلیں اور مِٹ گئیں۔ قومیں

اُبھری اور تباہ ہو گئیں۔ سکندرِ اعظم، جولیس سیزر، عُمرو بن العاص، نپولین۔۔۔ فاتح یکّے بعد دیگرے آئے اور چلے گئے۔ لیکن اہرام سینۂ زمین پر جُوں کے تُوں کھڑے ہیں۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ دُور قاہرہ کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ نیچے میدانوں میں دُھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس دُھند کے پیچھے لاتعداد انسان مشقت کر رہے ہیں۔ رسّوں سے بڑے بڑے پتھروں کو کھینچ رہے ہیں۔ ننگی پیٹھوں پر کوڑے برس رہے ہیں۔ پتھروں کو تراشا جا رہا ہے۔ اُوپر گھسیٹا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ فرعون کا مدفن تیار ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ غیر فانی بن جائے گا۔

چاندنی میں اہرام کے پتھر چمکتے ہیں تو دیکھنے والا بھول جاتا ہے کہ ان پتھروں میں خون اور پسینہ جذب ہے۔ ان سے وہ ہوائیں کھیلی ہیں جو آہوں اور سسکیوں سے بوجھل تھیں۔

فرعونوں کے نام سب جانتے ہیں۔ ان کی عظمت و جبروت کے تذکرے عام ہیں، لیکن ان کروڑوں انسانوں کے متعلق معلومات بہت کم ہیں جو اس عجوبے کے اصل خالق تھے۔

"یہ وقت نیل کی سیر کا ہے۔" میرے دوست نے فیصلہ کیا۔ نیل کی رات ایسی رنگین اور پُر فسوں رات محض کہیں کہیں میسّر ہوتی ہے۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔"

جب ہم نیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے تو چاند دوسری طرف درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کھجوروں کی چوٹیاں چاند کو چھوتیں، پھر چاند رہ جاتا اور آسمان اور نیل کی شفاف سطح۔

ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ تاروں کی چمک تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"ایسی ہی رات میں فرعون کی بیٹی کو حضرت موسیٰ کا پنگوڑا یہیں کہیں تیرتا ہوا ملا تھا۔ یہی چاند تھا اور یہی دریا جب قلوپطرہ کے بجرے یہاں تیرتے تھے۔ اس دریا میں کچھ تو ہو گا جو اجنبیوں کو دُور دُور سے کھینچ کر لاتا ہے، اور اب بھی لاتا ہے۔ یونانی آئے تو یہیں جذب ہو کر رہ گئے۔ رومن آئے اور واپس جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ ان میں سے چند ممتاز رومن تو کافی خوار بھی ہوئے۔ عرب آئے تو واپس نہیں گئے۔ نپولین کا قیام یہاں طویل ہوتا گیا۔ انگریز بھی بڑی مصیبتوں سے رخصت ہوئے۔ اور اب بند تعمیر ہوں گے جو اِس متلوّن دریا کو قابو میں لائیں

گے۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہو جائے گی ۔ فلاحین کے شب و روز بدل جائیں گے۔ ہر گاؤں میں سکوٹر چلنے لگیں گے اور خوشحالی کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی قمیضوں کی جگہ بُش شرٹ اور پتلونیں لے لیں گی۔"

اپنے دوست سے معاشی ارتقاء کی شاندار تفسیر سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔

ہَوا چل رہی تھی لیکن دریا میں ایک لہر بھی نہ تھی۔پانی کی سطح آئینے کی طرح چمک رہی تھی جیسے دریا بہتے بہتے رُک گیا ہو۔

"نیل ہی مصر ہے۔ اجنبی ہنستے ہیں کہ مصریوں کا مزاج نیل کی طرح ہے۔ جیسے نیل میں اُتار چڑھاؤ آتے ہیں ویسے ہی ہماری طبیعت ہے۔ ابھی خاموشی ہیں، ابھی بھڑک اُٹھے۔ مَن گئے تھے، پھر پارہ چڑھ گیا۔"

"اس وقت نیل بالکل ساکن ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔

"سُنا ہے کہ تمہارے ہاں کئی دریا ہیں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ اور گزشتہ صدیوں میں حملہ آوروں کی بھی کمی نہیں رہی لیکن وہ کسی خاص دریا کے سلسلے میں نہیں آتے تھے۔"

”تمہارے دریا کیسے ہیں؟“

”خیریت سے ہیں مگر ہم نے سارے شہر اُن پر نہیں بسائے۔“

”وہ کیوں؟“

”شاید اس لیے کہ ہم نے اپنے دریاؤں کو اور انہوں نے ہمیں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ تبھی وہ بار بار راستہ بدلتے رہتے ہیں اور سیلاب بھی لاتے ہیں۔“

”لیکن ہم تو نیل کے سیلاب کا بڑے شوق سے انتظار کرتے ہیں کیونکہ یہ آب پاشی کرتا ہے اور زرخیز مٹی گارا بچھاتا ہے۔“

”اتفاق سے ہمارے ہاں آبپاشی کے لیے بے شمار نہریں ہیں۔ لیکن کیا کِیا جائے، دریاؤں کو بذاتِ خود آب پاشی کرنے کا شوق ہے۔ چنانچہ برسات میں وہ دُور دُور کے کھیتوں تک پہنچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔“

”تمہارے ہاں اس طرح دریا کے کنارے سیر کی جاسکتی ہے؟“

”رات کے چار بجے تبھی کی جاسکتی ہے جب آورہ گردی کے چالان کا ڈر نہ ہو۔“

رنگ برنگی روشنیوں کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ چند سال پہلے انگریزی حروف پانی

میں

چمکا کرتے تھے، اب ہر جگہ عربی حروف تھے۔ ہوٹل فندق بن چکے تھے۔ سادہ پانی یعنی waterمَے کہلاتا تھا۔

چڑیا گھر حدیقۃ الحیوانات تھا۔ No Waiting کی جگہ ممنوع الانتظار لکھا تھا۔ مِس اب آنسہ تھی۔ یہاں تک کہ عبدالکریم اینڈ سنز کی جگہ عبدالکریم واولادہٗ نے لے لی تھی۔ مگر کچھ الفاظ سے یُوں لگتا تھا جیسے ترجمہ کرنے والا اور ترجمہ کرانے والا دونوں اتنی جلدی میں ہوں کہ آگے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے دبادب ترجمے کر رہے ہوں۔ مثلاً سارجنٹ کو رقیب (شاید رقیب روسیاہ کے سلسلے میں) اور لیفٹیننٹ کو ملازم کہنا۔ اُدھر فیلڈ مارشل کے لیے مہیب استعمال کرنا بھی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ اور اسی طرح BENIGN MALARIA کو ملیریا حمیدہ (یعنی مبارک بخار) بنا دیا اور MALIGNANT MALARIA کو ملیریا خبیثہ۔

”عید کارڈ کے جواب میں تم بیرام کی مُبارکباد بھیجا کرتے ہو۔ یہ بیرام کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

"تمھارے ہاں بیرام نہیں ہوتا"

"ایک بیرم خاں گزرے ہیں۔مانے ہوئے جنگجو تھے۔"

"اچھا کتنی دلچسپ بات ہے۔ ہم مشرقِ وسطیٰ میں لاتعداد الفاظ مشترک ہیں۔"

"لیکن ہر جگہ معنے مختلف ہیں۔ حمام کسی جگہ پرندہ ہے تو کہیں غُسل خانہ۔ اُردُو کہیں زبان ہے تو کہیں فوج۔ تمہارا محکمہ اہلیہ مُلکی معاملات پر نظر رکھتا ہے، ہمارے ہاں اہلیہ

بیوی ہوتی ہے۔ ویسے تاریخِ ہند میں ایک اہلیہ بائی بھی تھیں۔ ایران میں خصم دشمن ہوتا

ہے اور ہمارے ہاں خاوند۔۔۔۔"

"خاوند اور دشمن ایک ہی ہستی کے نام سمجھو۔رہ گئی عید۔۔۔تو تمہاری عیدِ قُرباں ہماری قُربان بیرام ہے۔۔۔"

"تو پھر یہ عید وفاء النّیل کیا چیز ہے؟"

"فرعونوں کے زمانے میں ہر سال طغیانی آنے پر سب خوشی مناتے تھے اور نیل

کی شادی کی جاتی تھی۔ ایک نو عُمر حسینہ کو زبردستی دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ عربوں نے یہ رسم بند کی، لیکن تہوار اب تک منایا جاتا ہے۔"

"یوں تو ہر فرعونے راموسیٰ۔۔۔ لیکن حضرت موسیٰ والا فرعون کون سا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "رعمیسس۔"

"اوّل یا دوئم؟"

"غالباً رعمیسس دوئم۔"

"فرعون کی خفگی کی کئی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ اصلی وجہ کیا تھی؟"

"شاید یہ کہ جب حضرت موسیٰ چھوٹے تھے تو انہوں نے فرعون کی داڑھی کھینچ لی تھی۔"

لیکن فرعونوں کی داڑھیاں بھی تو عجیب ہوتی تھیں۔ چہرہ صاف، مونچھیں ندارد اور ایک لمبی سی رسّی نما داڑھی، ٹھوڑی سے لٹکی ہوئی ہے۔۔۔"

"یہ داڑھی مصنوعی ہوتی تھی۔ بعض اوقات اس میں موتی پروئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں داڑھی کو دانائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔"

"مصنوعی داڑھی سے اصلی دانائی آنی مشکل ہے۔ اس قسم کی چیز لٹکتی ہوئی نظر آ جائے تو ہر بچّہ اُسے پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ غلطی فرعون کی تھی کہ ایسی داڑھی لگا کر بچّے کے قریب گیا۔"

چاند چھُپ چُکا تھا۔ اب تارے تھے اور نیل تھا۔

تارے جتنے آسمان میں تھے اتنے ہی دریا میں جھلملا رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ چُپ چاپ منتظر کھڑے تھے۔ فضا میں خُنکی تھی اور ایک نامعلوم سی خوشبو جو دریا سے منسوب ہوتی ہے۔

"آج تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکے۔" وہ بولا۔

"آج میں نے تقریباً سب کچھ دیکھ لیا۔۔۔ اہرام، نیل اور سمیعہ کمال۔۔۔۔ فقط قلوپطرہ کا ذکر رہ گیا ہے۔"

"قلوپطرہ پر ابھی ریسرچ ہوئی ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ جب سیزر یہاں آیا تو پچاس سے اُوپر کا تھا۔ اس کے گنجے سَر پر جو چند بال تھے وہ سیاہ نہیں تھے۔ اُدھر انطونی بیحد پِلا ہوا تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر ہر وقت ایک احمقانہ مُسکراہٹ رہتی تھی۔ اور چوڑی چھجے دار گھنی داڑھی سے شکل کوئی خاص بہتر نہیں معلوم

ہوتی تھی۔ قلوپطرہ بھی اتنی نوخیز نہیں تھی جتنی کہ شیکسپئر اور دیگر حضرات نے بتائی ہے۔ دراصل وہ اچھی خاصی پختہ عُمر کی عورت تھی۔ چونکہ نِصف یونانی تھی اور نِصف مِصری، اس لیے اس کا رنگ مُشکی ہو گا۔ لہٰذا رومان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اِن دنوں ریسرچ کا مقصد ہی یہ رہ گیا ہے کہ کسی مُسلّمہ حقیقت یا اچّھی بھلی شخصیت کا ناس مار دیا جائے۔ محققین تو یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شیکسپئر تھا ہی نہیں۔ اور یہ کہ نپولین کو کم از کم پچاس یا ساٹھ بیماریاں تھیں۔ ایسی باتوں پر یقین نہ کیا کرو۔ ریسرچ کرنے والے اپنی پبلسٹی بھی چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں قلوپطرہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ حسین، انٹلکچوئل اور سوشل، اگر رومن بار بار آ کر اُدھم نہ مچاتے تو وہ زیادہ خوش رہتی۔"

'لیکن اتنی مشہور نہ ہوتی۔"

"اس کی شہرت تمہارے اور میرے لیے ہے۔ اسے اپنی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔"

"شہرت مرنے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔"

ہم پتھروں پر بیٹھ گئے۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر چھینٹے اُڑانے لگا۔

"سب کہتے ہیں کہ نیل کا پانی جِلد سے چھُو جائے تو ایک خطرناک بیماری لاحق ہو سکتی ہے جو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ اس پانی میں BILHARZIA ہوتا ہے۔ سارے ملک میں لے دے کر ایک ہی دریا ہے۔ اسی کا پانی خطرناک ہے۔ بے چارے فلاحین ہزاروں برس سے اس بیماری میں مبتلا ہیں۔" اس نے افسوس سے کہا۔

یہ دُبلے پتلے محنتی کسان جنہیں فلاحین کہا جاتا ہے، صدیوں سے نیل کے کنارے ہَل چلاتے رہے ہیں۔

قاہرہ، اسکندریہ، پورٹ سعید، لکسر، مصر کے کسی بھی شہر سے ڈیڑھ دو میل باہر نکلتے ہی منظر یکلخت بدل جاتا ہے۔۔۔ کچے مکان، اُڑتی ہوئی دھول، مکھّیاں، کُتّے، ریت کے ٹیلے اور لمبی لمبی قمیضیں نظر آنے لگتی ہیں۔ زمانہ دفعتاً تین چار ھزار سال پیچھے چلا جاتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں جب پہلی مرتبہ مصر کے گاؤں دیکھے تو سب کُچھ مانوس سا معلوم ہُوا۔ دریا میں کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کناروں پر پانی بھرنے والیوں کے

ہجوم تھے۔ کسان رسے اور ڈول سے پانی نکال رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان دِنوں کسی گاؤں میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہمارے چند انگریز ساتھی بار بار کہتے کہ واپس چلو۔

ٹام بولا: ”دیکھتے نہیں، ان کا رویہ ہر روز بدلتا رہتا ہے۔ ہم جرمنوں کو دھکیلتے ہیں تو ہماری خوامخواہ آؤ بھگت ہوتی ہے جب جرمن آگے بڑھتے ہیں تو ہماری موٹروں ٹرکوں پر یہی پبلک پتھراؤ کرتی ہے۔ ان کا کچھ پتہ نہیں۔“ نابی نے اُسے بتایا کہ ”پبلک کا کوئی قصور نہیں۔ جب غیر ملکی ہزاروں میل دور سے فوجیں لا کر ان کے ملک کو لڑائی کے گراؤنڈ کے طور پر استعمال کر رہے ہوں تو مقامی باشندوں کی پوزیشن کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تو دیہاتی ہیں۔ ان بیچاروں کو بین الاقوامی سیاست کا کوئی علم نہیں۔ شہروں میں کُچھ ہوتا رہے، ان کے شب و روز ویسے ہی کٹھن رہتے ہیں۔“

لڑائی کے ذکر پر ٹام اپنا محبوب فقرہ ضرور سُناتا۔ ”ہم جنگ آیندہ کی تمام جنگوں کو ختم کر دینے کے لے لڑ رہے ہیں۔“

اس پر نابی کہتا۔ ”تاکہ اس کے بعد جو امن آئے وہ آیندہ کے تمام اَمنوں کو ختم کرے۔“

موٹے تازے، چکنے چپڑے، شہریوں کے مقابلے میں فلاحین تندرست نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ بخُاروں، بلہارزیا، ککروں کے دائمی مریض۔۔۔ ان کے سانولے چہروں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور ایک گہری اداسی اور تھکاوٹ مسلّط تھی لیکن اس کے باوجود وہ مُسکرا رہے تھے۔ یہ وہ محزون مُسکراہٹ تھی جو دیکھنے والے کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔

جب اُنہیں بتایا کہ ہم میں سے بیشتر کسان گھرانوں سے ہیں تو بیٹھنے کے لیے ریت پر چادر بچھادی گئی۔ ایک کسان کھجوریں لے آیا، دوسرا پتوں سے مکھیاں جھلنے لگا۔

دیکھتے دیکھتے ہمارے انگریز ساتھیوں کا رویّہ بدل گیا۔ وہ ہاتھ کے اشاروں سے فلاحین سے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دراصل انگریز ان لاتعداد چوریوں سے نالاں تھے جو شہروں اور کیمپوں میں آئے دن ہُوا کرتیں۔

بازاروں میں اکثر یہ ہوتا کہ پھیری والے کسی فوجی کے پیچھے لگ جاتے کہ ہماری چیزیں خرید۔ اگر وہ انکار کرتا تو خواہ مخواہ کی بحث شروع کر کے اس کا تعاقب کرتے حتیٰ کہ وہ تنگ آ کر انہیں ڈانٹنے لگتا۔ اس لمحے کا اُن سب کو انتظار رہتا تھا۔

فوراً چند مقامی حضرات بیچ بچاؤ کرنے آ جاتے۔ کوئی فوجی کو ایک طرف کھینچتا اور کوئی پھیری والے کو۔ جب مجمع مُنتشر ہوتا تو فوجی کی گھڑی، قلم، بٹوہ (اور اکثر شناختی کارڈ بھی) غائب ہو چکے ہوتے۔

سامان سے لدی ہوئی لاریاں قطاریں میں روانہ ہوتیں، تو کسی منظّم گروہ کے افراد طے شُدہ پروگرام کے مطابق بیشتر سامان غائب کر دیتے۔

پہلی ٹولی جو درختوں کی ٹہنیوں میں چھُپی ہوئی ہوتی، چلتی لاریوں پر چھلانگ لگاتی اور چُپکے چُپکے رَسّے اور ترپال کاٹ کر فوراً نیچے کود جاتی۔ اگلے جھنڈ میں دوسری ٹولی درختوں سے کود کر پھُرتی سے کس کھولتی اور غائب ہو جاتی۔ پھر تیسری ٹولی کارآمد چیزیں سڑک پر پھینک کر اُتر جاتی۔ چنانچہ جب منزل مقصود پر پہنچتے تو لاریوں میں صرف پیکنگ کا سامان ملتا۔ اور ڈرائیو قسمیں کھاتے کہ انہوں نے نہ تو کہیں چور دیکھا اور نہ کہیں ہالٹ کیا۔ چنانچہ ملٹری پولیس کی ہدایات کے مطابق شہر جانے سے پہلے سب اپنی قیمتی چیزیں کیمپ میں چھوڑ جاتے اور فقط کرنسی کے چند نوٹ مُٹھّی میں دبا کر بڑے محتاط انداز میں نکلتے۔

مگر نابی کہا کرتا کہ جس شہر کے قریب جنگ ہو رہی ہو، وہاں یہی ہوتا ہے، خواہ وہ پیرس ہو، روم ہو یا قاہرہ۔

اگلے روز میرے دوست نے پھر کسی مہاتما کی طرح پوچھا۔ "بتاؤ کیا دیکھو گے؟" یعنی دوسری خواہش بیان کر۔

مَیں نے میوزیم دیکھنے کی خواہش کی۔ جنگ کے دنوں میں اسے بند کر دیا تھا اور بمباری کے ڈر سے ساری قیمتی چیزیں کہیں بھیج دی گئی تھیں۔

میرے دوست نے فوراً ٹیلیفون کر کے ایک نہایت قابل گائیڈ کا انتظام کیا جسے تاریخ پر عُبور حاصل تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں آجانا چاہیے تھا۔ جب تین گھنٹے گزر گئے تو میرے اصرار پر دوبارہ ٹیلیفون کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ گائیڈ تو کسی یورپین کے ساتھ ابھی ابھی باہر نِکل گیا ہے لیکن اُس کی بھتیجی یا بھانجی (ٹیلی فون پر NIECE سُنا تھا) جو تاریخ کی اسکالر ہے اور جسے اسکالر شپ بھی ملتا ہے، ہماری طرف آرہی ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا جو خفیہ پولیس کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جس نے سر سے پاؤں تک مختلف قسم کے کپڑوں سے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اس نے زنانہ آواز میں علیک سلیک کی اور ہمارے پاس کھڑا ہوا۔

غور سے دیکھا تو یہ عورت تھی۔

یہ آنسہ ثانیہ تھی جس نے SKIRT، لبادہ، تہمد، شال وغیرہ سب کچھ لپیٹ رکھا تھا۔ سادہ عینک پر سیاہ شیشے چڑھا رکھے تھے اور چہرے پر اس قسم کی جالی تھی جو دکاندار عموماً مٹھائیوں کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

رسمی تعارف کے بعد ہم میوزیم پہنچے۔

ثانیہ نے بڑے عالمانہ انداز میں بتایا کہ۔۔۔ ”جب تک کسی ملک کے جغرافیائی حالات کا علم نہ ہو تاریخ کا مطالعہ بے سود ہے۔ غالباً آپ مصر اور نیل کے تعلق کچھ نہ کچھ تو جانتے ہی ہوں گے؟“

میں نے سفری تھیلے سے کئی کتابچے اور پمفلٹ نکال کر سامنے رکھ دیئے۔ اِن میں سے کچھ سیر و سیاحت کی کمپنیوں کے تھے اور چند قاہرہ میں طبع ہوئے تھے۔

”میرا جغرافیہ اور تاریخ، بلکہ سارے مضامین۔۔۔۔ ہمیشہ کمزور رہے ہیں۔ تم ہی ان میں سے کچھ پڑھ کر اِسے سُنا دو۔“ میرے دوست نے سرگوشی کی۔ (نہ جانے کیوں اسے بلاوجہ کی سرگوشیوں کی عادت ہے۔)

مَیں نے پمفلٹ کھولے اور صفحوں کو اُلٹنا شروع کیا۔KIPLING نے کہا تھا کہ مصر کے ملک کو در حقیقت ایک نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ایک بل کھاتا ہوا ہرا بھرا بازار ہے۔ اور کپلنگ نے بالکل سچ کہا تھا۔ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، بلکہ ہوتی ہی نہیں۔ سارے ملک کا فقط اٹھائیسواں حصّہ قابلِ کاشت ہے، وہ بھی نیل کی بدولت۔ کیونکہ اگر نیل نہ ہوتا تو مصر سو فیصد صحرا ہوتا۔ اور یہ اپنے دہانے سے چار ہزار میل دور جھیل وکٹوریا سے نکلتا ہے۔ اِس شور مچاتے ہوئے نیل کو بحرِ الغزل کہا جاتا ہے۔ ایک اور جھاگ اُڑاتی ہوئی پہاڑی ندی بحرِ الجبل اس سے ملتی ہے تو بحرِ ابیض یعنی چٹّا نیل ظہور میں آتا ہے، جو فقط خرطوم تک سفید رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں نیلا نیل یعنی بحرِ الارزق اس کا منتظر ہوتا ہے۔ جب دونوں ملتے ہیں تو اصلی نیل بنتا ہے۔ اس طرح نیل بننے کے عمل میں اسے کافی مسافت طے کرنی پڑتی ہے لہٰذا مصر کے میدانوں میں بہنے کے لیے اسے فقط پانچ سو میل ملتے ہیں۔

قاہرہ سے آگے یہ دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو ایک دوسری سے دور ہوتی جاتی ہیں، حتیٰ کہ جب بحیرہ روم میں گرتی ہیں تو ان کے درمیان ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہ کتابوں میں نیل کو کھجور کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی جڑیں سمند میں ہوں اور ٹہنیاں پہاڑوں پر، لیکن میری حقیر رائے میں نیل کھجور سے ہر گز نہیں ملتا اور نہ کھجور نیل سے ملتی ہے۔ اگر زبردستی اس تشبیہ کو

صحیح مان لیا جائے تو پھر اس قسم کی کھجور کافی ٹیڑھی ترچھی ہو چکی۔ لہٰذا کھجور نہیں کچھ اور چیز ہو گی۔ نیل نے مصر کی جغرافیائی پوزیشن کو کافی خراب کر رکھا ہے۔ یعنی نقشوں میں مصر کا اُوپر والا حصّہ نچلا نیل کہلاتا ہے اور زیریں حصّہ بالائی مصر! یہ اس لیے ہے کہ شاید مصر اتنا اہم نہیں جتنا نیل۔ طلباء کی سہولت کے لیے اسے درست کر دینا چاہئے، ورنہ پھر نیل کو اُلٹی سمت میں بہنا چاہیے۔ جنوبی گرم ہوائیں خمسین اپریل مئی میں شروع ہو جائیں تو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پچاس دِن چلتی ہیں اور نیل کے گرد و نواح میں اتنی ناخوشگوار تبدیلی لے آتی ہیں کہ لوگ نہایت چڑچڑے اور جھگڑالو ہو جاتے ہیں۔ تُرک اتنے سمجھدار ہیں کہ جب وہ مصر کے حکمران تھے تو استنبول سے یہاں کے مجسٹریٹوں کو ہدایات ملی ہوئی تھیں کہ خمیس کے دوران جو جرائم ہوں، ان کی سزائیں اس منحوس موسم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے دی جائیں۔ باقاعدہ گرمیوں میں حبشہ سے مون سون آتی ہیں تو نیل میں سیلاب آتا ہے اور راتوں رات دریا کی سطح بیس پچیس فٹ اونچی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پندرہ بیس میل تک سُرخی مائل پانی پھیل جائے گا اور ہر جگہ نیل ہی نیل ہو گا۔ گرم ملکوں میں کسان بارش کے انتظار میں عمودی رُخ میں یعنی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں کہ بوندیں کب پڑتی ہیں لیکن مصریوں کی نگاہیں آسمان کی طرف نہیں بلکہ اُفقی سمت میں ہوتی ہیں کہ طُغیانی کب آتی ہے۔ ہمارے ہاں نماز مغرب کی

طرف مُنہ کر کے پڑھتے ہیں، لیکن مصری جنوب مشرق کی طرف۔ مصر بھر کے اسکندریہ کے علاوہ سکندرِ اعظم نے ہمارے ہاں بھی دو تین اسکندریہ آباد کیے ہوں گے۔ بہر حال ایک اسکندریہ اب تک باقی ہے۔ یہ زمانے کی گردش سے چھوٹا ہوتا گیا اور اب اُچ کی شکل میں پنجند کے قریب دیکھا جا سکتا ہے۔

''تم نے حیوانات و جمادات کا ذکر نہیں کیا۔'' میرا دوست بولا۔

''وادیٔ نیل میں اُونٹ اور گدھے افراط سے ملتے ہیں۔ اُونٹ تو خیر اوسط درجے کے ہیں لیکن گدھے نہایت مضبوط، صحت مند اور مسرور ہیں۔ ایسے تندرست و توانا گدھے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔ قاہرہ میں چوک کا سپاہی چند لمبی امریکن کاروں کو گزار چکتا ہے تو دوسری طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب وہ گدھے گزر جائیں جن پر سُوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرعونوں کے مقبروں میں اُونٹ کی تصویر نہیں ہے، نہ ان کے لٹریچر میں اس کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُونٹ یہاں عربوں نے رائج کیا۔ فرعونوں کے زمانے میں یہاں لوگ چھوٹا سا تہمد باندھتے تھے لیکن اب ایک نہایت ہی لمبی قمیض کا رواج ہے جو دُور سے نارمل قمیض اور تہمد کا مرکّب معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ سارے جسم پر فقط ایک ڈھیلا ڈھالا کپڑا ہوتا ہے، لہٰذا گرمیوں میں بدن کو ایئر کنڈیشن کرنے

کے لیے اس سے بہتر لباس نہیں ہو سکتا۔"

"بس بس کافی ہے۔" ثانیہ نے ٹوکا۔ "چلیئے اندر چلیں۔"

اس نے ایک لبادہ سا اُتارا اور سَر سے لپٹا ہوا رومال کھینچ لیا۔

اب تاریخ کا سبق شروع ہوا۔ ثانیہ نے ایک کتاب کے صفحے اُلٹے اور کہنے لگی۔

"اس سے پہلے کہ آثارِ قدیمہ کا باقاعدہ ذکر ہو، اہرام اور ابوالہول کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ خوفو کے ہَرم کی بنیاد تیرہ ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسکی تعمیر پر اڑھائی اڑھائی ٹن کے تیئیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے۔ اگر یہ سب پتھر خطِ استوا کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں رکھ دیئے جائیں تو دو تہائی دنیا کو محیط کر لیں۔ ہرم کی چوٹی ہواؤں اور اندھیوں سے گھس گھس کر تیس فِٹ کم ہو چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھے چار سو فٹ بلند ہے۔ ایک لاکھ انسانوں نے بیس برس تک محنت کی تب یہ مکمل ہوا۔۔۔"

"بیس برس تک کھیتی باڑی بند رہی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ خوفو فلاحین سے ہر سال فقط تین مہینے کام لیتا تھا۔ جب نیل میں طغیانی آتی تب۔۔۔۔۔"

"بڑا اچھا فرعون تھا۔ سیلاب کے دِنوں میں فلاحین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ ان کی ضیافتِ طبع کے لیے خوفو نے اچھا مشغلہ بہم پہنچایا۔۔۔" میرے دوست نے کہا لیکن ثانیہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ ہمیں بتا رہی تھی کہ "خوفو کے ہرم کے بعد خفرے نے اپنا ہرم ایک اونچے ٹیلے پر بنوایا۔ اس اُستادی سے کہ اس کا ہرم جو در حقیقت خوفو کے ہرم سے چھوٹا ہے دیکھنے میں بڑا دکھائی دیتا ہے۔۔۔"

"بے حد ذہین فرعون تھا۔ اس طرح پچیس تیس فٹ بھی بچا گیا اور ناک بھی اُونچی رکھی۔"

مَیں نے لقمہ دیا۔ ثانیہ نے بُرا سا مُنہ بنایا اور گلے میں بندھا ہوا ایک سکارف اُتار کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

میرے دوست نے شرارتاً میری صاف دیکھا۔

ثانیہ بیان کر رہی تھی۔۔۔ "تیسرا ہرم منکرے کا ہے۔ ویسے نیل کے کنارے چھوٹے بڑے سب ملا کر ستّر اہرام ہیں۔۔۔"

"اِس کا مطلب یہ ہوا کہ فرعون کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ممّی بن کر ہرم میں دفن ہو تو جیون سپھل ہو جائے۔ یعنی لافانی بننے کے لیے فانی جسم کی حفاظت

اشد ضروری تھی۔ لہٰذا ہر فرعون شروع سے اسی چکر میں رہتا ہو گا کہ جوانی ہی میں اپنے ہاتھوں اپنا مقبرہ تیار کرے۔ ہرم مکمل ہونے پر شاید چیف انجنیئر مؤدبانہ عرض کرتا ہو گا کہ حضور مقبرہ تیار ہے اور حسبِ منشا ذرا سے نوٹس پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔"

ثانیہ کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے اور میرے دوست کے چہرے پر مُسرّت کے۔ وہ کہہ رہی تھی "اہرام فنِ تعمیر کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ آج تک کوئی معلوم نہ کر سکا کہ کیونکر بنائے گئے تھے۔"

"لیکن کچھ لوگ انہیں نرِے پتھروں کے ڈھیر کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص ہرم بنا سکتا ہے۔ پتھروں کی تہیں اس طرح جمائی جائیں کہ ہر اُوپر والی تہہ نچلی تہہ سے طولاً عرضاً ذرا چوڑی ہو، تو لازمی طور پر ایک مخروطی عمارت بن جائے گی جس کے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" ثانیہ نے پوچھا۔

"مَیں ان میں سے نہیں ہوں۔ یونہی سُنے سُنائی کہی ہے۔ لیکن فرعونوں کے بعد جو فاتحین آئے انہوں نے ہر مرتبہ انہیں ملبے کے ڈھیر سمجھا اور ان کے پتھر اُکھاڑ

اُکھاڑ کر نئی عمارتوں کے لیے استعمال کیے۔"

"آپ نے اور کیا کیا سُنا ہے؟"

"یہ کہ فرعون دن بھر فرعونیت سے کام لیتا تھا لیکن رات کی تنہائی میں سجدے میں گڑ کر گِڑ گِڑاتا تھا کہ خدایا معاف کرنا، یہ سب دکھاوا ہے اور مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔۔۔۔"

"اور۔۔۔۔۔۔؟"

"اور یہ کہ قدیم مصری باشندے خوفو اور خفرے سے بے حد خفا تھے کہ ان سے زبردستی اہرام بنوائے اور سب کو مدّتوں عذاب میں گرفتار رکھا۔ اُن دِنوں اِن دونوں کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خفرے کا لڑکا منکرے ذرا رحم دل نکلا اور رعایا کی بہبودگی کی طرف متوجّہ ہُوا۔۔۔۔ چنانچہ اس کا ہرم اپنے باپ کے ہرم سے نصف رہا۔ منکرے کا بیٹا اور بھی زیادہ شریف تھا۔ لوگوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ فرعون ہو کر اتنی اچھی طرح پیش آتا ہے۔ اس غریب کا کوئی ہرم نہ بن سکا۔ ویسے مضبوط اور بڑھیا کوالٹی کے اہرام وہی ہیں جو شروع کے فرعونوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں بنوائے۔ بعد میں معیار گِرتا گیا، یہاں تک

کئی کہ اہرام ایسے بھی بنے جن میں باہر ذرا سا پتھر لگایا ہے اور اندر ریت اور مٹی ہے۔ یہ ضرور ٹھیکیداروں سے بنوائے گئے ہوں گے۔ اور عرض یہ ہے کہ فرعون نہ میرے کچھ لگتے تھے، نہ آپ کے۔ بھلا آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں؟"

"شاید کسی کے کچھ لگتے ہوں؟" میرے دوست نے کہا۔ "اِن دِنوں فرعونوں کو بڑی لفٹ مل رہی ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ایک فرعون کا بڑا سارا مجسمہ ریگستان سے لا کر قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے نصب کیا جا رہا ہے۔ یہ نیا رجحان ہے۔ غالباً ہم سارے حملہ آوروں کو یک لخت بھُلا دینا چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ سب سے پہلے مصریوں نے کہا کہ وہ کسی اور ملک سے یہاں آئے تھے۔ جب یونانیوں کے بعد رومن آئے تو انہیں بتایا کہ ہم یونانی النسل ہیں۔ فرانسیسی آئے تو انہیں یقین دِلایا کہ دراصل ہمارے بزرگ عرب تھے۔ تُرکوں سے بھی کچھ کہا ہو گا۔ انگریزوں کو یہ بتایا تھا کہ ہمیں تقریباً فرانسیسی سمجھو۔"

ثانیہ نے باقاعدہ ناراض ہو کر اپنی عینک سے کالے شیشے اُتار لیے۔ چہرے کی جالی ایک طرف کی، اور سر سے لپٹا ہوا رومال نمبر دو کھول لیا۔ اب وہ تقریباً تقریباً لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"اگر آپ دونوں نے میرے طریقے سے تاریخ پڑھی ہوتی۔" وہ مُنہ پھیر کر بولی

"آپ کو پتہ چلتا کہ یا تو فرعونوں کے زمانے میں ہماری اپنی حکومت تھی یا اب ہے۔ ورنہ یہاں ہزاروں برس غیر ملکی حکمران رہے ہیں۔ فاروق کا بزرگ محمد علی بھی تو البانیہ کا سوداگر تھا۔"

"مان لیا کہ فرعون ہی اصلی بزرگ تھے۔ لیکن انہیں گزرے پانچ ساڑھے پانچ ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں کئی قومیں مخلوط ہوئی ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو فرعونوں کی وجہ سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دُور دُور سے سیّاح آتے ہیں، میرے دوست نے اقوامِ متحدہ کے نمائندے کی طرح بیان دیا۔"

"پرانے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کچھ اتنی عجیب بھی نہیں۔ ان دنوں مشرق میں یہ تمنّا عام ہے۔" میں نے اپنے دوست کی تائید کی۔

"فرعونوں کو بزرگ بنا لینے سے اب کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" میرے دوست نے کہا "لیکن اس زمانے کا رسم الخط کہیں رائج نہ ہو جائے۔ چڑیا، سانپ، مچھلی، دریا، گیدڑ، اُلّو، سورج، لومڑی، وغیرہ کی تصویروں کو پڑھنا اور ان کا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

ثانیہ نے عینک اُتار دی اور ایک اور لبادہ بھی۔ اب وہ کہیں بہتر لگ رہی تھی۔

"یہ بتائیے کہ آپ تاریخ اسی طرح پڑھتی ہیں؟" میں نے اُسے چھیڑا۔

"تو اور کس طرح پڑھتے ہیں؟"

"آپ تو جغرافیہ بھی ساتھ ملا لیتی ہیں۔ ناپ، لمبائی، چوڑائی، بلندی وغیرہ۔۔۔ یہ سب کُچھ جغرافیے میں ہوتا ہے۔ تاریخ کو کسی اور زاویے سے لینا چاہئے۔ اس میں طرح طرح کے موڑ آتے ہیں۔ مثلاً اب مجھ سے کہا جائے کہ آنسہ ثانیہ کا جغرافیہ بیان کرو، تو میں کہوں گا کہ ثانیہ کا قد پانچ فٹ چار انچ کے لگ بھگ ہے۔ وزن نو اسٹون ہو گا۔ بے شمار رومال، سکارف، ہٹا دیئے جائیں تو خوش شکل ہے۔ انگریزی بولتی ہے۔ لیکن اگر تاریخ بیان کی جائے تو پھر ثانیہ کی سبز آنکھوں کا بھی ذکر ہو گا جو مصر میں نہیں ہوتیں۔ بالوں کی سنہری جھلک کا حوالہ بھی دیا جائے گا۔ اور یہ کہ اس کا نام ثانیہ نہیں اوّلہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ ثانیہ بنت النسل ہے۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی کے جغرافیے میں جاذبیت نہ ہو اس کی تاریخ دلچسپ نہیں ہو سکتی۔۔" وہ مُسکرانے لگی۔

"آنکھوں کا یہ رنگ ایک خاتون سے مِلا جو یورپ سے آئی تھیں۔ بالوں کی رنگت

آرمینیا سے نانی لائی تھیں۔ آپ کے ہاں بھی تو مغربی قوموں میں شادیاں کرتے ہوں گے؟"

"بہت کم۔۔۔۔"

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ مغربی بیویوں کو گرمیوں میں پہاڑوں پر بھیجنے کی بڑی مصیبت رہتی ہے۔ اور سب کے سب ہی کہتے ہیں کہ لڑکا ولایت سے میم بھگا لایا ہے، میم خواہ ہوائی جہاز سے آئی ہو یا سمندری راستے سے، مگر بھاگنے بھگانے کا حوالہ عُمر بھر دیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ اُمّید بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ میم کسی دن ضرور واپس جاگ جائے گی۔ فائدہ ہے تو ایک۔۔۔ وہ یہ کہ بیوی اور خاوند کے رشتہ دار ایک دوسرے سے ہزاروں میل دُور رہتے ہیں۔"

"تاریخ کی باتیں کرو۔" میرے دوست نے کہا۔ "میوزیم کا وہ آدمی ہمیں گھور رہا ہے۔"

"اہرام ختم ہو چکے ہیں، ابوالہول رہ گیا ہے۔ تم ابوالہول کے متعلق کیا جانتے ہو؟ وضاحت سے بیان کرو۔"

"کتابوں میں لکھا ہے کہ جب عرب مصر میں آئے اور اہرام کے پاس ایک عجیب الخلقت شبیہ دیکھی جس کی سُرخ آنکھیں چمک رہی تھیں تو دِلوں میں ہول اُٹھا۔ فوراً ابوالہول نام تجویز ہُوا جو غالباً فی البدیہہ تھا۔ دراصل خوفو کے ہرم کی تعمیر ختم ہونے پر ایک طرف پتھریلا سا ٹیلہ رہ گیا تھا جسے دیکھ کر آرٹسٹ ناک بھوں چڑھاتے کہ سارے منظر کو تباہ کر دیا ہے۔ خفرے اپنے ہرم کے سلسلے میں وہاں آیا اور باتیں سُنیں تو خفا ہُوا۔ اُس نے متعلّقہ آرٹسٹ پکڑے اور انہیں حکم دیا کہ اس ٹیلے کو تراش کر ہمارا مجسمہ بناؤ۔ پُرانا بادشاہ تھا اور پھر فرعون تھا۔۔۔ خدوخال تراشتے وقت سنجیدگی اور دبدبے کا خاص خیال رکھا گیا اور نہایت ڈراؤنا چہرہ ظہور میں آیا۔ آرٹسٹوں کو کبھی خفا نہیں کرنا چاہیے۔ یُوں بھی بادشاہت اور مُسکراہٹ دو متّضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ چہرہ جو کہ چودہ پندرہ فٹ چوڑا ہو گا، انسانی ہے لیکن دھڑ کسی شیر کے جسم سے متاثر ہو کر بنایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ ریت میں دب گیا تھا مگر لوگوں نے کھود کر نکال لیا۔ ایسی چیزیں زیادہ دیر تک دبی نہیں رہ سکتیں۔ یونانی، رومن، عرب، فرانسیسی ٹُرک۔۔۔ جو بھی یہاں آیا اُسے دیکھ کر متعجّب ہُوا، سوائے انگریزوں کے جو کہ اس کی تصویر پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ نپولین تو گھنٹوں کھڑا اِسے تکتا رہتا تھا۔ اُسی زمانے میں توپ کے گولوں سے اس کی ناک توڑ دی گئی۔ مملوک کہتے تھے کہ فرانسیسیوں نے توڑی ہے۔ فرانسیسی

کہتے تھے کہ مملوک چاند ماری کر رہے تھے۔ ہم تو قریب بھی نہیں گئے بلکہ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہاں کوئی ابو الہول ہے بھی۔۔۔

بہر حال جس نے بھی توڑی اچھا نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ رشک ہو یا حسد ہو کیونکہ صدیوں پہلے رومن بادشاہ CALIGULA نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ مصر جا کر ابوالہول کے چہرے کے نقوش بدلوا کر اپنی شبیہ بنوائے گا لیکن عُمر نے وفا نہ کی۔ اور یہ کہ ابوالہول کی خاموشی ضرب المثل بن چکی ہے۔ اکثر سُننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص ابوالہول کی طرح چُپ چاپ اور گھُنّا ہے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ابوالہول سمیت تمام بُت خاموش رہتے ہیں کیونکہ وہ بول نہیں سکتے۔"

"شاباش!" میرے دوست نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"آپ ریسرچ کر رہے ہوں گے۔ کون سی صدی قبل از مسیح پر کام کر رہے ہیں؟" ثانیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں ریسرچ بالکل نہیں کر رہا۔"

"تاریخ کے متعلّق آپ کے نظریے عجیب سے ہیں۔"

"اس کی ذمّہ دار تاریخی ہستیاں ہیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

اب ثانیہ کے سارے زائد لبادے اور رومال وغیرہ اُتار چکی تھی اور بالکل نارمل لڑکی لگ رہی تھی۔

میرے دوست نے بتایا کہ ثانیہ کے خاندان والے پُرانے خیالات کے ہیں، اِس لیے اسے باہر جاتے وقت اس قسم کے کپڑوں کی وردی پہننی پڑتی ہے۔ پھر اس نے ثانیہ کو پوری طرح یقین دِلایا کہ تاریخ کے موضوع سے میرا دُور کا بھی واسطہ نہیں اور میں معمولی سا سیّاح ہوں۔ تب ثانیہ کی خفگی دُور ہوئی۔

"اب میں کلاس لوں گا۔" میرے دوست نے فیصلہ کیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

قدیم مصری تصویر کشی اور بُت تراشی زیادہ تر مقبروں کے توسّط سے میوزیم تک پہنچی ہے۔ تصویروں میں زندگی سے زیادہ موت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا مذہب اُنہیں صحیح موت کے لیے تیار کرتا تھا تاکہ اگلی زندگی نہایت شاندار ہو (خواہ پہلی زندگی کتنی ہی بُری گزرے)۔ یہ فلسفہ کچھ زیادہ غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ دُنیا کے کئی حصّوں (خصوصاً مشرق میں) اس پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے۔

تصویروں میں ہر شخص کا سائز اس کے مرتبے کے مطابق ہے۔ ایک ہی تصویر میں فرعون کئی ہاتھ لمبا ہے، وزیر ڈیڑھ فٹ کا، سفید پوش حضرات نِصف فٹ کے اور عوام ڈیڑھ دو انچ کے ہیں۔ غالباً اس کا یہ فائدہ تھا کہ گروپ کے نیچے لوگوں کے عہدے لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہو گی۔

میوزیم میں بے شمار پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممّیاں ہیں۔ سونے کے تابوت ہیں۔ بڑے بڑے بُت، بیش قیمت زیورات اور پُرانا لٹریچر بھی ہے جو پرندوں، جانوروں اور دیگر چیزوں کی چھوٹی چھوٹی تصویروں کے قدیم رسم الخط میں مرقوم ہے۔

بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے اپنی مشہور کتاب میں ممّی بنانے کے چند آسان اور زود فہم طریقے بیان کیے تھے۔ اِس انداز میں انہیں پڑھ کر بچّہ بھی ممّی بنا سکے گا۔ لیکن یہ کام کافی مشکل ہوتا ہو گا۔

کتاب میں ممّیوں کی قسمیں بھی درج ہیں۔۔۔ یعنی ممتاز شخصیتوں کی، بورژوا طبقے کی اور پرولتاریوں کی ممّیاں۔ جتنی لاگت آتی اتنے ہی ذوق و شوق سے ممّی تیار کی جاتی اور اسی کے مطابق گارنٹی دی جاتی تھی۔ غالباً مہنگی ممّی کے ساتھ سرٹیفکیٹ ملتا ہو گا کہ شرطیہ دو ہزار سال تک چلے گی ورنہ دام واپس۔ ساتھ ہی زیادہ داموں کے تابوت پر مرحوم کی نہایت دیدہ زیب رنگین شبیہ بنائی جاتی

تھی۔ اوسط درجے کے تابوت پر اصلی شکل ہوتی تھی اور سستے تابوت پر یا تو کُچھ نہیں ہوتا تھا، یا جلدی سے کارٹون سا بنا دیتے تھے۔

اُس زمانے میں مصریوں کی ایسی عادت بن چکی تھی کہ جب انسان نہ ملے تو جانوروں کو پکڑ پکڑ ممّیاں بناڈالتے۔ چنانچہ میوزیم میں بلّیوں، کتّوں، مگر مچھوں اور پرندوں کی ممّیاں بھی ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جانور وغیرہ دیوتا تھے۔ ہر فرعون کے ساتھ دیوتا بھی بدلتے رہتے تھے۔ اگر ایک نے سانپ اور گیدڑ چُنے ہیں، تو دوسرا طوطے اور لومڑی کو نامزد کرتا۔ اور تیسرے کے عہد میں مگر مچھ اور بھیڑیے کی پرستش ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے سارے جانور اور پرندے ختم ہو گئے۔۔۔ غالباً تب اُنہیں خُدا کی موجودگی کا خیال آیا ہو گا۔

اگر کوئی غیر ملکی مصر میں انتقال کر جاتا تو آس پاس کے حضرات چندہ جمع کر کے اس کی ممّی بنوا دیتے کہ کہیں یہ پردیسی اس اعزاز سے محروم نہ رہ جائے۔۔۔ تبھی اُن دِنوں مصر میں سیّاح بہت کم جاتے ہوں گے۔ ممّی بناتے وقت دماغ، دل، جگر وغیرہ نکال دیئے جاتے تھے۔ شاید قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ اگلی زندگی میں اعضائے رئیسہ کی ضرورت نہیں ہو گی۔

ممّی کو دفن کرتے وقت سونا، چاندی، فرنیچر، زیورات سب ضروریاتِ زندگی ساتھ رکھی جاتیں تاکہ آیندہ فوراً کام آسکیں۔ اُدھر چور منتظر رہتے کہ ان چیزوں کو اسی زندگی میں استعمال کیا جائے۔ لہٰذا ملک دو فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک فریق ممّی بنانے میں مصروف رہتا، دوسرا ممّی چُرانے میں۔

فرعون بادشاہ بھی ہوتا تھا اور مذہبی پیشوا بھی۔ اس لیے کہ مذہب کے نام پر لوگ سب کچھ مان لیتے ہیں۔

فرعونوں کو روایات کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں انہیں عنانِ حکومت سنبھالتے ہی کئی کئی رشتہ دار لڑکیوں اور خواتین سے شادی کرنی پڑتی تھی تاکہ اپنی زندگی میں تخت کے دعوے داروں سے واسطہ نہ پڑے۔ بارہا یوں ہوا کہ کُنبے میں جتنی بِن بیاہی عورتیں تھیں، بادشاہ بنتے ہی اُن سے خوامخواہ شادی ہو گئی۔۔۔ تبھی فرعون اپنا زیادہ وقت شکار کھیلنے اور اہرام بنانے میں صرف کرتے تھے۔

شادیاں کر کے اور اپنا مقبرہ تیار کر کے کبھی کبھی فرعون دوسرے ملکوں کی جانب متوجّہ ہوتا (یعنی اُن پر حملہ کرتا)، ططمس سوئم نے ایشیا پر سترہ حملے کیے تاکہ انواع و اقسام کی قوموں کے زیادہ سے زیادہ لوگ مار کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر سکے۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ نظریہ بالکل ماڈرن تھا۔ (چند سال ہوئے

ممیوں کا ایکسرے اور دیگر ٹیسٹ کیے گئے تو معلوم ہوا کہ فرعونوں کو سرطان، تپ دِق، بلہارزیا اور کئی ماڈرن بیماریاں بھی تھیں)۔

۱۵۰۰ قبل از مسیح تک تو اہرام بنتے اور لُٹتے رہے۔ پھر ایک مردِ عاقل ططمس اوّل نے (وہ ططمس اوّل تب کہلایا جب ططمس دوئم نے تخت سنبھالا) اپنے لیے نیا راستہ چُنا۔ اس نے سوچا کہ لاکھوں فلاحین سے مقبرہ بنوا کر یہ توقع رکھنا کہ ممّی اور خزانے کا راز محفوظ رہے گا، سراسر بے وقوفی ہے۔ اس نے THEBES کے غیر آباد پہاڑوں میں خفیہ طور پر غار کھدوا کر مقبرہ تیار کروایا اور اس طرح "بادشاہوں کی وادی" کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد تقریباً پچاس فرعونوں نے اس دور اندیش کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی اور اپنے آپ کو اسی وادی کے غاروں میں دفن کروایا۔

ططمس اوّل کی تھیوری یہ تھی کہ اہرام تو چوروں کو میلوں سے نظر آجاتے ہیں۔ غاروں میں دفن ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ چوروں کو کم از کم ڈھونڈنا تو پڑے گا۔ لیکن چوروں کو تب تک پریکٹس ہو چکی تھی۔ انہوں نے سوائے طوطن خامن کے باقی تقریباً سارے فرعونوں کے مقبرے ڈھونڈ نکالے (جو چند بچ گئے تھے ان مقبروں کو تہس نہس کرنے کا سہرا آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے سر رہا)۔

جب تک ملک کی حالت اچھی رہی، فرعونوں کے لیے نہایت بڑھیا اور کشادہ زمین دوز مدفن تیار ہوتے رہے۔ لیکن جب فنانس والوں نے معذوری ظاہر کی تو ایک ایک قبر میں آٹھ آٹھ نو نو فرعونوں کو دفن ہونا پڑا۔۔۔ ہر چیز کی حد ہوا کرتی ہے۔

بالائی نیل کے کنارے مشہور فرعونوں کے نہایت اُونچے اُونچے مجسّمے ہیں جن پر یونانی اور رومن سپاہیوں نے اپنے نام کھُرچ رکھے ہیں اور وہ فقرے بھی لکھے ہیں جو تاریخی عمارتوں پر اکثر نظر آیا کرتے ہیں۔ مثلاً! ہم تینوں دوست آج یہاں آئے تھے۔۔۔۔

ملتوس۔

لیو

اینڈریک

"جسٹینیا جان، زندہ باد!"

"اسکندریہ کی ناچنے والیوں کو مارکس بہت یاد کرتا ہے۔"

"میں یہاں ہوں لیکن دِل ایتھنز والی جینا کی مُٹھّی میں ہے۔"

"پھر ملیں گے اگر خُدا لایا۔" وغیرہ وغیرہ۔

میوزیم میں طوطن خامن کے مقبرے سے نکلی ہوئی بیش قیمت اشیا رکھی ہیں۔ یہ فرعون اپنے دور میں مشہور نہیں تھا، اور جوانی ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اب اسے سب جانتے ہیں کیونکہ فقط اسی کا مقبرہ ٹھیک حالت میں مل سکا۔

سونے کا نہایت وزنی تابوت سنہرا رَتھ، کُرسیاں، صندوق، میزیں، سب سونے کے۔ اتنا سونا کہیں اور نہیں دیکھا۔

کارٹر نے اس کا مقبرہ محض اتفاقاً دریافت کیا۔

بادشاہوں کی وادی میں ایک جگہ جھونپڑیوں کے قدیم آثار ملے۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہو سکتا ہے کہ یہاں وہ مزدور رہے ہوں جنہوں نے شاہی مقبرہ تعمیر کیا ہو۔ چنانچہ کھدائی شروع کرائی۔ ایک دروازہ ملا۔ پھر زینے کی سیڑھیاں۔ وہ آخری دروازے تک پہنچا۔ جب اُسے کھولا تو فرش پر سوکھا ہوا الوداعی ہار پڑا تھا جسے فرعون کے عزیز و اقارب چھوڑ گئے تھے۔ کونے میں بجھا ہوا چراغ رکھا تھا

جِس کی لَو نے دیوار کا ایک حصّہ سیاہ کر دیا تھا۔ اس کالک پر اُن انگلیوں کے نشان بالکل واضع تھے جنہوں نے دروازہ بند کرتے وقت چراغ بجھایا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چراغ ابھی ابھی گُل کیا گیا ہے۔

دروازے کے کھلنے پر اس قدر طویل مُدّت کے بعد روشنی کی کرنیں اس ظلمت کدے میں داخل ہوئیں۔

کارٹر اور اس کے رفقاء اس ہوا میں سانس لے رہے تھے جو ہزاروں برس سے مقبرے میں بند رہی۔ جس ہوا میں فرعون کو دفن کرنے والے سانس لے چکے تھے۔

اور کارٹر کو یوں محسوس ہوا کہ اتنے گہرے استغراق میں مُخل ہو کر اس نے بڑی گستاخی کی ہے۔

"یہ دیکھو کیا لکھا ہے؟" میرا دوست چونک کر بولا۔

میوزیم کی دیوار پر قدیم مصری رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

"کبھی مَے خانے میں جا کر نہ پیو۔ اگر وہاں پی تو تم سا بیوقوف کوئی نہ ہو گا۔ خوب

اُلٹی سیدھی ہانکو گے اور تمہیں پتہ تک نہ ہو گا کہ کیا بک رہے ہو۔ دوسرے سُنیں گے تو مذاق اڑائیں گے اور اگلے روز جگہ جگہ ان باتوں کا چرچا ہو گا۔ جب دُھت ہو کر کسی سے لڑو گے تو ناحق پٹو گے۔ اگر مدہوشی کے عالم میں رہے تو ایک آدھ ہڈّی تڑوا بیٹھو گے۔ اور دوسرے تمہیں اُٹھا کر گھر بھی نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح آؤٹ ہوں گے۔"

"دیکھا؟ حضرت عیسٰے کی پیدائش سے دو اڑھائی ہزار سال پہلے بھی لوگ جانتے تھے کہ شراب خوری بُری ہوتی ہے۔" ثانیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اس نصیحت سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ شراب پینی ہو تو تنہائی میں پیو۔ میخانے کے قریب نہ پھٹکو۔ ویسے بھی مَے خانے میں دوسروں کی خاطر کرنی پڑتی ہے لہٰذا انسان مالی طور پر بھی خسارے میں رہتا ہے۔" میرے دوست نے جواب دیا۔

ایک طرف بڑے بڑے خُم رکھے تھے جنہیں پُرانے مصری غم غلط کرنے کے سلسلے میں استعمال کر چُکے تھے۔

"یہ تو بہت بڑے ہیں۔" میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "یا تو وہ آدمی بڑے سخت

تھے اور یا بادہ ہلکا ہوتا ہو گا۔ ورنہ ایسے خُم میں آج کل کی شرابیں ڈالی جائیں تو ایک ہی سے پہلوان بھی آؤٹ ہو سکتا ہے۔"

"وہ بھی آؤٹ ہو جاتے ہوں گے۔ زمانہ بدل گیا ہے لیکن انسان نہیں بدلا۔ ذرا اسے پڑھو۔۔۔۔ یہ نظم کئی ہزار سال پرانی ہے۔" میرے دوست نے ایک ترجمے کی طرف اشارہ کیا۔ اِن اشعار میں پانچ ہزار سال پہلے کا کوئی مصری اپنے آپ سے مخاطب تھا۔۔۔

آخر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

سارے عزیز و اقارب لفنگے نکلے

دوستوں کے دل محبّت سے بالکل خالی ہیں

کس سے کہوں؟ کیسے کہوں؟

جو شریف تھے وہ تباہ ہو چکے ہیں

رزیل پھل پھول رہے ہیں

کیسا زمانہ آ گیا ہے؟

کوئی بھی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتا

بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہی

بغیر مطلب کے کوئی کسی سے بھلائی نہیں کرتا

آخر کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

"اگر یہ نظم اپنے نام سے آج کسی رسالے میں چھپواؤں تو پبلک سمجھے گی کہ میں نے زمانہ حاضرہ کا صحیح جائزہ لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ انسان بدلا ہے، نہ اس کی حرکتیں اور اس کی فطرت۔۔۔" میرے دوست نے ایک اور عبارت دکھائی جو کسی قدیم مصری کہاوت کا ترجمہ تھی۔۔۔۔

"ہماری کامیابیوں کی وجہ دیوتا ہوتے ہیں۔

ناکامیوں کی وجہ ہم خُود ہیں۔"

واقعی یہ سب کچھ چار پانچ ہزار سال پُرانا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

اِن دنوں بھی لوگوں کو پیروں فقیروں سے یہی خوش فہمی رہتی ہے کہ اتفاق سے کچھ ہوا تو پیر صاحب کی کرامات ہے۔ اور اگر نہ ہو تو اپنی بدنصیبی تھی۔

ایک کمرے میں تصویروں سے دکھایا ہوا تھا کہ غیر ملکی لوگ جنگ میں ہاتھی استعمال کرتے تھے اور مصریوں کے پاس اس سائز کا کوئی جانور نہیں تھا۔ لہٰذا رعمیسس دوئم کو بہت غصّہ آیا جب شام پر حملہ کرنے گیا تو اپنا پرائیویٹ شیر ساتھ لے گیا (اُدھر شامیوں کے پاس شیر نہیں تھا)۔ شامی فوج کے سپاہی پہلی مرتبہ شیر کو دیکھ کر اتنے ڈرے کہ فرعون کو نرغے میں لے کر بھی کوئی دشمن سپاہی اس کے قریب نہ آسکا۔ رعمیسس کی فتح دراصل اس کے شیر کی فتح تھی۔

اگلے ہال میں ملکہ حطشپ سط کے کارناموں کا ذکر تھا۔ جب یہ خاتون بطور فرعونہ تخت پر بیٹھی تو اس نے ملکہ کی طرح حکومت کرنی چاہی۔ لیکن لوگوں نے اس کا بالکل نوٹس نہیں لیا کیونکہ پہلی مرتبہ کسی خاتون نے تاج پہنا تھا۔

ملکہ نے پہلے ضبط سے کام لیا۔ پھر تنگ آکر ایک دن مصنوعی داڑھی لگا لی اور اعلان کر دیا کہ یُوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اگر یہ مَردوں کی دنیا ہے تو آج سے مجھے بھی مرد تصوّر کیا جائے اور فرعون کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

رعایا اس قدر مرعوب ہوئی کہ جب تک ملکہ نے داڑھی لگائی سب فرمانبردار رہے (رعایا مصنوعی داڑھی کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اگر کہیں فرعونوں نے اصلی داڑھی رکھی ہوتی تو ملکہ کو حکومت کرنی مشکل ہو جاتی)۔

ایک جگہ آدابِ ضیافت کا ذکر تھا۔ سب سے پہلے مہمانوں کو غُسل کرایا جاتا تھا، لیکن پانی کی جگہ تیل استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی (پہلوانوں کی طرح) سارے جسم کی مالش کی جاتی تھی۔ اس کے بعد چکنے چپڑے مہمانوں کو لکڑی کی چھوٹی سی ممّی دکھائی جاتی تھی اور مشورہ دیا جاتا تھا کہ ابھی وقت ہے کھا پی لو، ورنہ ایک دن یہ حالت ہو گی۔ شدید مالش کروانے اور ممّی دیکھنے کے بعد جتنی بھوک رہ جاتی ہو گی اس کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اہرام کی عظمت کا اندازہ زمین سے لگانا مشکل ہے۔

خوفو کے ہرم کی چوٹی پر چڑھ کر نیچے دیکھا تو یوں لگا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ چوٹی کی نوک اب بالکل سپاٹ ہے۔ اوپر اتنی جگہ ہے کہ آسانی سے بیڈ منٹن کھیل سکتے ہیں۔

اُوپر کی چڑھائی بڑی کٹھن ہے۔ کھانے کی میز جتنے بڑے پتھروں کی ایک سو چھتیس یا پینتیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔

میں نے دور بین سے نیل کو دیکھا۔۔۔۔ ریت کے وسیع سمندر میں اُفق کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک ایک سبز لکیر کھینچی ہُوئی تھی۔

ایک طرف ممفس اور سقرہ کے اہرام ہیں۔ پھر فسطاط نظر آتا ہے جہاں فاتحِ مصر عمروبن العاص کی مسجد ہے۔ بائیں کو ہٹ کر قاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر سلطان صلاح الدّین ایّوبی کا قلعہ ہے اور محمد علی کی مسجد (جو ۱۸۵۷ میں مکمل ہوئی۔ ہمارے طلبا کو کم از کم یہ سنہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔) وہیں چاہِ یوسف بھی ہے جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت یوسف کو قید کیا گیا تھا۔ قریب ہی زلیخا کے روایتی محل کے نشانات ہیں۔ پرانے شہر میں بے شمار تاریخی مسجدیں ہیں جنہیں جامعہ کہا جاتا ہے۔۔۔۔ سادہ اور پُر شکوہ جامعہ ابنِ طولُون ہزار سال پرانی مسجد ہے اور جامعہ ازہر ہزار برس پرانی یونیورسٹی۔ ایک طرف مملوک حکمرانوں کے مقبروں کے پیاز نما گنبد نظر آتے ہیں۔ ان حضرات نے جب محسوس کیا کہ خالی مقبروں پر لوگ کبھی کبھار ہی آتے ہیں تو انہوں نے ہر مقبرے کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کرنی شروع کر دی تاکہ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہے۔ آگے الجزیرہ کا خوشنما علاقہ ہے۔ جزیرے عموماً سمندر میں ہوا کرتے ہیں لیکن الجزیرہ نیل میں ہے یا یوں کہئے کہ اس کے دونوں طرف دریا کی شاخیں بہتی ہیں۔

پھر نیا شہر آتا ہے جس میں مجسمے ہیں، چوک ہیں اور ڈربوں جیسے بے شمار فلیٹ۔ دن میں شہر اور دریا دونوں مٹیالے سے نظر آتے ہیں جیسے ہلکی ہلکی گرد میں اَٹے ہوئے ہوں۔ لیکن رات کی ظُلمت اور بجلی کی روشنیاں قاہرہ اور نیل کو بے حد خوشنما بنادیتی ہیں۔

نیچے ابوالہول اتنا ذرا سا دکھائی دیتا ہے کہ دفتروں میں کام کرنے والے مُعنّک حضرات کو شاید ہی نظر آئے۔ ابوالہول کے قریب میرا دوست دوربین سے شاید مجھے اُوپر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ثانیہ کھڑی کتاب پڑھ رہی تھی۔

گائیڈ جو مجھے کھینچ کھینچ کر اُوپر لایا تھا بڑی بے صبری سے بار بار گھڑی دیکھتا۔ وہ مجھے فوراً نیچے پہنچا کر نئی سواریاں اوپر لانا چاہتا تھا۔

پہلے تو وہ الصبّرا کہنے پر مان گیا۔ لیکن پھر اس کی حالت ناگفتہ ہوتی گئی۔ آخر ہم اُترنے لگے۔ ہرم کی چوٹی سے نیچے اُترنا ایسا ہے جیسے تقریباً ڈیڑھ سو دیواروں سے کودنا۔

میں ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا کہ ثانیہ نے ہرم کے اندر جانے کی تجویز پیش کی۔ میرے دوست نے احتجاج کیا لیکن وہ نہ مانی۔

ذرا سی دیر میں ہم نہایت تنگ اور تاریک سُرنگ میں کمر دوہری کیے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ایک ٹمٹماتی روشنی آتی یا کوئی لڑکھڑاتا ہوا آدمی ملتا جو واپس آ رہا ہوتا اور ہماری آہٹ سُنتے ہی زور سے کھانستا کہ کہیں ٹکّر نہ ہو جائے۔

ستانا یا سیدھا ہونا بالکل ناممکن تھا کیونکہ سر تقریباً گھٹنوں کو چھُو رہا تھا۔ کافی دیر چڑھائی کے بعد یہ مژدۂ جانفزا ملا کہ فرعون کا مدفن قریب ہی ہے۔

ایک آخری ہلّے میں یہ مہم سَر ہو گئی۔

ہم سیاہ پتھروں کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جہاں ایک طرف پتھر کا ٹب سا بنا ہوا تھا۔ بالکل یہیں کبھی فرعون کا تابوت رکھا گیا تھا۔

باقاعدہ کمر سیدھی ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ اندر آنے اور باہر نکلنے کا فقط ایک تنگ اور دشوار گزار راستہ تھا۔

دفعتاً کھڑبڑ ہوئی اور دس بارہ سیّاح اندر آ گئے۔ کمرے میں ایک دم کافی بھیڑ ہو گئی۔ اگر کچھ اور لوگ اس وقت اندر آنا چاہتے تو انہیں اندر آنے میں اور اندر

والوں کو باہر نکلنے میں بڑی دقّت ہوتی۔

"اگر بجلی فیل ہو جائے تو کیا ہو گا؟" میرے دوست نے پوچھا اور ثانیہ گھبرا گئی۔

"اس وقت ہم تیئس لاکھ پتھروں کے بیچ میں پھنسے ہوئے ہیں۔" میں نے اُسے خوشخبری سنائی۔

"مجھے کچھ ڈر سا لگ رہا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اور ہر پتھر اڑھائی ٹن کا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"للّٰہ ایسی باتیں مت کیجئے۔"

"لیکن اگر کوئی پتھر دفعتاً آ گرے۔ لڑھک کر راستہ روک دے۔ پھر؟"

"بھئی لڑکی کو ڈراؤ مت۔ دراصل میں بھی گھبرایا ہوا ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہو رہا؟"

میرے دوست نے پوچھا۔

"اس وقت کچھ نہیں ہو رہا کیونکہ میں پہلے ڈر چکا ہوں۔"

"کب؟ کہاں؟"

"جب اسکاٹ لینڈ میں کوئلے کی کانوں میں جانا پڑا تھا اُس وقت۔ لیکن تب ہم سطح سمندر سے نیچے ہوا کرتے تھے، اس وقت اُوپر ہیں۔"

بڑی مشکلوں سے باہر نکلے، کیونکہ راستے میں کافی ٹریفک تھا۔ سرنگ میں بار نار کھانسنے

اور گلا صاف کرنے کی آوازیں آتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں ہم مینا ہوٹل کے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھے پسینہ سُکھا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ دو یورپین نما مصری بھی تھے جو میرے دوست کے دوست تھے۔ وہ فرفر عربی بول رہے تھے اور غٹ غٹ پی رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ دو گیلن پی کر وہ اُٹھے اور ایک خوشنما سا رومال میرے دوست کو دے کر چلے گئے۔

میں نے اس معطّر رنگین رومال کے بارے میں پوچھا۔

"یہ تبرّک ہے۔ میرے یہ دونوں دوست الحاگ (یعنی الحاج) ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا بذریعہ ہوائی میل AIR MAIL واپس آئے ہیں، (میرے دوست کی

انگریزی کمزور ہے۔ مثلاً کیفے میں فرمائش کرتے وقت Strong Coffee کو وہ عربی میں مضبوط کافی کہا کرتا ہے)۔“

”تعارف کراتے وقت تو تم نے ان کے حاجی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔“

”تو کیا اس کا بھی ذکر ہوا کرتا ہے؟“ اس نے بڑے تعجّب سے پوچھا۔

میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے وہ قوّال یاد آرہے تھے جو لہک لہک کر گایا کرتے ہیں

حج پر چلے چلو

ضرور کوئی بات ہے۔

واپسی پر ثانیہ نے بتایا کہ وہ وادئ نیل پر THESIS لکھ رہی ہے۔

”کافی مشکل کام ہے۔ اب تو اور مشکل ہو گیا ہے۔ تاریخ پر جو مواد میں نے اتنے عرصے میں اکٹھا کیا تھا جو نظریے اتنی محنت اور مطالعے کے بعد قائم کیے تھے وہ آپ دونوں نے بالکل درہم برہم کر دیئے ہیں۔ انہیں دوبارہ ترتیب دینے اور سب کچھ درست کرنے میں کم از کم دو مہینے لگیں گے۔“ اس نے شکایت کی۔

"صرف دو ہی مہینے لگیں گے؟"

"شاید تین چار لگ جائیں۔" وہ بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ مصر کی ثانی ہو یا بحیرۂ روم کی سونیا؟" میں نے پوچھا۔

"دونوں۔" میرا دوست ہنسا۔ "یہی تو مصیبت ہے۔"

ہوٹل میں تار ملا۔ اسکندریہ سے ٹام نے بھیجا تھا۔۔۔ "کل شام کو پہنچ رہا ہوں۔"

ٹام سکاٹ لینڈ کا تھا اور ہوائی جہازوں کی کسی کمپنی میں ملازم تھا۔ ہماری دوستی محفلوں، کلبوں یا ہوٹلوں کی دوستی نہیں تھی جو تعارف اور تکلّف آداب کی محتاج ہوتی ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے بار بار ملنا اور لگاتار خط و کتابت ضروری ہے۔ سپاہیوں کی دوستی تھی۔۔۔ خندقوں، بمباریوں، صحراؤں اور خیمہ بستیوں کی دوستی۔۔۔ جہاں خوف بھی برابر بٹتا ہے اور فکر بھی۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ کتنے ہی سال گزر جائیں لیکن دوبارہ ملتے ہی وہ پرانا احساسِ رفاقت عود آتا ہے۔

پہلے سے موٹا اور قدرے گنجا ٹام چلّایا ''او مشرق کے چار بیویوں والے نواب۔''

''او سکاٹ لینڈ کے ان پڑھ کنجوس۔۔۔کیا حال ہے تیرا؟''

ہم نیل کے کنارے اُسی کیبن میں بیٹھے تھے جہاں کبھی بہت سی شامیں اکٹھے گزاری تھیں۔

بالکنی کا وہ مخصوص کونا، وہی میز، تین کرسیاں، بہتے ہوئے دریا کا دلکش نظارہ، اور دوسرے کنارے پر کھجور کے پانچ درخت۔۔۔۔۔

ملازم تیسری کرسی ہٹانے لگا تو ٹام نے منع کر دیا۔ ''اسے یہیں رہنے دو۔ یہ اولمپیا کی کرسی ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟ کبھی ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''میری طرح اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ ایک دفعہ بیروت میں دُور سے دیکھا تھا۔''

ہم اُن ہی پرانی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ٹام نے دریا کی طرف پشت کر رکھی تھی۔

''یاد ہے وہ اصرار کیا کرتی کہ میں اس کرسی پر بیٹھوں تا کہ دریا کو نہ دیکھ سکوں۔

کہا کرتی۔۔۔ تم بس میری طرف دیکھتے رہو۔"

"مردوں کی طرح باتیں کرو۔ یہ کیا زنانے قصّے لے بیٹھے ہو"۔

"یاد ہے یہ نشان۔۔۔ جب حملے میں مُجھے گولی لگی۔ تمہارے علاج کے باوجود اب تک زندہ ہوں۔"

"میں نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن سکاٹ لینڈ والے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ ہمیشہ بچ جاتے ہیں۔"

"پتہ ہے کہ شیپرڈ ہوٹل جل چکا ہے۔ اب وہاں خالی میدان پڑا ہے۔ وہ دِن بھی کیسے تھے؟ جب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ہمیشہ مفلس رہا کرتے۔ تنخواہ پہلے ہفتے میں ختم ہو جاتی۔ پھر نابی سے قرض لینا پڑتا۔ نابی ٹام کا ہم وطن تھا اور اس کی کفایت شعاری بلکہ کنجوسی مشہور تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ جو چیز نابی لے لیتا واپس نہیں کرتا تھا۔

وہ اپنی منگیتر کو انگوٹھی پہنا کر محاذ پر آیا تھا۔ جنگ کے چند سال بعد جب ایڈنبرا میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ اتنے دُبلے پتلے نابی کی بیوی بے حد موٹی تھی۔ شاید وہ بھانپ گیا اور اس نے علیحدگی میں مجھے بتایا کہ جب تک

یہ منگیتر رہی بالکل چھریری تھی۔ شادی قریب آئی تو یکلخت موٹی ہو گئی۔ میں نے اسے چھیڑا کہ شادی سے پہلے اس نے جتن تو کیے ہوں گے کہ اس قدر پَلی ہوئی لڑکی سے منگنی ٹوٹ جائے لیکن وہ اتنی موٹی تازی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی نہ اُتار سکا ہو گا۔ آخر اسکاٹس مین تھا اور اس انگوٹھی پر پورے دس پونڈ خرچ کر چکا تھا۔ لہٰذا۔۔۔ زَرمی خورم۔۔۔ کے سلسلے میں مجبوراً شادی کرنی پڑی ہو گی۔ قاہرہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے متعلق مشہور تھا کہ اہرام کی سیر کی ترغیب دیتے وقت اکثر کہا کرتے۔۔۔ "اہرام چلیئے۔ چار میل فاصلہ ہے لیکن فوجیوں سے خاص رعایت، ان کے لیے صرف تین میل!" نابی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ سنتے ہی ذرا سی رقم بچانے کے سلسلے میں اہرام جانے کے واسطے فوراً تیار ہو جاتا۔

نابی اور مَیں پیرس میں اکٹھے تھے، ٹام نے بتایا۔ "فرانس میں کچھ عرصہ رہ کر مَیں نے یہاں تبادلہ کرا لیا۔ شاید یہ نیل کا فسوں ہے جو بار بار کھینچ لاتا ہے۔ کوئی اور جگہ اتنی پُر کشش نہیں معلوم ہوتی۔ غالباً مَیں پہلے سے کافی بدل گیا ہوں۔"

"لیکن یہ تغیّر قدرتی ہے۔ ہم سب بدل رہے ہیں۔ ہر گزرا ہُوا دِن، ہر نیا تجربہ، ہر وہ انسان جو زندگی کی شاہراہ پر ہمیں ملتا ہے، ہم پر اثر ڈالتا ہے۔ اور پھر تم تو ہو بھی ایسی جگہ جہاں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑ رہا ہو گا۔"

"لیکن اب مجھے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ جب ہوائی جہاز آتا ہے تو اس میں سے نہایت ہونّق بے ہنگم ہجوم اُترتا ہے۔۔۔ خود غرض، جلد باز، خود پرست لوگ۔ ہر ایک اپنے آپ کو سب سے اہم سمجھتا ہے۔ شرارتی بدتمیز بچّے، بنی ٹھنی اُدھیڑ عمر کی عورتیں، بے حد دُبلے اور ضرورت سے زیادہ موٹے تازے ہانپتے ہوئے مرد۔ اُنہیں یا تو کہیں پہنچنے کی سخت جلدی ہے اور یا مُسرّت کی تلاش ہے۔ کیسی مُسرّت؟ کون سی مُسرّت؟ یہ نہیں جانتے بس کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ انبساط کے متلاشی ہیں۔ شور، بدکلامی، طنزیہ گفتگو۔ چِلّاتے، غُل مچاتے ہجوم۔ جہاں دیکھو وہاں لوگ موجود ہیں۔ پہلے شکاریوں کو جانوروں کی تلاش میں دُور دُور جانا پڑتا تھا۔ لیکن اب جہاں جاؤ انسان ملیں گے۔ دنیا کی آبادی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب کرۂ ارض پر کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں ہوگی اور نہ اناج کا ایک دانہ ہوگا۔"

"تمہیں کسی خاص قوم یا طبقے سے نفرت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ نابی، تم اور چند دوستوں کے سوا۔۔۔"

"تو گویا تمہیں کسی سے بھی نفرت نہیں۔ تم تو نہایت مرنجان و مرنج لڑکے تھے اور مہاتما بُدھ کی تعلیم تمہیں خاص طور پر پسند تھی۔"

"وہ سب غلط نکلا۔ اگر کسی کو بنی نوع انسان کی باہمی محبّت یا نیکیوں کے متعلق ذرا سی غلط فہمی ہو جائے تو اسے چاہیے کہ بسوں ٹرینوں میں اُترتے چڑھتے ہجوم کو غور سے دیکھے۔ جہاں اتنا سا بھی مقابلہ ہو انسانیت رُخصت ہو جاتی ہے۔ اب تو مجھے انسانوں سے زیادہ حیوانوں کی پرواہ ہے جو کم از کم خاموش تو رہتے ہیں۔"

"تم نے اب تک پالتو جانور دیکھے ہیں اور چڑیا گھر کے حیوان۔ جنگل کے درندوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ نہ مَیں ماہرِ نفسیات ہوں، نہ بنی نوع انسان کا عاشق۔ لیکن سُنتے یہی ہیں کہ جس چیز سے جتنی شدید نفرت ہو اُس سے اتنی ہی محبّت بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ اچھا نہ لگے تو اسے نظر انداز کیا کرتے ہیں، بے رُخی برتتے ہیں۔ مگر شدید نفرت بالکل بے سُود ہے۔ شاید تم کسی دن بڑے انسان دوست بن جاؤ۔ میاں خوش رہا کرو! خواہ مخواہ نفرت کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے خود اپنی بھوک اور نیند تباہ ہوتی ہے، بلڈ پریشر بھی بڑھتا ہے۔۔۔ لہٰذا عُمر کم ہوتی ہے۔ اور جس سے نفرت کی جائے اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کے سَر میں اتنا سا درد تک نہیں ہوتا۔ جنگ کے دنوں میں ویرانوں کے وہ کیمپ یاد ہیں؟ جہاں کئی کئی ہفتے مکمل تنہائی میں گُزرتے۔ جہاں نہ دوست نظر آتا تھا نہ دشمن۔ کئی کئی دنوں کے بعد کوئی بدّو دُور سے گزرتا تو کتنی خوشی ہوا کرتی؟ ایک دوسرے کو بُلا بُلا کر دکھاتے کہ وہ آدمی جا رہا ہے۔ اور تم ہی تو کہا کرتے تھے

کہ ایک دفعہ جنگ ختم ہو لے پھر خوش رہا کریں گے۔۔۔"

"ہاں یاد ہے۔"

"تم تو خوش نصیب ہو۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو بے مقدور ہیں۔ یہاں تک نفرت کی توفیق بھی نہیں رکھتے۔"

"مُجھے پتہ ہے۔"

"ہمارے ملک کی ایک حسینہ بھی اِسی دَور سے گُزری تھی۔ اس کی شادی غلط شخص سے ہو گئی تھی۔۔۔۔"

"مَیں نے مرزا صاحباں کے چند اشعار کا ترجمہ سُنایا۔۔۔"

پیر کی درگاہ پر حسینہ یُوں ملتمس ہوئی

مَیں زبان چڑھاؤں اگر میرے خاوند کا انتقال ہو جائے

کاش کہ دو چار پڑوسنیں بھی سرگباش ہوں

اور باقیوں کو بُخار چڑھ جائے

بنیے کی وہ دُکان بھسم ہو جہاں رات بھر چراغ جلتا ہے

فقیر کا وہ کتّا مرے جو ہر وقت بھونکتا رہتا ہے

سب کے سب کہیں دفع ہو جائیں

گلیاں بالکل سُنسان ہو جائیں

اور اُن میں میرا محبوب چہل قدمی کیا کرے۔۔۔۔۔

”چنانچہ تم پہلے انسان نہیں ہو جس نے یُوں محسوس کیا ہو۔ لیکن وہ تو محبّت مَیں ناکام رہی تھی۔ تمہاری شادی تو مرضی کے مطابق ہوئی ہے۔ تمہارا محبوب دریا نیل بھی یہیں ہے۔ موسیقی کی تانیں بھی وہی ہیں۔ جوانی بھی ہے۔ کیا نہیں رہا؟“

ٹام چُپ ہو گیا۔ اس نے جیب سے ایک آویزہ نکالا جس میں بڑا سارا سفید موتی دمک رہا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔

ہمارا ایک دوست خلیجِ فارس کے ایک چھوٹے سے جزیرے سے واپس آیا تو اس کے پاس نہایت قیمتی موتیوں کی پوٹلی تھی۔ یہ موتی اس نے غوطہ خوروں کا چھوٹا موٹا علاج کر کے حاصل کیے تھے۔ اِدھر وہ قاہرہ پہنچا اُدھر جیسے شہر بھر کو موتیوں کا علم ہو گیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ موتیوں کے عوض قیمتی کیمرہ، گھڑی، قالین وغیرہ خریدے گا۔ لیکن عجیب عجیب لوگ اس کے پاس آتے۔ اسے پر اسرار جگہوں پر لے جاتے اور نہایت سستے داموں کے عوض موتی خریدنا چاہتے یا ڈرا دھمکا کر موتی مانگتے۔

گلیوں میں اس کا تعاقب کیا جاتا۔ جو ملتا علیک سلیک کے بعد پہلا سوال ہوتا۔ جب لی اللّولُو۔

کیبرے میں رقاصہ اُسے ایک طرف لے جا کر کہتی۔۔۔۔ اعطنی اللّولُو۔ کبھی اُسے موٹے تازے لوفر پکڑ لیتے اور نعرہ لگتا سُلّم اللّولُو۔

غرضیکہ لُولُو کی گردان ہوتی کہ ہم نے اس کا نام لُولُو رکھ دیا (عربی لُولُو نہیں بہاولپوری لُولُو)۔

موتیوں کے سلسلے میں اُسے دو چار مرتبہ زدوکوب بھی کیا گیا۔ یہ اہلِ قاہرہ کی

سراسر زیادتی تھی۔

اس کے موتی ختم ہونے کو آئے تو ہم نے زبردستی دو اس سے چھین لیے۔ ان کے آویزے بنے اور اولمپیا کو دیئے گئے۔ اچھا، تو یہ اولمپیا تھی!

”میں نے تو سُنا تھا کہ انگریز کبھی عاشق نہیں ہوتے۔ غلطی سے اگر ہونے لگیں تو اپنے آپ سے بحث مباحثہ کر کے دلیلوں کی بنا پر سارا معاملہ منسوخ کر دیتے ہیں۔“

ٹام خاموشی سے اس آویزے کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں چھُٹّی کے وہ دن یاد ہیں جو ہم نخلستانوں میں گزارا کرتے۔ صحرا کے اَن دیکھے راستوں اور سرسبز خِطّوں میں کتنی جاذبیت تھی۔ ڈھلتے سورج کی پیلی پیلی دھوپ، نُور میں ڈوبی ہوئی وادیاں، دریا کے کناروں کا ملائم لہلہاتا ہوا سبزہ، چمکتا ہُوا نیلا آسمان اور حسین پراسرار دنیا۔ جب ویرانے نغموں سے گونج اُٹھتے۔ ایک ایک ذرّے میں زندگی سانس لیتی تھی۔ اور زندگی کہاں نہیں تھی؟ سُورج سے لے کر زمین تک۔۔۔ دریا سے صحرا تک۔۔۔ اِس اُفق سے اُس اُفق تک! ہر شے میں کتنی تازگی تھی۔ کتنا نکھار تھا۔ ایسے دِن پھر نہیں آئیں گے۔ وہ راتیں کبھی

نہیں آئیں گی جب آسمان کے تارے چمکتے چمکتے بالکل نیچے آ جاتے تھے۔ اور وہ لڑکی کیسی تھی۔ کتنی پیاری، مَن موہنی، معصوم اور صابر۔ کسی بات کا بُرا نہ مانتی۔ میں لڑتا جھگڑتا۔ اُسے ناحق بُرا بھلا کہتا۔ اور وہ خاموش بیٹھی مُسکراتی رہتی۔ کہا کرتی کہ محبّت کرنے والوں کے ایک دوسرے پر بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ آیندہ ملاقات کا وقت طے ہونے لگتا تو ہمیشہ کہتی کہ اگر دیر سے آئے تو میں انتظار کروں گی۔ اگر نہ آ سکے تو خفا نہیں ہوں گی۔ نہ کبھی اُس نے گلہ کیا۔ نہ کبھی شکایت کا ایک لفظ اُس کے ہونٹوں پر آیا۔ اُن دِنوں نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بار بار یہی سوچتا کہ یہ اجنبی ہے۔ بچپن سے مصر میں رہی ہے۔ اس میں یونانی اور لاطینی خون کی آمیزش ہے۔ وطن لے جاؤں گا تو دوست مذاق اُڑائیں گے۔ سوسائٹی اسے قبول نہیں کرے گی۔ میں نے ہمیشہ اُسے اپنے سے کمتر سمجھا۔ اس سے اکثر جھوٹ بولا لیکن وہ میری ہر بات کا یقین کر لیتی۔ پھر اُس کی توجّہ اور پیار سے میں گھبرانے لگا۔ پیچھا چھُڑانے کے لیے بہانے تلاش کیے۔ کہا کہ میرا تبادلہ ہونے والا ہے۔ پہلے ایک کورس پر جانا ہو گا۔ پھر دمشق پہنچوں گا۔

مَیں نے اصرار کیا کہ وہ میری روانگی سے پہلے دمشق جا کر وہاں یونیورسٹی میں

داخلہ لے لے۔ اور میں عنقریب آ مِلوں گا۔ کوئی انگریز لڑکی ہوتی تو فوراً اَڑ جاتی لیکن وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔ جُدا ہوتے وقت نہ وہ روئی نہ غم کا اظہار کیا۔ بس مُستقبل کی باتیں کرتی رہی، جیسے مجھ پر مکمل اعتبار ہو۔۔۔۔"

"مجھے یاد ہے، چلتے وقت اس نے تمہیں یہ آویزہ دیا تھا۔"

"اور آویزہ ہاتھ میں تھما کر کہنے لگی کہ ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ دو آویزے بچھڑ جائیں تو ایک نہ ایک دن ضرور ملتے ہیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ پھر کبھی نہیں ملیں گے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا ہے؟"

"میں وطن پہنچا۔ وہاں کتنی لڑکیاں ملیں۔ ایک سے تھوڑی سی واقفیت بھی تھی۔ اس نے فوراً اُن خطوط کا حوالہ دیا جو وہ مُجھے لکھا کرتی تھی اور جن میں فقط اسکاٹ لینڈ کے گیلے اور سرد موسم کا ذکر ہوا کرتا۔ مَیں اور وہ غالباً رواداری کے سلسلے میں ملنے لگے۔ دراصل جب جنگ کے اختتام پر لڑکے واپس گئے تو کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح جس کے ہاتھ میں ڈور آئی اس نے دبوچ لیا۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہمارے ہاں شناسائی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ نہ کسی ایک لڑکی کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی

واحد لڑکے کا۔ کچھ عرصہ تو مَیں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ پھر اسی موسم کے خطوط لکھنے والی لڑکی سے منگنی کرلی۔ منگنی کے اگلے دن نہ جانے کہاں سے ایک پرانی ہم جماعت آنکلی۔ اس نے ضِد کی کہ چھُٹّی کے دِن باہر لے چلو۔ شہر میں کہیں جاتے ہوئے ڈر تھا کہ جسے انگوٹھی پہنائی ہے کہیں وہ نہ دیکھ لے۔ چنانچہ اُسے چند میل دور سمندر کے کنارے لے گیا۔ جب ہم چٹانوں پر دھوپ سینک رہے تھے تو سامنے سے ایک جوڑا گزرا۔ لڑکی کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ میری منگیتر تھی جو اپنے کسی پرانے دوست کے ساتھ وہاں آئی ہوتی تھی۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی، لیکن میں نے کرلی۔۔۔۔"

ٹام نے کُرسی کا رُخ دریا کی طرف موڑ دیا اور باہر تکنے لگا۔

"جب رومن بادشاہ HADRIAN نے اپنے پیارے دوست ANTONIUS کی لاش گہرے غار میں دفن کی تو بقیہ لوگوں کو باہر بھیج کر الوداع کہنے کے لیے غار میں اکیلا رہ گیا۔ غار کی تاریکی، تنہائی اور ایک بے جان جسم کی موجودگی نے ہیڈریئن پر ایسا اثر کیا کہ کچھ دیر کے بعد وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ جب روشنی دکھائی دی اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا تو اس شکر ادا کیا کہ وہ زندہ ہے۔ یہ واقعہ مصر میں ہوا تھا اور انطنینوس نیل میں ڈوب گیا

تھا۔ یہ مُردہ یادیں ہیں انہیں جلادو۔ ان پر زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔"

"اگر وہ مر جاتی تو آہستہ آہستہ صبر آجاتا لیکن وہ زندہ ہے۔ اب بھی اس چہرے پر معصومیت ہے۔ وہ دلکش مسکراہٹ آنکھوں اور ہونٹوں کی دلآویزی۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بیروت میں اُسے دور سے دیکھا تھا۔"

"یہ آویزہ دریا میں پھینک دو۔ یہ سب نیل کا جادو تھا۔ یہیں شروع ہوا تھا یہیں ختم ہو جائے گا۔"

"نہیں، یہ آویزہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔"

"تو کم از کم لوگوں سے نفرت تو نہ کیا کرو۔ پہلے زمانے میں نامراد عاشق یا تو جنگلوں ویرانوں میں نکل جاتے تھے۔ یا آہیں بھر کے چُپکے چُپکے رو کر خاموش ہو جاتے تھے۔ تم عجیب دہشت پسند عاشق ہو۔ دیکھتے نہیں یہ دل کا اندھیرا ہے۔ ورنہ سب کچھ جُوں کا تُوں ہے۔ سُورج اسی طرح چمکتا ہے۔ پھول اسی طرح کھلتے ہیں۔ لوگ جان بوجھ کر محبّت کے چکر میں پڑتے ہیں۔ اس دریا کے کنارے آج شاید تم اور میں دو انسان اداس ہیں، ورنہ سب مُسکرا رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔"

"اگر کسی محبت کرنے والی لڑکی سے شادی ہو جاتی تو شاید پچھلی یادیں بھلا دیتا لیکن

وہ مَردوں کی طرح اکڑ کر چلنے والی، بات بات پر وکیلوں کی طرح بحث کرنے والی، میری بیوی، بالکل اجنبی ہے۔ گھر میں ہم اس طرح رہتے ہیں جیسے ہوٹل میں دو مسافر۔ گرمیوں میں انگریز بیویوں کے غول کے غول اٹلی جاتے ہیں۔ وہاں موٹے موٹے باتونی اطالوی لفنگے گائیڈوں کا بہروپ بھرے منتظر ملتے ہیں۔ وہ ان عورتوں کو لیے لیے پھرتے ہیں۔ ان کے حُسن و جمال کے جھوٹے قصیدے پڑھتے ہیں۔ انہیں گانا سُناتے ہیں۔ میری بیوی بھی بار بار اٹلی جاتی ہے۔"

مجھے ایک نظارہ یاد آ گیا۔ میں نیپلز کے ایک نائٹ کلب میں اپنے اطالوی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یکایک میرا دوست چوکنا ہو کر ایک پلے ہوئے پستہ قد شخص کو گھورنے لگا جو سیاہ ڈِنر جیکٹ پہنے ایک لمبی تڑنگی عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

"پہچانا اس مُردود کو؟ یہ ہمارا باورچی رومیو ہے۔ ایسے بڑھیا کپڑے پہن کر یہاں ناچنے آیا ہے۔ ضرور چوری کی ہو گی۔" میرے دوست نے جھلّا کر اسے بلایا۔۔۔۔ واقعی یہ باورچی رومیو ہی تھا۔ باز پُرس کی تو رومیو نے جیب سے بٹوہ نکال کر دکھایا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ نوٹ کہاں سے اُڑائے؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"سیورنیا انگلیز۔۔۔۔" اُس نے لمبی انگریز عورت کی طرف اشارہ کیا اور آنکھ ماری۔

ٹام خاموش بیٹھا کھوئی کھوئی نگاہوں سے دریا کو دیکھ رہا تھا۔

"تم واقعی بدل گئے ہو۔ میرے کہے کا خیال نہ کرنا، نصیحت کرنا دُنیا کا آسان ترین کام ہے۔ میں اب تک نصیحتیں کر رہا تھا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو پتہ نہیں کیا کرتا۔ فلسفی SPINOZA نے مثال دی تھی کہ اگر کسی اینٹ کو ہوا میں پھینک دیا جائے اور متحرک اینٹ سے پوچھا جائے کہ کیا کر رہی ہو تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں اور جس حال میں ہیں، اس کا سبب وہ واقعات اور حالات ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں۔ جن کی رَو ہمیں بہائے لیے جا رہی ہے۔ ہم پر طرح طرح کے دباؤ ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔ اور پھر زندگی کا کوئی خاص فارمولا تو ہوتا نہیں۔ کبھی سب کچھ درست ہو جاتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کسی خوشبو کا ہلکا سا جھونکا، کسی رنگ کی جھلک، کوئی نغمہ۔۔۔۔ یہ بڑے ظالم ہو سکتے ہیں۔ بھولی بِسری یادیں دفعتاً تازہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی یہ خوشگوار ہوتی ہیں، کبھی از حد کرب ناک۔ اور پھر محبّت کی یادیں۔۔۔۔ALAMEIN کا میدانِ جنگ ایک وسیع قبرستان ہے، جہاں ہر سال دنیا کے مختلف حصّوں سے

لوگ آتے ہیں اور مٹھی بھر خاک ساتھ لے جاتے ہیں۔۔۔۔ وہ خاک جس میں پیاروں اور خوابوں کا خون بہا تھا۔"

ہوائی جہاز اُڑنے لگا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ تاحدِّ اُفق چمکتا ہوا ریت تھی یا مٹیالی چٹانیں۔ شمالاً جنوباً ایک گہری سبز لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ بیچ میں رُوپہلا تار تھا اور دونوں طرف ہریالی کا حاشیہ۔ جہاں دریا سیدھا ہوتا تھا وہاں یہ حاشیہ بھی سیدھا چلتا، جہاں دریا مُڑتا وہاں یہ بھی مُڑ جاتا۔

کسی جگہ زندگی اور ویرانی کا امتزاج اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ اِس ملک میں ہے۔ جہاں جہاں سے نیل گزرتا ہے وہاں روئیدگی ہے، گہما گہمی ہے جو حصّے اس سے دور ہیں وہاں تپتے ہوئے سورج کی شعاعیں ہر چیز و جھُلس دیتی ہیں، ریت کے انبار ہیں، بادِ سموم ہے اور وحشت ناک خاموشی۔

یہی وہ ملک ہے جہاں ریگستان اور سبزے کے درمیان یوں خط کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک قدم ہریالی پر ہو اور دوسرا ریت پر۔

دُھند

کیمپ میں اس مرتبہ جو جھڑی لگی ہے تو ہفتے گزر گئے سُورج دکھائی نہ دیا۔ بارش ہلکی ہوتی تو جھکڑ چلنے لگتے۔ ان کے مدھم ہوتے ہی بادل کمروں میں آ گھستے۔ دُھندلاہٹ اور نمی بڑھ جاتی۔ ٹِین کی چھت پر ندوں کی ٹن ٹن ٹن پھر تیز ہونے لگتی۔ کبھی پٹاخ پٹاخ اولے گرتے۔ یہ رُکتے تو کچھ اور شروع ہو جاتا۔ لیکن بُوندا باندی جاری رہتی۔

جب مہینے تک دھوپ نہ نکلی تو دل خوش کرنے کے لیے مشہور ہستیوں کے اقوال پڑھنے شروع کیے۔ ایک دانش مند کا مقولہ تھا کہ حالات خراب ہونے کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ایک حد مقرر ہے جہاں سے انہیں بہتر ہونا پڑتا ہے۔

لیکن فلاسفر کو شُبہ ہُوا۔۔۔۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ اس حد کے بعد بُرے حالات واقعی بہتر نہ ہوتے ہوں بلکہ تب تک محسوس کرنے کی صلاحیت ہی کُند ہو چکی ہو۔“

ایک جگہ لکھا تھا۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔ مگر انجنیئر کی رائے میں اس کی جگہ ؏ اگر آسانیاں ہوں زندگی آسان ہو جائے یا ؏ اگر دشواریاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے، زیادہ پریکٹیکل ہوتا۔

کہاوتیں پڑھتے اور دوہراتے رہے لیکن کچھ نہ ہُوا۔

پھر خوش فہمی کا سہارا لیا کہ بارش ہمیشہ تو نہیں رہے گی۔ کبھی کبھی بادل چھنٹیں گے ہی۔ تب شعاعوں سے سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ اور اگر سورج نکلنے میں واقعی کئی مہینے یا سال باقی ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بانکی البیلی ہستی آ کر اس گیلے اور نیم تاریک ماحول میں ایک دم نُور پھیلا دے، رنگ بھر دے۔

آخر ہماری آرزو پوری ہوئی۔ اور ایک ہستی نہیں آئی۔۔۔۔ بلکہ دو۔

تلہٹی کے نچلے قصبے سے پیغام ملا کہ آپ کے ملاقاتی آئے ہیں۔ ان میں ایک تو ٹھیکیدار سا معلوم ہوتا ہے مگر دوسرے کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اجنبیوں کو کیمپ میں بھیجنے کی ممانعت ہے اس لیے آپ انہیں شناخت کر کے ساتھ لے جائیں۔

ہم نے جواب بھیجا کہ ضرور غلطی ہوئی ہے کیونکہ ہمیں کسی ملاقات کا اِنتظار

نہیں۔ کچھ دیر کے بعد اطلاع آئی کہ نہ صرف پیغام صحیح ہے بلکہ وہ دونوں آدمی بھی صحیح ہیں۔

نیچے پہنچ کر دیکھا تو وہاں مقصود گھوڑا کھڑا تھا جسے ٹھیکیدار سمجھا گیا۔ اور اس کے ساتھ شیطان تھے جنہیں کچھ بھی نہیں سمجھا گیا۔

"یہاں آکر تمہارا حُلیہ اس قدر بدل چکا ہے کہ مُجھے پہچان تک نہ سکے۔" مقصود گھوڑے نے شکایت کی۔ "حالانکہ یہاں بُلایا بھی تم ہی نے ہے۔" (احباب کی رائے میں مقصود گھوڑا ان لوگوں میں سے ہے جن سے جتنا مِلا جائے اتنے ہی زیادہ وہ اچھے لگتے ہیں) مَیں نے اُسے مدعو کیا تھا لیکن ڈیڑھ دو برس پہلے۔ اور وہ بھی اتنی دُور سمندر کے کنارے سے۔ اُدھر شیطان ایک عرصے سے مکمل طور پر لاپتہ تھے۔

کیمپ کی بلندی سے ہری بھری وسیع وادی کے حسین نظارے دکھائی دیئے تو دونوں بہت خوش ہوئے۔ کبھی دور بین سے اُونچی برفانی چوٹیوں کو دیکھتے تو کبھی اُن پہاڑی درختوں، بیلوں، پودوں کو جو اُن کے لیے بالکل نئے تھے۔

موسم صاف ہوتے ہی سب کچھ چمک اُٹھا۔ ہریالی نے پہاڑیوں میدانوں پر سبز

مخمل پھیلا دی۔ خُودرو پھولوں کے رنگ برنگے تختے، چاندی کے تار جیسے نالے اور چشمے، خوشنما کُنج۔۔۔ سارے منظر پریُوں کشیدہ کاری کرتے کہ اس کی دلکشی دوبالا ہو جاتی۔

اُنہوں نے اُوپر کے گھنے جنگل کی سیر بھی کی۔ وہیں مقصود گھوڑے نے پہلی بار لومڑی، مارخور اور مُرغِ زرّیں کو دیکھا۔ (اُدھر لومڑی، مارخور اور مرغِ زرّیں نے بھی مقصود گھوڑے کو پہلی مرتبہ دیکھا)۔

پھر آہستہ آہستہ شوق کم ہونے لگا۔ وہ حسین نظاروں کے عادی ہوتے گئے۔ ناشتے کے بعد سب کام پر نکل جائے تو یہ دونوں اکیلے رہ جاتے اور سہ پہر تک واپسی کا انتظار کرتے۔ کُچھ دِنوں کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ قدرتی نظاروں کے علاوہ انہیں انسانی مناظر کی بھی تلاش تھی۔

ایک دِن مقصود گھوڑا بھاگا ہوا آیا اور بغل میں دبائی ہوئی چھُری کھولتے ہوئے مژدۂ جانفزا سُنایا کہ ذرا دیر پہلے بادلوں اور اکہرے کے اُوپر سے دور بین سے کچھ دکھائی دیا ہے۔ ایسا پُرجوش نعرہ شاید کولمبس نے امریکہ کے ساحل کو ہندوستان

سمجھ کر بھی نہیں لگایا ہو گا۔

اُسے دوسرے پہاڑ پر ملغوبہ، تہمنہ وغیرہ نظر آ گئی تھیں۔ ہم ان کو جانتے تھے۔ چنانچہ اس دریافت پر کسی نے اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔

اس پہاڑ پر ان لڑکیوں کے کُنبوں کے علاوہ کافی لوگ گرمیاں گزارنے آتے۔ دوسرے پہاڑی مقامات سے یہ جگہ سستی تھی۔ ہر سال مئی جون میں خواتین و حضرات کی آمد شروع ہو جاتی۔ پیدل چلنے، بلندیوں پر چڑھنے اور سینری سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ان میں سے بیشتر موٹے ہو کر ستمبر اکتوبر میں واپس لوٹتے۔ اور میدانوں میں فخر سے بیان دیتے کہ پہاڑ پر صحت بنا کر آئے ہیں۔ پھر شیطان اور مقصود گھوڑے نے ہماری مصروفیت سے تنگ آ کر (یا شاید مطمئن ہو کر) اِدھر اُدھر چکر لگانے شروع کر دیئے۔ وہ دوسرے پہاڑ پر جاتے جہاں نحیفہ تھی، تہمیدہ، ملغوبہ اور اس کی بہنیں۔ نچلے قصبے میں آس پاس کے باغات اور بستیوں میں بھی جہاں پتہ نہیں کس سے ملاقات ہوتی۔

چنانچہ اب سہ پہر کو ان دونوں کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ دیر ہو جاتی تو مجھے اور انجنیئر کو ان کی تلاش میں بھیجا جاتا۔ ہمارے پاس دو ہلکی پھلکی (سیکنڈ ہینڈ) جیمز موٹر سائیکلیں تھیں۔ اتنے چھوٹے سائز کی کہ جب لمبا آدمی سوار ہوتا تو دیکھنے

والوں کو یوں لگتا کہ جیسے السیشن کتّے پر بیٹھا ہو۔ لیکن سستی مل گئیں اس لیے خرید لیں۔

ایک اتوار کو پروگرام بنا کہ چل کر دیکھیں تو سہی کہ یہ کہاں جاتے ہیں۔

لاری سے دوسرے پہاڑ پر پہنچے۔ وہاں چند ہم عُمر مِل گئے جنہیں چاء پر مدعو کیا۔ اگلے اتوار کو وہ آئے تو بڑی عالمانہ اور کارآمد گفتگو ہوئی۔ کئی انٹلکچوئل موضوع زیرِ بحث رہے۔ مثلاً معاشرتی اصلاحات، شاعری کی پرانی قدریں اور لڑکیاں۔ کاشتکاری میں مشینوں کی اہمیت، لڑکیاں اور مغرب میں جذباتیت کا زوال۔۔۔۔ داستانِ حاجی بابا اصفہانی، لڑکیاں اور مشرق میں جذباتیت کا عروج۔ لڑکیاں، برناڈ شاء اور لڑکیاں۔۔۔۔۔

پھر انہوں نے بُلایا۔ ایک آسیب زدہ سی عمارت میں جہاں کبھی اپنے اچھّے وقتوں میں کلب ہوا کرتا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گئے۔۔۔ دہنے، بائیں، سامنے، جدھر نظر جاتی لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔

کچھ دیر میں جب کیمپ کی مسلسل تنہائی کا اثر کم ہوا اور اُنہیں گنا تو لڑکیاں صرف چھ نکلیں۔

مقصود گھوڑے کے ایک برعکس شیطان نے (واسکوڈی گاما کی طرح) ایک صحیح دریافت بھی کی تھی۔ انہوں نے نچلے قصبے میں ایک بیحد کثیر العیال شخص ڈھونڈ نکالا۔

کیمپ کی خاموشی یا جمود سے تنگ آکر جب کسی کو شادی کا خیال آتا یا منگنی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں تو وہ فوراً سب کو اس کے گھر لے جاتے۔

وہاں پہنچتے ہی یوں معلوم ہوتا جیسے کسی عالمی ٹورنامنٹ کے فائنل میں پرانے حریفوں کا تابڑ توڑ مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ ریفری کی طرح اُنہیں بار بار گھُرکتا، ڈانٹتا، اور باہر بھیج دیتا۔

علیک سلیک کے بعد کوئی خیریت پوچھ بیٹھتا تو وہ چمک کر کہتا۔۔۔ ”خیریت؟ خیریت ہو تمہارے ہاں۔۔۔۔ جہاں بیوی ہے نہ بچّے۔ اتنی نفری میں خیریت کیسی؟ کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ رہتا ہی ہے۔“ پھر آہستہ آہستہ ان دونوں کی کوہ نَوردی کم ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ جب اطلاع ملی کہ قریب ہی چاء کے باغات میں ایک حسینہ دیکھی گئی ہے جو کہ لوکل لڑکیوں سے (جنہیں ڈاکٹر LOCAL ANAESTHEISA) کہا کرتا، کہیں بہتر ہے تو شیطان نے پوچھا۔۔۔۔ ”یہ باغات کتنی دور ہیں؟“

"تقریباً بیس میل ہُوں گے۔"

"بیس میل زیادہ ہیں۔ حسین سے حسین لڑکی کو چھ سات میل سے زیادہ دُور نہیں ہونا چاہیے۔ اگر فاصلہ ہی طے کرنا ہے تو ولایت چلو جہاں چپے چپے پر نازنیں پائی جاتی ہیں۔"

انجنیئر، فلاسفر، کیمسٹ اور ڈاکٹر کسی سروے کے سلسلے میں وہاں تھے جس کا اصل مقصد انہیں پوری طرح معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی انہیں شُبہ ہوتا کہ جنہوں نے انہیں بھیجا ہے وہ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ مَیں ان سے کہیں پہلے پہنچا تھا۔۔۔۔ ایک ایسے شخص کی جگہ جو کبھی لمبی چھُٹّی لے لیتا۔ کبھی تبادلے کی کوشش کرتا تو کبھی دونوں۔

اس چھوٹے سے کیمپ میں ہم عُمر گِنے گِنائے تھے۔ ان چاروں سے جلد ہی واقفیت ہو گی۔ یہ کام پر نکلتے تو کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ انہیں عجیب و غریب معلومات کی تلاش رہتی۔ مثلاً جمادات، معدنیات، نباتات کے اعداد و شمار، انسانوں حیوانوں کے رویے پر ماحول کے اثرات، ماحول پر جانداروں کا اثر، موسم کا زلزلوں سے تعلق، کیمیائی کھاد اور جرائم کا باہمی تناسب، ہواؤں کے رُخ کا صحت سے واسطہ، وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ گول گول سی سروے حسبِ معمول نہایت اہم تھی۔ تبھی مہینے کی پہلی کو یہ چاروں اپنی اپنی رپورٹ کی کئی کئی کاپیاں ٹائپ کرا کے رجسٹری کراتے۔ (اگر پہلی کو نہ بھیج سکتے تب بھی پہلی ہی درج کرتے)۔ ہر مرتبہ پہنچنے کی رسیدیں، کا فقرہ بھی لکھا جاتا لیکن ہیڈ آفس سے جوابِ جاہلاں باشد خموشی پر عمل ہو رہا تھا۔ جیسے وہاں کسی کو یہ سب کچھ پڑھنے کی فرصت نہ ہو یا اس طویل و عریض وادی میں دورے کرتے۔ نقشے بناتے۔ چاء کے باغوں، تھانوں، ڈسپنسریوں، دکانوں، ڈاک خانوں، دفتروں میں جا کر کاغذات اور ریکارڈ سے نہ جانے کیا اخذ کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگوں سے ایسے ایسے ذاتی سوال پوچھتے جن کا سچا جواب کبھی نہ ملتا۔ حیوانات میں فقط پالتو چوپائیوں، پرندوں ہی کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ جنگل کے پرندے پھُر سے اُڑ جاتے اور درندے کافی بلندی پر رہتے تھے۔ اُن سے ڈر بھی لگتا۔

اس علاقے میں ان پر طرح طرح کے شُبے کیے جاتے۔ دفتروں میں انہیں AUIOTOR تصوّر کیا جاتا۔ دُکانداروں کو ان پر انکم ٹیکس والوں کا گمان ہوتا۔ طبیب کمپاؤنڈر انہیں خفیہ پولیس کے افراد سمجھتے۔ اُدھر پولیس والوں کو یقین تھا کہ یہ بات بات پر جرح کرنے والے ضرور وکیل ہوں گے۔ ویسے اکثر باشندوں کا یہی خیال تھا کہ کسی انتشار پسند گروہ کے ممبر ہیں جنہیں پبلک کو خواہ مخواہ تنگ

کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یا پھر یہ کہیں سے خود آ گئے ہیں۔ جب مَیں پہلے پہل کیمپ میں پہنچا تو سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کئی مرتبہ برفباری ہوئی۔ برف سے چھُپے ہوئے کیمپ اور سفید چادر سے ڈھکی ہوئی وادی کے فوٹو ساتھیوں کو دکھاتا تو انہیں یقین نہ آتا کہ یہ خوشنما مناظر یہیں کے ہیں۔

پہلی برفباری اچھی طرح یاد تھی۔ مختصر سی چھُٹّی کرسمس کی گہما گہمی میں گزار کر شہر سے واپس لوٹا تو میدانوں میں برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سطحِ مرتفع شروع ہوتے ہی وہ اسٹیشن آیا جہاں گاڑی بدل کر کھلونے جیسی ننھی مُنّی ٹرین میں سوار ہوا۔ چھک چھک کرتا انجن پورا زور لگا کر چڑھائی طے کر رہا تھا۔ دُھندلی برفانی چوٹیاں، ہری بھری پہاڑیاں اور جنگل نظر آنے لگے۔ یہ نظارے کھڑکیوں میں سے اور اچھے لگتے، جیسے فریم کرانے سے تصویر کا حُسن بڑھ جاتا ہے۔ گھاٹیوں ،ندیوں کے پُلوں، سُرنگوں کے بعد آخری اسٹیشن آیا۔ وہاں گھٹا تھی اور نہایت سرد پھوار۔ کیمپ جانے والی لاری روانہ ہوئی تو بَل کھاتی ہوئی سڑک پر بارش شروع ہو گئی، جس کی تیزی بڑھتی گئی۔ ہلکی سی دُھند آئی جو گہری ہونے لگی۔ سامنے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیور کو یا تو راستے کا ایک ایک موڑ زبانی یاد ہو گا یا بیشتر لاری ڈرائیوروں کی طرح انجن سٹارٹ کرتے ہی گرد و پیش سے قطعاً بے خبر ہو چکا تھا۔

پھر اولے پڑنے لگے۔ اتنی تیزی سے آتے کہ گرتے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ اس سے آگے سفید سے بُرادے کی بوچھاڑ آئی۔ یہ نہ تو اولوں کی طرح تھا نہ برف جیسا۔ دونوں کے درمیان کچھ بجری سی تھی جو بڑی شدت سے پڑ رہی تھی۔ کچھ اور چڑھائی کے بعد نہ تیز جھکڑ تھے نہ آسمان سے گرنے والی چیزوں کا جوش و خروش۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر سے برف کے لاکھوں ننّھے مُنّے گالے یوں گھومتے ہوئے آتے جیسے بے شمار چھوٹے چھوٹے پَر فضا میں تیر رہے ہوں۔ بلندی پر گالے بڑے ہو گئے جو بالکل سیدھ میں آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ برفانی تہہ دبیز ہوتی گئی اور اس نے سڑک کو چھُپا لیا۔ ڈرائیور نے کسی نہ کسی طرح ہمیں نچلے قصبے تک پہنچا دیا۔ آگے لاری پھسلنے لگی۔

مجھے ابھی اور اُوپر جانا تھا۔ سوٹ کیس اور تھیلا سنبھال کر گھُٹنے گھُٹنے گہری برف چڑھنا شروع کیا۔ راستوں سڑکوں کا کوئی نشان نہ رہا تھا۔ محض اندازے سے چلنے لگا۔ ایک جگہ تو کندھوں تک برف میں دھنس گیا۔ شاید یہ کوئی گڑھا تھا۔

آخر جب ٹھٹھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو خیال آیا کہ آج ٹھنڈے جھونکوں سے لے کر برفباری کی مختلف کیفیتیں دیکھنے کا موقع ملا۔ یعنی جب میدانوں میں خُنک جھکڑ چلنے لگیں اور سطحِ مرتفع پر گھٹا ہو تو پہاڑوں اور چوٹیوں پر کیا ہوتا ہے۔

برف گرتی رہی۔ رات بھر ہر طرف نور ہی نور تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے باہر چاندنی پھیلی ہوئی ہے تو کبھی گمان ہوتا کہ یہ صبح صادق کی جلاء ہے۔

سِپ سِپ، سِپ سِپ، سَک سَک، سَک سَک،۔۔۔ گالے ہولے ہولے گِر رہے تھے۔ کبھی ٹہنیوں دیواروں سے برف کا وزنی تودہ دھڑام سے گرتا۔ اس کے بعد پھر سِپ سَپ سَک سَک کی دھیمی صدا آنے لگتی۔ صرف گھڑی سے پتہ چل سکا کہ صبح ہو گئی ہے۔ بر فباری میں دن اور رات میں بہت تھوڑا فرق تھا۔

برفانی مناظر کے علاوہ بادلوں کی بھی تصویریں اُتاری تھیں، کیمرے پر رنگین FILTERS لگا کر۔ پہاڑ کے بادل میدانی بادلوں سے کچھ اور طرح کے لگے۔ یہ طرح طرح کے روپ بدلتے عجیب سماں باندھتے۔ بر فباری سے پہلے آسمان میں اِکا دُکا بادل ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ کئی بادل گٹھ جوڑ کر کے یوں اکٹھے ہو جاتے جیسے ہر طرف فقط ایک ہی بادل چھایا ہوا ہے۔ پھر سب کچھ دھندلا ہو جاتا اور گالے گِرنے شروع ہو جاتے۔ بر فباری کے بعد بھی یہ گھٹاٹوپ دُھواں دیر تک رہتا۔

سردیاں کم ہونے پر بڑے بڑے دو دو تین تین منزلہ شفاف بادل آسمان کے ایک گوشے میں یوں جم جاتے جیسے سنگِ مرمر کے محل ہوں۔ جب تیز جھونکوں سے ہلتے تو جانوروں کی سی شبیہیں بن جاتیں جو آپس میں چھیڑ خانی کرتیں، لڑتیں۔

گرمیوں میں جونہی ہوا رُکی فوراًاودی اودی گھٹائیں آ پہنچتیں۔ نیلے کالے گھنگور بادل پانی سے بالکل لبریز۔۔۔۔ آ کر یوں رُک جاتے۔ جیسے اب یہیں رہیں گے۔ ان میں بجلیاں چمکتیں، کڑاکے دار دھماکے ہوتے، تاریکی اور روشنی ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتیں، کبھی تو گرج گرج کر برسے بغیر چلے جاتے لیکن ایک دفعہ بوندیں شروع ہو جاتیں تو مہینہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ بارہا یہ بھی دیکھا کہ نیچے وادی میں سیاہ گھٹا ہے، بجلیاں کڑک رہی ہیں، موسلادھار بارش ہو رہی ہے اور اوپر کیمپ میں دھوپ نکلی ہوئی ہے۔

جھڑی ختم ہونے پر برسے ہوئے ہزاروں سفید براق بادل رواں دواں آتے اور چلے جاتے۔ دُھلی ہوئی بدلیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتیں۔

اور خزاں کے وہ اُداس مٹیالے بادل، جو دِن بھر محزوں اور ساکن تھے، غروبِ آفتاب پر شفق پھولتے ہی رنگوں میں یُوں کھیلتے کہ میلہ سالگ جاتا۔ یقین ہی نہ آتا کہ یہ وہی بادل ہیں جو کچھ دیر پہلے بالکل پھیکے اور خاموش تھے۔

دیکھنے میں وہ فلاسفر بالکل نہیں لگتا تھا۔ فقط ہم ہی جانتے تھے کہ اس پر کبھی کبھی بے خبری کے دورے پڑتے ہیں۔ جیسے اُس دِن جب اس کا پاؤں کُتّے کے پنجے پر پڑ گیا۔ کُتّے نے نعرہ لگایا تو اسے فوراً ڈانٹا۔۔ ”ننگے پیر پھرو گے تو یہی ہو گا۔“ یا سہ پہر کو سیر کرتے ہوئے پہاڑی پر بے نور چاند نظر آیا تو بولا۔ ”عجیب بات ہے کہ دن میں تو کبھی کبھی چاند سامنے آ جاتا ہے لیکن رات کو سورج کبھی نہیں دکھائی دیا۔“ پھر دعوت پر قصبے کے ہوٹل میں بیرے نے MENU کا کارڈ اس کے سامنے رکھا۔ کھانوں کی لمبی فہرست پڑھ کر معذرت کرنے لگا کہ اتنی ساری چیزیں تو وہ ہرگز نہیں کھا سکتا۔ تب اُسے یاد دِلانا پڑا کہ کارڈ سے دو تین کھانے چُنے جاتے ہیں۔ اسی طرح چِک پڑ جانے پر ڈاکٹر نے اسپرین دی تو اس سے پوچھا۔ ”یہ اسپرین درد کو خودبخود کیسے ڈھونڈ لیتی ہے؟ سر دُکھ رہا ہو، کمر، گھٹنا یا کندھا۔۔۔ یہ تیر کی طرح سیدھی وہیں جا پہنچتی ہے۔“

جب فلسفیوں کے نام لیتا تو سب تاڑ جاتے کہ ٹھوس کتابوں کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی پڑھ کر سُناتا۔۔۔۔ ”سقراط کا قول ہے کہ اس درہم برہم دنیا میں انسان تھوڑا بہت خبطی نہ ہو تو بالکل پاگل ہو جائے۔“ یا یہ کہ ”اگر کسی طرح سب

عورتوں کی شادی ہو سکتی اور سب مرد کنوارے رہ سکتے تو دنیا کتنی بہتر جگہ ہوتی۔"

شیطان کا خیال تھا کہ فلاسفر یا تو ایسا قنوطی ہے جو خود مسخرہ بھی ہے ورنہ ایسا مسخرہ ہے جسے قنوطیت نے قابو کیا ہوا ہے۔

جب سنجیدہ مطالعے کا بوجھ بڑھنے لگتا تو شیطان اس کے لیے لائبریری سے چُن کر کتابیں لاتے۔۔۔ "ایسی ہلکی پھلکی تحریریں بھی پڑھا کرو۔ اگر افاقہ نہ ہو تو واپس کر دینا۔ فائدہ ہوا تو تقدیر، حسنِ اتّفاق، نطشے، کانٹ یا جس کے بھی تم معتقد ہو اس کا شکریہ ادا کر دینا۔"

ناشتے پر جب وہ خوش نظر آتا تو ہم فوراً سمجھ جاتے کہ رات اس نے اپنا محبوب خواب دیکھا ہے۔

اِس طویل خواب میں پہلے ایک بیل گھومتا۔ بعد میں وہ کولہو بھی سامنے آجاتا جس میں بیل جُتا ہُوا ہے۔ پھر دُور اُفق پر ایک تارہ چمکتا جو آہستہ آہستہ قریب آنے لگتا۔ اس بڑے سارے روشن سیّارے پر جب برِّاعظم اور سمندر دکھائی دیتے تو معلوم ہوتا کہ یہ دنیا ہے جو بیل کی طرح دائیں سے بائیں گھوم رہی ہے۔ کرۂ ارض اور کولہو کے بیل کی جنبش میں ہم آہنگی آجاتی اور دونوں اکٹھے گردش کرنے

لگتے۔

ایک دِن کیمسٹ پُوچھ بیٹھا۔۔۔۔ ”اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے ؟“

”یہی کہ فلسفۂ حیات کی اس سے بہتر کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔“ فلاسفر نے جواب دیا۔

”لیکن ایک ہی خواب بار بار دیکھ کر اُکتا نہیں جاتے ؟“

”نہیں کیونکہ اس میں ردّوبدل ہوتی رہتی ہے۔“

”بیل کبھی سفید ہوتا ہے۔ کبھی چتکبرا اور بعض اوقات سیاہ۔۔۔۔“

لڑکیوں میں اُسے کوئی خاص بلکہ کوئی عام دلچسپی نہیں تھی۔ ملغوبہ اور تہمیدہ کی باتیں سُن کر تو وہ حیران ہُوا کرتا کہ جو لڑکی اپنی ذہنی عُمریوں کھلم کھلا ظاہر کر دے وہ اصلی عُمر بھی بتا دے گی۔ اور جو اپنی صحیح عُمر بتا دے وہ کوئی بھی راز افشا کر سکتی ہے۔ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

تہمیدہ کے ہاں اگر لڑکیوں کے سامنے بیٹھنا پڑ جاتا تو نیچے دیکھتا رہتا یا چھت کی طرف۔ انجنیئر چھیڑتا کہ اس وقت نگاہیں زاویۂ قائمہ بنا رہی ہیں۔ ملغوبہ کی دعوتوں میں نظریں ایسے ٹیڑھے ترچھے زاویے بناتیں جن کے نام کافی مشکل

ہوتے۔۔۔ مثلاً زاویہ حادہ۔ زاویہ منفرجہ۔ اور جب ملغوبہ سامنے ہوتی تو وہ زاویے بھی بنتے جن کے نام انجنیئر تک کو نہیں آتے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب سے واپسی پر اسے یکایک خیال آیا کہ پارٹیاں نہ ہوں تو بنے ٹھنے لڑکوں اور سجی سجائی لڑکیوں کی بار بار ملاقات کیونکر ہو۔ ٹیلیفون نہ ہو تو گھنٹوں کسی (سوائے آپریٹر) کی مداخلت کے بغیر جھوٹی سچی باتیں نہیں کی جا سکتیں۔ نہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند (خاص طور پر ناپسند) کا اندازہ ہو سکتا۔ اور کار نہ ہو تو سست یا فربہ محبوب سے لگاتار ملنا جلنا مشکل ہے۔۔۔ پتہ نہیں ڈیڑھ دو سال پہلے لوگ کس طرح محبّت کر لیا کرتے تھے۔"

محبت کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ اکثر مردوں کی زندگی میں کم از کم تین لڑکیاں آتی ہیں۔ ایک تو وہ جس سے شادی نہ ہو سکی۔ دوسری وہ جو بیوی بن جاتی ہے۔ اور تیسری جس کے فقط خواب دیکھے تھے لیکن نظر کبھی نہیں آئی۔

فلسفے کے بعد اُسے موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اپنے ساتھ گراموفون ریکارڈوں کے کئی ڈبے لایا تھا۔ یہ ریکارڈ عموماً چھُٹی کے دن لگائے جاتے۔ برسات شروع ہوئی تو بار بار بجنے لگے اور جب لمبی لمبی جھڑیاں لگیں تو ہر وقت۔۔۔!

موسیقی سب کو پسند تو تھی لیکن اتنی نہیں کہ صبح سے رات تک اور کوئی آواز نہ

آئے۔

اور وہ نغمے تو اتنے غمناک تھے کہ انہیں مسلسل سُن کر تندرست سے تندرست انسان، یہاں تک کہ دنیا کا ہیوی ویٹ چمپئین بھی بھُوں بھُوں کر کے رونے لگے۔

سب سے پہلے مقصود گھوڑے نے ہتھیار ڈالے۔

اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ موسیقی سے بے بہرہ (یا کانوں سے بہرہ) تھا۔ فقط اُسے کسی چیز کو دُہرانے سے چِڑ تھی۔ کالج کے دِنوں میں بھی اس نے کبھی سبق رَٹا تھا، نہ کسی کھیل کی مشق کی تھی (تبھی کہیں تیر نہیں مارے)۔

لیکن اس مرتبہ مقصود گھوڑے نے جو حرکت کی اس میں جدّت تھی۔ جب فلاسفر حجامت کرتا، نہانے لگتا یا کپڑے بدلتا، یعنی تقریباً بے بس ہوتا تو وہ گراموفون کی رفتار یا تو بالکل آہستہ کر دیتا یا بہت تیز۔ اس سے گانے کی آواز کبھی تو یوں نکلتی جیسے بڑے سائز کا چوپایہ ڈکرا رہا ہو یا پھر مختلف پرندے چُوں چُوں کر کے آپس میں لڑنے لگتے۔ جتنی دیر میں فلاسفر آ کر رفتار درست کرتا تب تک نغمے کا لطیف تاثر ختم ہو جاتا۔

جب بار باریوں ہوا تو اپنے پسندیدہ ریکارڈوں سے فلاسفر کا بھی جی بھرنے لگا۔ ایک ایک کر کے وہ واپس ڈبّوں میں بند کر دیئے گئے۔ ''اب پتہ چلا ہے کہ موسیقی لطف اندوز ہونے کے لیے جہاں اعلیٰ فنکار اور صحیح مُوڈ ضروری ہیں وہاں سازگار ماحول اور موزوں رفتار بھی اتنے ہی اہم ہیں۔۔۔۔'' اس نے بتایا۔

پھر وہ نچلے قصبے سے (کرائے پر) ہارمونیم لے آیا۔ سب خوش ہوئے کہ اب شوخ چنچل سُروں کی نمائش کیا کریں گے۔ لیکن جو نہی وہ ہارمونیم بجانا شروع کرتا نہ جانے کیوں پڑوسیوں کا کُتّا رونے لگتا۔ لَے مسرور ہو، سنجیدہ، یا کیسی بھی لیکن کُتّا ساتھ دیتا۔

آخر شیطان کو ٹوکنا پڑا۔۔۔ ''تم وہ دُھن کیوں نہیں بجاتے جو کتّے کو نہ آتی ہو۔''

اس پر ہارمونیم بھی واپس بھیجنا پڑا۔

کیمسٹ کی ٹریننگ امریکہ میں (جسے وہ ہمیشہ STATES کہا کرتا) ہوئی تھی۔ وہیں کچھ عرصہ ملازمت کی اور ریسرچ بھی، چنانچہ اب اُسے ذرّے ذرّے میں کیمسٹری کے جلوے نظر آتے۔

"کچھ سیکھنا ہے تو علم پڑھو۔" وہ کہا کرتا۔ "جو حیات پر اتنا حاوی ہے کہ آکسیجن کے بغیر کوئی سانس تک نہیں لے سکتا۔ اور جن سیّاروں ستاروں پر آکسیجن نہیں وہاں زندگی بھی نہیں۔ کوئی کیمیکل کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کے ہونے یا نہ ہونے سے انسان کے رویّے پر کس قدر اثر رہتا ہے۔ ذرا سا غصّہ آتے ہی ADRENALIN خون میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اسی سے پٹھے اکڑتے ہیں۔ یہی جوش دلا کر چیخم دھاڑ اور مار کٹائی کراتی ہے۔ اُدھر بیزاری کی وجہ دماغی یا جسمانی تھکاوٹ نہیں، عموماً گلوکوز کی کمی ہوا کرتی ہے۔ تبھی یہ (میری طرف اشارہ کر کے) ڈیڑھ دو میل کی دوڑ، ایک سو ایک ڈنٹر اور اتنی ہی بیٹھکیں نکال کر جب گنڈیریاں چُوستا ہے تو گلوکوز وصول کرتے ہی دوبارہ چُست ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔"

وہ جو کچھ دیکھتا، سُنتا، محسوس کرتا اس کا ذمّہ دار کیمسٹری کو ٹھہراتا۔

کوئی ولایتی حسینہ نظر آتی (دراصل وہاں حسیناؤں کی اتنی کمی تھی کہ ہماری لوکل چمپین یعنی ملغوبہ کو بھی بین الاقوامی معیار پر کوئی گریڈ نہیں مل سکتا تھا) تو وہ کہتا۔۔۔ "خواتین و حضرات! میرا مطلب ہے حضرات۔۔۔ خواتین یہاں ہیں ہی کہاں۔۔۔ پتہ بھی ہے کہ یہ دیدہ زیب چہرہ فقط وٹامن بی کا ممنون ہے، جسے بیوٹی

وٹامن کا رُتبہ مِل چکا ہے۔۔۔"

ہم اسے بتاتے کہ جہاں کی یہ رہنے والی ہے وہاں اس عُمر میں تقریباً سارے نسوانی چہرے پُرکشش ہوتے ہیں۔ کسی تندرست بچّے کو دیکھتے ہی نعرہ لگاتا۔۔۔ "بچّے میں کوئی خاص خوبی نہیں فقط اس کی کیمسٹری درست ہے۔ اگر اس میں لوہا، کیلشیم، فاسفورس وغیرہ صحیح مقدار میں نہ ہوتے تو اس کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہ۔۔۔" اسے یقین دلاتے کہ ہم بچّے کو بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔ نہ دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

"دنیا بھر میں ایک کیمسٹری ہی رہ گئی ہے کیا؟" فلاسفر کبھی ٹوکتا۔ "علوم لاتعداد ہیں۔ اس سے کہیں اہم۔"

"یعنی۔۔۔؟"

"یعنی فلسفہ۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔"

"فلسفہ کیا کرتا ہے۔۔۔۔؟"

"بہت سی گتھیاں سلجھاتا ہے۔"

"مثلاً۔۔۔۔۔"

"مثلاً مجھے تیز بھوک لگی ہوئی ہے۔ مزیدار کھانا سامنے رکھا ہے۔ اور وہ کیمیکل جو سب کا گیسٹرک جوس ہے مگر تمہارا ہائیڈرو کلورک ایسڈ۔۔۔۔ وہ بھی غذا کا منتظر ہے۔ اتنے میں کسی منحوس کا ٹیلیفون آجاتا ہے۔ اس کی منافقانہ باتوں کے بعد جو بھوک آدھی بھی نہیں رہ جاتی۔ لذیذ غذا، اِشتہا، کیمیکل۔۔۔۔ سب کے سب موجود تھے۔ پھر کیا ہو گیا؟"

"تم جیسا کم خوراک بھوک کا ذکر کرے۔ تعجّب ہے۔"

"اچھا فرض کرو کہ کوئی لڑکی میک اَپ کر کے یعنی کئی کیمیکل تھوپنے کے بعد بن سنور کر نکلی۔ اُدھر وہ جو بڑے شوق سے اس کا انتظار کر رہا ہے اسے ڈاکیے نے ایک خط تھما دیا جس میں بُری خبر تو نہیں لیکن ایسی ہے جس پر یقین نہیں آرہا۔ کیفے میں لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے اس کے ذہن پر یہ خبط سوار رہا۔ وہ اسے بے رُخی سمجھ کر چِڑ گئی اور چاء ختم کیے بغیر ہی چلی گئی۔ وہی مقوّیٔ حُسن کیمیکل جو لڑکے کو پہلے لُبھایا کرتے، اس مرتبہ کیوں نکمّے ثابت ہوئے؟ اس کا جواب کوئی فلاسفر ہی دے سکتا ہے، کیمسٹ نہیں۔۔۔۔"

"مگر اس طرح یکایک آزردہ ہو جانے کی بجائے لڑکی کو وجہ پوچھنی چاہیے تھی۔ یُوں بھی خواتین کے موڈ بہت جلد بدلتے ہیں۔ اس کا سبب بائیو کیمسٹری میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی چند روز مسرور رہ کر یکایک خواہ مخواہ زود رنج ہو جائیں گی۔ پھر دیکھتے دیکھتے اتنی فراخدل کہ بڑے سے بڑا قصور بھی معاف ہو جائے گا۔ ذرا دیر کے بعد بالکل چھوٹی سی بات پر اس قدر خفا ہوں گی کہ منانا محال ہو جائے گا۔ کچھ عرصے تک مُسکراہٹیں پھر عود کر آئیں گی۔ اس ساون بھادوں انداز پر حیران ہونے والے یہ نہیں جانتے کہ تغیّر کی اصلی وجہ ہارمونز ہیں جو مردوں کے خون میں بھی ہوتے ہیں لیکن خواتین کے ہارمونز میں مسلسل کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جس سے یہ تبدیلیاں آتی ہیں۔"

"تغیّر مردوں کے مُوڈ میں بھی آتا ہے۔۔۔۔۔" فلاسفر بتاتا "کئی تو پارے کی طرح مچلتے رہتے ہیں۔ قصور تمہارا نہیں، تم نے مضمون ہی ایک پڑھا ہے۔ اگرچہ اس میں سائیکالوجی، فزکس، میڈیسن اور دیگر سائینسوں کو زبردستی گھسیٹ لیتے ہو۔ اگر کہیں لیے ہوتے تو شاید اُن ہی کے گُن گایا کرتے۔ جغرافیے یا تاریخ میں ایم اے کرنے سے۔۔۔۔"

"لیکن کیمسٹری کا اثر ہر مضمون پر پڑا ہے۔۔۔ تاریخ پر بھی کِتنوں کو پتہ ہے کہ

اپنے زمانے کا سدا بہار فاتح نپولین اپنی واٹر لو کی واحد شکست سے پہلے بھی ایک جنگ ہار چکا تھا، وہ محاذ کا معائنہ کر رہا تھا کہ کسی سپاہی نے یونہی کہہ دیا۔۔۔۔ 'مارشل ایک ادنیٰ سے جنگجو کا راشن بھی چکھیئے۔۔۔' اس نے وہ خشک نمکین گوشت کھالیا جو بُسا ہُوا تھا اور جس میں مُضر کیمیکل تھے۔ چنانچہ قولنج میں مُبتلا ہُوا۔ ایک وقفہ آیا جب اسے نہ لڑائی سے کوئی دلچسپی رہی نہ اُن کمانڈروں سے جو بار بار آرڈر لینے آتے۔ سب سے یہی کہتا کہ جو چاہے سو کرو۔ جب وہ یہ بظاہر معمولی سی لڑائی ہارا تو مخالفوں کے حوصلے بلند ہو گئے کہ نپولین جیسے سُورما کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اس کا مجموعی نتیجہ واٹر لو میں نکلا جس کے تھوڑے بہت ذمّہ دار وہ مُضر کیمیکل بھی تھے۔۔۔۔"

"تم نے اُس سپاہی کی خیریت نہیں بتائی جس غریب کا سارا راشن بھُوکا مارشل کھا گیا۔۔۔" فلاسفر نے پُوچھا۔

"کیمسٹ کا کیا مقام ہے؟ اور مستقبل میں کیا ہو گا؟" کیمسٹ نے کہا۔ "افسوس ہے کہ یہاں کسی نے اس کا رُتبہ نہیں پہچانا۔ کسی کو اندازہ ہی نہیں کہ کیمسٹ کی صحیح جگہ کہاں ہے؟"

"یہاں کے کیمسٹ کا مستقبل نہایت روشن ہے۔۔۔ لیکن کیمسٹری میں نہیں۔ رہ

گیا اس کا صحیح مقام۔۔۔" فلاسفر نے اُٹھتے ہوئے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"تو وہ یہ جگہ بخوشی لے لے۔ میں اسے خالی کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر کو یوں تو سب پسند کرتے تھے لیکن کبھی کبھار کوئی پوچھ ہی بیٹھتا کہ یہ کام کیا کرتا ہے۔ شاید اس لیے کیمپ میں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی، یہاں تک کہ پی ایچ ڈی قسم کے ڈاکٹر کی بھی نہیں۔ بار بار یہی جواب دہرایا جاتا کہ جب کوئی ٹیم کہیں جاتی ہے تو رواج کے مطابق ایک ڈاکٹر بھی ساتھ ہوتا ہے۔ تبھی انجنیئر، فلاسفر اور کیمسٹ کو ٹیم سمجھ کر ہیڈ آفس کے کسی کلرک نے اس کا نام بھی شامل کر دیا ہوگا۔

شروع شروع میں کبھی کبھار وہ ہماری صحت کے بارے میں پوچھ لیا کرتا۔ بعد میں مایوس ہو کر خاموش ہو گیا۔ پھر وقت گزارنے کے لیے قصبے کے ہسپتال میں جانے لگا۔

اُسے دو فقرے بہت پسند تھے۔۔۔۔

"اچھاہوا کہ میں وقت پر پہنچ گیاورنہ پتہ نہیں کیاہو جاتا۔"

اور۔۔"ابھی تک نہیں ہوا(یا نہیں ہوئی)۔"

جب اس کے علاج کے باوجود سینما کے منیجر کا خرگوش انتقال کر گیاتب بھی اُسے (یعنی مینجر کو) یہی تسلّی دی کی شکر کرو کہ میں وقت پر پہنچ گیا تھاورنہ پتہ نہیں کیاہو جاتا۔

پھر کیمسٹ کے پاؤں میں (چلے پھرے بغیر) شدید موچ آئی۔ اسے ایکسرے کے لیے نیچے ہسپتال میں لے گیا۔ اور جب کچھ دیر کے بعد گیلی فلم پکڑے باہر نکلا تو بیحد افسردہ تھا۔ سب یہی سمجھے کہ ضرور کوئی ہڈّی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس نے مایوسی سے سر ہلایا "ایک فلم بھی ضائع کی لیکن افسوس ہے کہ کچھ نہیں نکلا۔ ابھی تک سب ہڈیاں ٹھیک ہیں۔ وہ تو اچھاہُوا میں وقت پر آگیاورنہ خبر نہیں کیاہو جاتا۔"

اپنا طبّی معائنہ کراتے ہوئے کوئی کہتا۔۔"سب کچھ درست ہے نا؟"

"ابھی تک تو درست ہے۔" وہ ٹمپریچر، فیس اور بلڈ پریشر لے کر بتاتا۔

کوئی پوچھتا۔۔"جناب میرے جسم میں خون کی کمی تو نہیں؟"

"ابھی تو نہیں جو ہوئی۔" وہ لیبارٹری کی رپورٹیں دیکھ کر کہتا۔

"لیکن بار بار کھانسی آتی ہے کہیں برانکائٹس نہ ہو۔"

وہ سینے کو ٹوک بجا کر بتاتا۔ "برانکائٹس ابھی تک تو نہیں ہوا۔"

جب فلاسفر کو متواتر ہلکی ہلکی حرارت سے طرح طرح کے وہم رہنے لگے تو ڈاکٹر نے اُسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مرض کی تشخیص سے پہلے ہی اتنی ساری دوائیاں ملنے لگیں کہ شفا کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس دوائی سے ٹھیک ہُوا ہے؟ اور اُسے تھا کیا، ویسے ڈاکٹر نے بتایا کہ فلاسفر کو ملیریا، ٹائیفائیڈ، نمونیہ، تپِ دِق، یرقان، کینسر اور مالیخولیا، ابھی تک نہیں ہُوا۔ ہسپتال سے واپس آکر فلاسفر ماڈرن دوائیوں کی اکثر شکایت کیا کرتا کہ اتنی سخت اور تیز ہیں کہ انہیں استعمال کرنے سے پہلے انسان کو پوری طرح فِٹ اور مضبوط ہونا چاہیے۔

مقصود گھوڑا ڈھیلا ڈھیلا سا رہنے لگا تو اُسے مشورہ دیا کہ تم بھی ہسپتال جاؤ۔ اگلے ہفتے اس نے بتایا کہ وہ ہسپتال جا رہا ہے اور وہاں ڈاکٹروں اور عملے کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ملغوبہ کا ایک وہمی اور باتونی رشتہ دار ڈاکٹر کے پاس آیا کرتا۔ اسے دیکھتے ہی شیطان ہم سب کو کھسکنے کا اشارہ کر کے اس سے پوچھتے۔۔۔

"سنایئے قبلہ! بینائی، دماغ اور سینے کی کمزوری۔۔۔۔ بھوک نیند اور بشاشت کی کمی۔۔۔ گردن کمر دانت اور جوڑوں کے درد۔۔۔۔ اور ناطاقتی۔۔۔۔ کو چھوڑ کر آپ کا کیا حال ہے؟"

انجنیئر کے ہاتھوں پر دانے نکل آئے۔ علاج کے لیے کہا تو بولا۔ "معمولی بیماریاں عموماً چھ سات روز تک خودبخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔" اس نے زکام کی مثال دی کہ پانچ چھ دن میں چلا جاتا ہے لیکن علاج کرو تو سات آٹھ روز لگتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر نے زبردست نسخہ لکھ کر نیچے بھیج دیا۔ شاید ہسپتال والے بھول گئے، چوتھے پانچویں روز جب دانے غائب ہونے لگے تو ڈاکٹر نے ارجنٹ پیغام بھیجا کہ نسخے کی چیزیں اسی وقت روانہ کرو، کہیں مریض دوائی کے بغیر ہی نہ تندرست ہو جائے۔"

سینما کا مینجر اپنے خُسر کو چیک اَپ کے لیے لایا۔

"ان کا اچھی طرح معائنہ کر کے طبّی رائے دیجیے کہ کسی علاج کی ضرورت تو نہیں؟ اور یہ بھی کہ اگلی سردیاں یہاں گزاریں یا میدانوں میں؟ آپ کے دوستانہ مشورے سے ہم سب کی تسلّی ہو جائے گی۔"

"پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو دوستانہ مشورہ چاہیے یا طبّی رائے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

شیطان کہا کرتے کہ ڈاکٹر جیسے ہونہار نوجوانوں کی ہر ملک کو ضرورت ہے۔

ولایت میں پڑھا ہُوا انجنیئر اپنے عملی رجحان کی وجہ سے ہر وقت مستعد اور چوکس رہتا۔ اس کی گھڑی درست وقت بتاتی۔ اس کا کیلنڈر بھی صحیح دِن اور مہینہ دکھاتا۔ اس کی ٹیبل ڈائری پر آیندہ کے نہ صرف ضروری پروگرام درج ہوتے بلکہ غیر اہم اور نکمّے لمحات کا بھی ذکر ہوتا۔ مثلاً۔۔۔۔

منگل۔۔۔۔ آدھا دِن بیکاری میں گزرے گا۔

بُدھ۔۔۔۔ سینما کے مینجر کی دعوت پر روٹی کو سالن سے نہیں چاولوں سے لگا کر کھانا۔ سالن اور رائتے میں مرچیں بہت ہوں گی۔

جمعہ۔۔۔۔ شام کو تکلّف تکلّف میں گھنٹہ بھر بیگار کرنی پڑے گی۔

سینچر۔۔۔ سہ پہر کے وقت خرافات سُننے کے لیے تیار رہنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی یوں لگتا جیسے اسے سارے جواب آتے ہیں، فقط سوالوں کا انتظار ہے۔

جس کسی کو مشکل پیش آتی سیدھا اس کے پاس جاتا، چھُٹی سے واپسی میں دیر ہو جاتی تو بہانہ اُس سے پوچھتے کہ اب وہ کیا وجہ لکھیں؟ کسی کا قلم کھو یا جاتا تو اس کے پیچھے پڑ جاتا کہ کدھر گیا اور کیسے تلاش کیا جائے؟ ملغوبہ کے منگیتر کو معمّے حل کرنے کا شوق تھا۔ جب وہ مشکل الفاظ پر اٹک جاتا تو دوسرے پہاڑ سے فارم اسے پہنچاتا کہ مکمل کر کے خود بھیج دے۔ عُمر کی تصدیق کے لیے مقصود گھوڑے سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ مانگا گیا جو کبھی کا گُم ہو چکا تھا۔ اس نے بھی انجنیئر کا تعاقب کیا کہ تمہیں ضرور معلوم ہو گا کہ سرٹیفیکیٹ کہاں ہو سکتا ہے؟ ورنہ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟"

بحث مباحثے سے وہ اکثر کتراتا۔ کسی نے کم گوئی پر اعتراض کیا تو بولا۔۔۔" دوسرے تمہارے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ تم خود انہیں بتاتے ہو اور پھر عقلمندوں کا کہنا ہے کہ جو کچھ مخالف کو معلوم نہیں اس کا ذکر واقف سے بھی مت کرو۔"

لیکن فلاسفر کا خیال تھا کہ سُن لینے اور اس پر غور کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ OPEN MIND کی ہمیشہ تعریف کی گئی ہے۔

"مصیبت یہ ہے کہ اگر MIND کو ہر وقت OPEN رکھا جائے تو طرح طرح

کے لوگ اس میں اوٹ پٹانگ مشورے پھینک جاتے ہیں۔۔۔لیٹر بکس کی طرح! اور مشورے جتنے کم ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے اسے بھی بیشک مت مانو۔"

کوئی کسی کی بار بار تعریف کرتا تو انجنیئر پوچھتا۔۔۔"موصوف سے اب تک کوئی کام پڑا؟ یا اس نے تمہیں کچھ کرنے کو کہا؟"

نفی میں سر ہلانے پر بتاتا۔۔۔"تو ابھی تعریف ملتوی رکھو۔ کام پڑنے پر اصلی آزمائش ہو گی۔ اس سے پہلے سب عموماً ایک دوسرے سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔"

آدابِ محفل کا اُسے ہمیشہ خیال رہتا۔ دعوتوں پارٹیوں کے اختتام سے ذرا دیر پہلے جانے کی اجازت مانگتا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے انگلینڈ میں طالب علمی کے دنوں کا واقعہ سُنایا۔ تب ایک نہایت مشہور کھلاڑی نے جس کی ہر جگہ مانگ تھی، سپورٹس چھوڑ دینے کا اعلان کیا۔ سب حیران ہوئے۔

انٹرویو میں جب یہ سوال کیا گیا کہ اب جبکہ وہ پورے عروج پر ہے، کیا یہ فیصلہ قبل از وقت نہیں، اس پر کھلاڑی کا یہ مختصر سا جواب انجنیئر کو اب تک یاد تھا۔

”عروج کی چہل پہل اور رونق کو اس وقت چھوڑنا بہتر ہے جب سب پوچھیں کہ جا کیوں رہے ہو؟ نہ کہ جب سب کہنے لگیں کہ یہ چلا کیوں نہیں جاتا۔۔۔“

ایسی پُرسکون صبح کوئی گمان تک نہ کر سکتا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ ناشتے پر فلاسفر مُسکرا رہا تھا۔ رات اُسے بیل اور دنیا والا خواب پھر دکھائی دیا۔ انجنیئر کو تسلّی تھی کہ رپورٹ کے لیے آج کہیں سے بنے بنائے نقشے مِل جائیں گے۔ کیمسٹ مسرور تھا کہ عنقریب اس کا روغن مونچھ پہنچ جائے گا جس میں مطلوبہ کیمیکل ہے۔ مقصود گھوڑا مقصود گھوڑے سے خوش تھا کہ دیوالی کی چھُٹی کی وجہ سے آج اخبار نہیں آئے گا۔ اور شیطان اس لیے مطمئن نظر آرہے تھے کہ بقیہ حضرات ناخوش نہیں تھے۔

انجنیئر اور میں موٹر سائیکلوں پر نکلے۔ نقشے تو مل گئے لیکن پورا دن لگا۔ واپسی پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلے قصبے سے گزرتے ہوئے دیسی فلم کا اشتہار دیکھا جس پر بڑا سارا ڈیم بنا ہُوا تھا۔ ایک کونے میں کئی ٹھوڑیوں والا گول مٹول مرد تھا، دوسری

طرف یخیم شحیم حسینہ اور ڈیم کے پیچھے ایک چھریرا سانوجوان۔ انجنیئر خوش ہوا کہ عرصے کے بعد ٹیکنیکل فلم لگی ہے۔ اس میں دریا کے پانی کو سٹور کرنے کے جدید طریقے دکھائے ہوں گے۔ میں نے بتایا کہ ابھی تک پہلا شو ختم نہیں ہوا، بھُوک بھی لگی ہوئی ہے اور پھر دیسی فلم میں کچھ پتہ نہیں کیا دکھائیں گے۔ لیکن اس کے اصرار پر سیکنڈ شو دیکھنا پڑا۔ دیر تک نہ کوئی دریا نظر آیا نہ ڈیم۔ مکالمے نارمل انداز میں بولنے کی بجائے اداکار چلّا چلّا کر تقریریں کر رہے تھے جیسے ابھی ووٹ مانگیں گے۔ سیدھے سادے معمولی واقعات کو توڑ مروڑ کر وہ بنا دیا جاتا جسے ٹریجڈی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

ہنس ہنس کر انجنیئر کا بُرا حال ہو گیا۔ آس پاس کے لوگ یوں گھورتے جیسے ہم ان کا مزہ خراب کر رہے ہوں۔ کسی کی شکایت پر ہمارے ٹکٹ دوبارہ چیک کیے گئے کہ کہیں ہم پاس لے کر مُفت تو نہیں آئے۔

آخر وہ مبارک سین آیا جس کا انجنیئر کو انتظار تھا۔ پردے پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا دکھائی دیا۔ لیکن فوراً ہی پتھر تراشنے والوں نے ہتھوڑے وغیرہ پکڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔ دوسری سمت سے لڑکیاں سیمنٹ کی ننھی ننھی ٹوکریاں تھامے آئیں اور رقص میں شامل ہو گئیں۔ کسی قسم کی تعمیر کے بغیر ہی ہر ناچ کے بعد ڈیم خود بخود

کچھ اور اُونچا ہو جاتا۔ ہر بار وہ پَلی ہوئی خاتون ایک نیا لباس پہن کر ہونٹ ہلاتی اور کسی مشہور گانے والی کے نغمے سُنائی دیتے۔ وہ تہمد پوش پہلوان (ریٹائرڈ) جواباً گاتا۔ کبھی کبھی تھرکتا بھی۔ اس کے ایک ناچ پر تو انجنیئر گھبرا گیا کہ ایسی پُرجوش اُچھل کود اور کششِ ثقل کا اثر ڈھیلے ڈھالے تہمد پر کسی وقت بھی پڑ سکتا ہے لیکن خیریت رہی اور رقص ختم ہوتے ہی انجنیئر نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاید اس نے دیسی فلمیں بہت کم دیکھی تھیں۔ تبھی اُسے حیرت ہوئی کہ جو پھُرتیلا نوجوان سب سے سمارٹ لگا وہ ولین نکلا، اور دونوں ہیوی ویٹ ہستیاں ہیرو ہیروئن ثابت ہوئیں۔ ان کی شادی پر اُسے سچ مچ افسوس ہوا کہ اتنی مضحکہ خیز فلم کو آخر میں خواہ مخواہ ٹریجک بنا دیا۔

باہر نکلے اور آٹھ آٹھ آنے دے کر موٹر سائیکلیں وصول کیں جنہیں ان کے سائز کے مطابق سائیکل سٹینڈ میں رکھا گیا تھا۔ اگلے چوک کی روشنی میں دیکھا کہ ایک بھاری بھر کم آدمی کو پولیس کے دو سپاہیوں نے گھیر رکھا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ پہلے سوچا کہ سیدھے نکل جائیں کیونکہ موٹر سائیکلوں کا نیا ٹوکن ابھی تک نہیں لیا تھا لیکن یہ سپاہی ٹریفک کے نہیں بلکہ گشت لگانے والے نکلے۔ اس لیے ہم رُک گئے۔

جوں جوں سپاہی آگے بڑھتے وہ بازو پھیلا کر کچھ بتاتا ہُوا پیچھے ہٹتا جاتا۔ تاریک گوشے تک جا پہنچتے تو جیسے اباؤٹ ٹرن لے کر پوزیشن بدلتا۔ اس طرح کہ سپاہی ہر بار سیدھے چلتے اور وہ پسپا ہوتا۔ قریب گئے تو کانسٹیبل اس سے پوچھ رہا تھا۔۔۔۔
"تم کہاں رہتے ہو؟ اور کیوں؟"

انہوں نے بتایا کہ یہ شخص مشکوک حالات میں آوارہ گردی کرتے ہوئے پایا گیا، اس لیے تفتیش کی جارہی ہے۔ اُدھر اس نے یائیں یائیں یائیں کی لَے میں فریاد سی کی۔

ایسے سائز کے آدمی کی آواز اتنی ناپختہ ہو۔ اس پر تعجّب ہوا۔

چہرے کا اظہار بھی عجیب سا لگا۔ جیسے کسی تیکھے چالاک اُچکّے کا سر ایک سن رسیدہ بے ہنگم جسم پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے ہماری طرف دیکھ کر ہیلو کہا اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے دو تین دفعہ ہنسنے کی کوشش کی۔

یہ ہنسی بھی کچھ اور طرح کی تھی۔ نہ قہقہہ تھا نہ قہقہے سے ملتی جلتی کوئی اور صدا۔

بلکہ کِھی کِھی کِھی ہی ہاہپ۔۔۔۔ کی سی تیز آواز، جو بالکل بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔

"پہلے خوشامد سی کر رہے تھے۔ ان صاحبان کے آتے ہی لہجہ ہی بدل گیا۔"

کانسٹیبل بولا۔ ”اچھا اب جلدی سے بتادو کہ اتنی رات گئے اندھیرے راستوں میں کیا کر رہے تھے؟“

اس پر پھر مَیں مَیں میاؤں میاؤں کی سی آوازیں آئیں جن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ہر شخص کو ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی ہے، خواہ دن ہو یا رات۔

”یہ پوچھ گچھ اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ کہیں چور آ جائیں، کوئی اور واردات ہو، تو سب پولیس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ پہرہ کیوں نہیں دیا۔“

اس پر کچھ پاؤں پاؤں سی ہوئی۔ پھر سپاہیوں نے کچھ کہا۔ آخر انجنیئر آگے بڑھ کر بولا۔ ”اس کے وزن اور تن و توش کو دیکھ کر یقین آ جانا چاہیے کہ اس قماش کا شخص کوشش کے باوجود بھی آوارہ گردی نہیں کر سکتا۔“ میں نے بھی تائید کی کہ آوارہ گردی کے لئے بھی کئی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے حُلیے کے آدمی اور جو چاہیں کر لیں لیکن آوارہ گردی کی شرائط پر پورے نہیں اُترتے۔

اس پر کانسٹیبل نے فیصلہ سُنایا۔ ”کافی دیر ہو چکی ہے اور یہ دونوں تمہاری ضمانت دینے کو تیار ہیں (ہم بالکل تیار نہیں تھے)۔ اس لیے مشکوک صاحب تم جا سکتے ہو۔ لیکن سورج ڈوبنے کے بعد اس طرف کبھی نظر مت آنا۔ بلکہ دن کو بھی نہ

دکھائی دینا۔"

غلط نام لیے جانے پر اس نے احتجاج کیا، اپنا نام بھی دوہرایا۔ لیکن سپاہی جا چکے تھے۔

معلوم ہوا کہ وہ ڈیڑھ دو میل دور ڈیری فارم میں مقیم ہے۔ یہاں کے مشہور حلوائی نے اسے اور اس کے دوست کو رات کے کھانے پر بلایا تھا لیکن میزبان کے دروازے میں قفل دیکھ کر شُبہ ہوا کہ شاید تاریخ یاد نہیں رہی۔ اس کا دوست سواری کی تلاش میں نکلا کہ اتنے میں سپاہی آ گئے۔

ہم نے باری باری اسے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی لیکن ٹاپ گیئر میں بھی موٹر سائیکل تھوڑی دور جا کر پھَٹ پھَٹ پھَٹ کر کے رُک جاتی۔ بڑی مشکل سے اُسے رُخصت کیا اور آدھی رات کے بعد کیمپ میں پہنچے۔ اگلے سہ پہر کو کیا دیکھتے ہیں کہ کینٹین کی لاری سامنے رُکی اور وہی شخص اُترا۔ آتے ہی بتانے لگا کہ کس طرح اِدھر اُدھر سے پتہ پوچھ پوچھ کر پہنچا ہے اور آیندہ بھی آیا کرے گا۔

بعد میں اسے کئی ناموں سے یاد کیا گیا لیکن جو نام سپاہیوں نے دیا تھا وہی مقبول رہا۔ سب کی رائے میں مشکوک ہی وہ جامع لفظ تھا جو اس کی خصوصیتوں کو بخوبی اجاگر

کرتا تھا۔

دراصل شروع شروع میں ہمیں یہ خصوصیتیں اچھی طرح معلوم نہیں تھیں۔ ورنہ ضرور کوئی تدارک کرتے۔

محبّت کے معاملے میں مقصود گھوڑے کے ریکارڈ کو تسلّی بخش تو نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن یہ NIL REPORT سے قدرے بہتر تھا۔

اس کا رومانی کیریر کچھ یوں تھا۔۔۔۔۔

جب وہ ایف ایس سی کے پہلے سال میں تھا تو شاید محض تجسس کے سلسلے میں پہلی مرتبہ محبّت سے آشنا ہوا۔ یا یہ محبت اس سے آشنا ہوئی جس لڑکی سے وہ مرعوب ہوا تھا اس کا نام عظمت جہاں تھا۔ (دراصل وہ مرعوب زیادہ ہوا تھا اور عاشق کم)۔

اپنے جیب خرچ سے روپے بچا کر لڑکی کے لیے رومالوں، جرابوں اور خوشبوؤں کا

پیکٹ تیار کیا۔ اسے رنگین کاغذ میں لپیٹ کر چمکیلا ربن باندھا اور کئی دِن یہی سوچتا رہا کہ پیکٹ پر کیا لکھے۔ پھر لائبریری سے خط و کتابت کے فن پر پتہ نہیں کب کی چھپی ہوئی کتاب اُٹھا لایا اور اس کا سرسری طور پر مطالعہ کر کے کچھ اِس قسم کی عبارت لکھی۔

بے مایہ، ناچیز، مقصود عفی عنہ، کا تحفۂ حقیر، بصد عقیدت و احترام، بخدمت عظمتِ من!

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف!

لڑکی کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ ایسا رنگ برنگا پیکٹ دیکھ کر پہلے تو اسے فادر کرسمس کا خیال آیا اور بہت خوش ہوئی لیکن کرسمس میں ابھی کئی مہینے رہتے تھے۔ جب عبارت پڑھنے کی کوشش کی تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہی اندازہ لگا سکی کہ پیکٹ غلطی سے ادھر آ گیا ہے اور غالباً پڑوسی کے الحاج شیخ عظمت اللہ کنٹریکٹر و جنرل مرچنٹ کے لیے ہو گا۔ چنانچہ ان کی دکان پر بھیج دیا۔ عظمت اللہ اس وقت مصروف تھے۔ جلدی میں یہ سمجھے کہ کسی گاہک نے خریدی ہوئی چیزیں واپس کی ہیں، لہٰذا اپنے منیم کے حوالے کر دیا۔ مُنیم نے پیکٹ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مُنیم کیا کرتے ہیں۔

جب مقصود گھوڑے کو عرصے تک تحفے کی رسید نہ ملی تو وہ اور خاموش ہو گیا۔ سیکنڈ ائیر میں پہنچ کر ایک اور لڑکی سے دلچسپی ہوئی۔ اتّفاق سے لڑکی کو موتیا اور چنبیلی کے پھولوں سے شدید الرجی ہو جاتی تھی۔ لیکن الرجی کا علم نہیں تھا۔ اُدھر مقصود گھوڑا سر کے بال گھنے کرنے کے لیے روغن چنبیلی درجہ اوّل اور موتیا ہیر آئل درجہ خاص (درجہ اوّل اور درجہ خاص میں پتہ نہیں کیا فرق ہوتا ہے) کی دبا دب مالش کیا کرتا۔ چنانچہ کبھی سرِ راہے ان کی ملاقات ہوتی تو لڑکی کا چھینک چھینک کر بُرا حال ہو جاتا۔ بار بار "معاف کیجئے" الگ کہنا پڑتا اور بیشتر چھینکیں سیدھی مقصود گھوڑے کے اوپر آتیں۔ بعد میں وہ کئی دن کھانستی رہتی اور کبھی کبھی حرارت بھی ہو جاتی۔

شروع شروع میں محبّت اور الرجی دونوں برابر رہے۔ پھر الرجی نے محبّت پر غلبہ پا لیا اور آہستہ آہستہ ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔

بی ایسی سی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نئی لڑکی پر فریفتہ ہوا جو اسے کچھ زیادہ ہی حسین و جمیل معلوم ہوئی (اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لڑکی کے چچا انگلینڈ میں مقیم تھے اور بھتیجی کے لیے میک اپ کا اعلیٰ ترین سامان بھیجا کرتے۔ لڑکی بھی مغربی ممالک کا چکر لگا چکی تھی۔ تبھی اس کا رویہ مقصود گھوڑے یا کسی اور لڑکے

کے لیے۔۔۔۔ گاؤ آمد و خر فت۔۔۔۔ قسم کا تھا)۔

لمبی چھٹیاں تھیں اور مقصود گھوڑے کو فرصت ہی فرصت تھی۔ لہٰذا اس مستعدی اور تندہی سے تعاقب کیا کہ لڑکی کو مجبوراً ہینڈز اَپ کرنے پڑے اور اس کے کُنبے والوں نے مقصود گھوڑے کو چاء کا دعوت نامہ بھیجا۔ ڈاکیہ وہ لفافہ اس کے کمرے میں پھینک گیا۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ کسی پیر صاحب کو تسخیرِ حُب کے سلسلے میں اکاون روپے، ایک تھان اور مٹھائی کی ٹوکری پیش کر کے ان کا تیر بہدف چِلّہ کر رہا تھا۔ جب یہ طویل عمل ختم ہوا تب خطوط پڑھنے کی مہلت مل سکی۔ دعوت نامہ دیکھتے ہی اسی وقت لڑکی کے مکان کی طرف ایسا سرپٹ بھاگا کہ بڑی سڑک چھوڑ کر شارٹ کٹ کی تلاش میں ایک ایسی گلی میں ہو لیا جس میں مخالف سمت سے ایک جلوس آرہا تھا۔ یہ احتجاجی جلوس اینٹوں، پتھروں اور ریت کی قیمتوں کے کم ہو جانے یا شاید زیادہ ہو جانے پر نکلا تھا۔ حسبِ معمول اس میں زیادہ لوگ ایسے تھے جنہیں احتجاج کی وجہ کا علم تھا اور نہ جلوس کے متعلق کچھ پتہ تھا کہ یہ سب کون ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اگر وہاں پہنچ گئے تو کیا کریں گے۔ چونکہ سہ پہر کے بعد بیشتر لوگوں کو کوئی خاص کام نہیں ہوتا اور کھیلوں اور ورزش سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، لہٰذا اسی کو تفریح سمجھ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

مقصود گھوڑے کو زبردستی کے دھکوں اور دھینگا مشتی کی وجہ سے نہ صرف جلوس میں شامل ہونا پڑا بلکہ مجبوراً طرح طرح کے غیر فہم اور اوٹ پٹانگ نعرے بھی لگانے پڑے۔ اور جیب کتروں کے ڈر سے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں رکھنے پڑے۔

جلوس کسی زخمی سانپ کی طرح دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر سمت میں رواں دواں رہا۔ لیکن جب نہ تو اتنا سالاٹھی چارج ہوا، نہ کوئی اخبار والا کسی کا بیان لیتے دیکھا گیا، ہماراتک کہ فوٹو بھی نہیں اُترے۔ تو مایوس ہو کر پہلے رفتار آہستہ کی پھر منتشر ہو گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور مقصود گھوڑے کی قمیض پھٹ چکی تھی۔ اس لیے اسے واپس جانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز تھانیدار صاحب کوئی خاص ہفتہ خوش لباسی، خوش فہمی، یا شاید خوش خوراکی سے متعلق تھا، منانے میں مصروف تھے۔ اِدھر اُدھر اخباروں کے رپورٹر اور فوٹو گرافر ریلوے اسٹیشن پر جمع تھے کیونکہ کسی مشہور ایکٹرس کی آمد آمد تھی، جس کی ٹرین اس لیے لیٹ تھی کہ ریلوے میں بھی کوئی اسی قسم کا ہفتہ منایا جارہا تھا۔

اگلے دن جو وہ ملاقات کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ ہجوم کے جوش و خروش سے محبوبہ کے مکان کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ دروازوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے

ہیں اور ہونے والے خُسر کا موڈ بالکل آف ہے، بلکہ انہیں کچھ شبہہ سا بھی ہے کہ مقصود گھوڑا اس پتھراؤ میں شامل تھا۔ تبھی نقصان کا اندازہ لگانے آیا ہے (اپنے سادے سے لباس میں مقصود گھوڑا کچھ کچھ پرولتاری سا لگتا تھا۔ ویسے وہ بالکل مرنجان ومرنج ہے۔ اگرچہ اسے مرنجان ومرنج کے ہجے نہ آتے ہیں نہ معنے)

ایف ایس سی پاس کر کے وہ پھر عاشق ہوا۔ محبوب نے مشرقی روایات کے مطابق ہدایت کی کہ مجھ سے اظہارِ محبّت کرنے کی بجائے روئے سخن قبلہ والد صاحب کی جانب ہو تو زیادہ بہتر ہو گا۔

لڑکی مقامی ہوسٹل میں رہتی تھی لیکن اس کے والدین پانچ چھ سو میل دور تھے۔ وہ اس سلسلے میں کوئی پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کہیں کسی ریاست کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔

مقصود گھوڑے کو بین الاقوامی حالات کا زیادہ علم نہیں ہے اور نہ مقامی سیاست کا۔ مثلاً جب وہ تختہ اُلٹنے کے بارے میں سُنتا ہے تو اس کے تخیّل میں کچھ ایسا نظارہ آتا ہے جیسے کوئی حکمران گرمیوں میں تہمد باندھے ہوئے بالٹی سے پانی نکال نکال کر مزے سے نہا رہا ہو کہ دفعتاً کوئی حریف اس کے پاؤں تلے سے لکڑی کا تختہ کھینچ لے۔ اور نہانے والا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔

جیسے کہ دیکھنے میں آیا ہے، تختہ کہیں اُلٹتا ہے اور ہڑتالیں کہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس خبر سے بلا کسی وجہ کے ایک ہڑتال شروع ہوئی۔ پھر دوسری پھر تیسری۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا حتّٰی کہ جب ہڑتالوں کے ختم ہونے کا آفیشل اعلان ہوا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

مقصود گھوڑے کو اخباروں کی ہڑتال پر خاص مسرت ہوتی جب کبھی وہ یہ سطر پڑھتا، 'آج کی تعطیل کی وجہ سے کل اخبار نہیں چھپے گا'۔۔۔ تو اس کا جی چاہتا کہ فوراً ایڈیٹر کو ٹیلیفون پر شاباش دے۔ اور جب کسی احتجاج کے سلسلے میں اخبارات بند ہو جاتے تو اس کی یہ خواہش ہوتی کہ باری باری سب کو مبارکباد دے۔ ویسے بھی دوپہر سے پہلے کسی اخبار کو پڑھنا تو ایک طرف رہا وہ اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اسے یقین ہے کہ کوئی نہایت اہم خبر ہوئی تو کہیں نہ کہیں سے اس تک زبانی بھی پہنچ جائے گی۔ لہٰذا علی الصبح جب چمکیلا امید افزا دِن طلوع ہوتا ہے تو اخبار خریدنے اور اسے پڑھ خواہ مخواہ اپنا ناشتہ اور مُوڈ خراب کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دوپہر یا سہ پہر کے بعد وہ اخبار کھولتا۔ پہلے کرکٹ کا سکور، ہاکی فٹ بال وغیرہ کی ہار جیت پڑھتا۔ اس کے بعد سینما کے اشتہار دیکھتا اور پھر جلدی سے پہلے اور آخری سُرخیاں سونگھ کر اخبار بند کر دیتا۔ دوپہر سے پہلے اگر کوئی زبردستی اسے اخبار پڑھنے کو کہتا تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا۔۔۔ "سب سے منحوس خبر کون

سی ہے؟" اور دوسرا یہ کہ "چیدہ چیدہ بھیانک خبریں تم ہی کیوں نہیں سُنا دیتے؟"

لیکن اس کی یہ خوشی عارضی تھی۔ کیونکہ جب ریلوے، ٹیلیفون، ٹیلی گراف، بسوں وغیرہ کی ہڑتالیں شروع ہوئیں تو نہ وہ خود پہنچ سکا اور نہ پیغام بھجوا سکا۔ اس کی طویل خاموشی پر وہ بدگمان ہو گئے۔ اور جب گرمی بڑھی تو اپنی کار میں پہاڑ پر چلے گئے۔۔۔۔ مقصود گھوڑے کو بتائے بغیر۔

ہڑتالوں کے اثرات مکمل طور پر زائل ہونے تک وہ ایم ایس سی میں داخل ہو چکا تھا اور سینیئر ہو کر بی ایس سی کے زمانے کی لڑکی کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

لیکن اس مرتبہ اس پر۔

اِک بے وفا سے چاہ کیے جا رہا ہوں میں

اور یوں ہی خواہ مخواہ کیے جا رہا ہوں میں

کی قسم کا شعر مسلّط ہو گیا کیونکہ لڑکی نے روزِ اوّل سے کسی قسم کے بھی مذاکرات سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ اچانک انفلوئنزا پھیل گیا۔ لڑکی بیمار ہوئی پھر اس کے کُنبے والے، یہاں تک کہ پڑوسی تک صاحبِ فراش (صاحبِ فراش کے معنے جو کچھ بھی ہوتے ہیں) ہو گئے۔ مقصود گھوڑا اس مرتبہ نہایت سنجیدہ تھا اور لڑکی کے

بزرگوں پر ڈورے ڈالنے پر تُلا ہوا تھا۔ پھر کسی نے ڈرا دیا۔ انفلوئنزا کھانسنے، چھینکنے، یہاں تک کہ باتیں کرنے سے بھی فوراً لگ جاتا ہے۔

چند ہفتوں کے بعد جب وہ فائنل امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو لڑکی کے دل میں (غالباً انفلوئنزا کے مُضر اثرات کی وجہ سے) ترس پیدا ہوا اور وہ خود ملتفت ہوئی۔ مگر تب تک مقصود گھوڑا بِدک چکا تھا۔ تاہم اس کے رومانی کیریر میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کا سکور ONE ALL یعنی ا-ا رہا۔ ایم ایس سی پاس کر کے اسے نوکری تلاش کرنی پڑی جو اس نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔۔۔ اس طرح جیسے ڈر رہا ہو کہ کہیں سچ مچ ملازمت نہ کرنی پڑ جائے۔ ساتھ ساتھ وہ ایک نئی لڑکی کے متعلق بھی سوچ رہا تھا جیسے کہ بار بار ہوتا ہے، پہلے تو خشک سالی کے ڈر سے بارش کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ برسات کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ پھر دھما دھم وہ مینہ برستا ہے کہ چاروں جانب جَل تھَل ہو جاتا ہے۔ دریاؤں میں ایسا سیلاب آتا ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ اور دافعِ سیلاب دعائیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں ہر ایک کی توجّہ طغیانی کی طرف تھی، اسی لیے اس کے رومانی پروگرام کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا جس میں اسے بار بار یہ کہتے سنا گیا کہ جب کبھی

کسی ایسی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے جو اچھی بیوی بن سکے تو اتفاق سے وہ پہلے ہی بیوی ہوتی ہے۔

جب گھر والوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو مجبوراً ملازمت کرنی پڑی۔ جہاں پہلی پوسٹنگ ہوئی وہاں ایک غیر ملکی دوشیزہ پر (جو اس قدر تندرست و توانا تھی کہ مقصود گھوڑے کے ساتھی اُسے چہار شیرہ کہا کرتے) فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی کا رویّہ بالکل مغربی تھا۔ یعنی نہ تو اُسے مقصود گھوڑے کا کوئی خاص اشتیاق تھا اور نہ اس سے ملنے میں کوئی اعتراض۔ لیکن وہ اس پر لٹّو ہو چکا تھا۔ فوراً شادی کی اجازت کے لیے اپنے گھر ارجنٹ خط لکھا۔ پیشتر اس کے کہ وہاں سے جھاڑ موصول ہوتی ایک واقعہ پیش آیا جو اس کے لیے عجیب تھا۔

جب وہ غیر ملکی لڑکی کو موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر دس پندرہ میل دور ایک مشہور غیر ملکی فلم دکھانے لے جا رہا تھا تو روانہ ہونے سے پہلے اس نے لڑکی کے خوشنما لباس، سُہانی خوشبو اور مسکراہٹ کی تعریف کی۔ دیر سے چلے تھے اس لیے موٹر سائیکل تیز دوڑانی پڑی۔

راستہ طے کر کے سینما پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ پچھلی سیٹ خالی تھی۔

پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ لڑکی بغیر اجازت کے کیوں اتر گئی۔ پھر اس حرکت کو بے مروّتی سے منسوب کیا۔ راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا۔ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ لیکن پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کس جگہ یوں چُپ چاپ اُتر گئی؟ اس کے لیے یہ راز ہی رہا۔

وہ مزید چیکنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دوسرے یا تیسرے روز اس کا فوری تبادلہ ہو گیا۔ اب تک جو کچھ ہوا وہ میدانی علاقوں میں پیش آیا تھا۔۔۔۔

پھر دفعتاً سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر اس نے نحیفہ کو دیکھا۔ چونکہ مسرور مقصود گھوڑے اور اداس مقصود گھوڑے کی صورت میں انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہوتا اس لیے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ نحیفہ کو دیکھ کر خوش ہوا یا نہیں۔ البتہ یہ آمنا سامنا جس ماحول میں ہوا وہ کچھ ایسا تھا کہ اگر مقصود گھوڑے کی مونچھیں ہوتیں تو وہ ضرور انہیں تاؤ دیتا۔

نحیفہ کا اصل نام حنیفہ یا کچھ اسی قسم کا تھا لیکن دھان پان ہونے کی وجہ سے سب نحیفہ کہتے۔ اس کا چہرہ چھوٹا سا تھا لیکن خدوخال کافی بڑے بڑے تھے۔

اُجاڑ کیمپ کی تنہائی اور کیمپ والوں کی شولری کے باوجود اسے چوبیس پچیس سے

زیادہ نمبر نہیں مل سکتے تھے۔ یعنی تھرڈ ڈویژن میں پاس کرنے والے۔ تینتیس فیصد سے بھی کم۔ سُنا تھا کہ وہ کسی کو بھلانے کے سلسلے میں اپنے عزیزوں کے ساتھ پہاڑ پر آئی تھی۔ اور اس بے وفا (یا شاید باوفا) کو بھلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اوروں کو بھی بھلانے میں منہمک تھی۔

یہ بھی سُنا تھا کہ ایم اے لٹریچر میں اس کا کمپارٹمنٹ آیا ہے اور وہ اپنے سے کہیں زیادہ وزنی کتابیں ساتھ لائی ہے۔ اس نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ لٹریچر کی خدمت اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ لیکن شیطان کا خیال تھا کہ وہ لٹریچر کی سب سے زیادہ خدمت اس طرح کر سکتی ہے کہ لٹریچر کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

ویسے جتنے لڑکے وہاں تھے، ان میں نحیفہ نے فقط مقصود گھوڑے کا نوٹس لیا۔ شاید اس کے چہرے کے اظہار کی وجہ سے۔ کیونکہ کافی دِنوں سے وہ ایسی پُرسکون شائستہ اور جامد زندگی گزار رہا تھا جیسے کہ چڑیا گھر میں تنہا او دبلاؤ یا اکیلا زیبرا۔

مقصود گھوڑے نے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً درخواست بھیجی جس میں لکھا کہ ایک ہی مقام پر تین برس کی میعاد پوری کر چکا ہوں جس کے بعد عموماً تبادلہ ہو جاتا ہے۔ ذاتی حالات کی بنا پر التماس ہے کہ خاکسار کو میدانوں سے اس پہاڑی کیمپ میں

بھیج دیا جائے۔ یہاں جو شخص تعینات ہے وہ بھی تین سال پورے کر چکا ہے اور میدانوں کا خواہش مند ہے۔ نیز یہ کہ فدوی یہاں خوش رہے گا اس لیے خوب دل لگا کر کام کرے گا۔

اوپر سے وہی ٹکسالی جواب آیا کہ درخواست پر پوری ہمدردی سے غور کیا گیا لیکن افسوس ہے دوسروں کی ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آپ کو فی الحال موجودہ جگہ سے نہیں ہلایا جاسکتا۔ بہر حال آپ کی خواہش کو نوٹ کر لیا گیا ہے۔

سینما کا مینجر جو دفتروں میں کئی برس ملازمت کر چکا تھا، اس کے مشورے پر نئی درخواست ٹائپ کی گئی۔ جس میں یوں ظاہر کیا جیسے پہلی عرضی کا ابھی تک جواب نہیں ملا۔ اس دفعہ یہ لکھا کہ اُمّیدوار جواب کا منتظر ہے۔ لیکن جن حالات کے تحت تبادلے کی التجا کی گئی تھی اتفاق سے وہ بالکل بدل چکے ہیں۔ دوست یہاں سے چلے گئے، عزیزوں سے غلط فہمیاں ہوئیں، لہٰذا اب کیمپ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بلکہ جہاں متعیّن ہوں خوش نصیبی سے وہاں کچھ زمین مل گئی ہے جس پر مکان بنانے کا ارادہ ہے۔ لہٰذا پہلی درخواست کو منسوخ سمجھا جائے اور ازراہِ کرم مجھے ابھی نہ ہلایا جائے۔

اس پر فوراً تبادلہ ہو گیا۔

تیس اکتیس سیر پہلے کا ذکر ہے کہ ملغوبہ واقعی خوبصورت تھی۔ اتنی کہ کسی کمرے میں ہوتی تو برآمدے بلکہ صحن تک تمازت پہنچتی۔ لیکن اب بس روایتی مخمل نشینوں والی دلآویزی رہ گئی تھی۔۔۔۔ یعنی فقط پردے سے جھانکتا ہوا چہرہ حسین لگتا۔ یا اگر پانچ فٹ اونچی دیوار یا جھاڑی کے پیچھے کھڑی ہو، جھروکے سے باہر دیکھ رہی ہو، یا اونچی سی میز کی آڑ میں بیٹھی ہو تب۔۔۔ ورنہ سالم ملغوبہ کو دیکھ لینے سے چہرے کے حُسن پر وہی اثر پڑتا جو بقول کیمسٹ تیزاب اور الکلی کا ایک دوسرے پر ہوا کرتا ہے۔

اب اس کا وزن (میک اپ سمیت) تقریباً سوا دو من پختہ تھا۔

تہمیدہ کہا کرتی کہ سترہ سالہ ملغوبہ پچیس چھبیس برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا جیسے اس کی دو عُمریں ہوں۔۔۔۔ ایک تو ہر وقت بنے سنورے ترو تازہ چہرے کی بظاہر کم سنی اور دوسری وزن اور جسامت کی پختہ سالی۔

شاید اس میں ملغوبہ کا بھی قصور نہیں تھا۔ مشرق میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ حُسن و جمال رُخِ روشن تک ہی محدود ہے (جسم اور جثہ خواہ کیسا بھی ہو)۔ حالانکہ صبح شام

گھنٹوں میک اَپ کرنے کے ساتھ ساتھ روزانہ تیس چالیس منٹ ورزش بھی کر لی جائے تو مجموعی جاذبیت اور بہتر ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔

جب وہ آئینے کے سامنے آرائش میں مصروف ہوتی تو طرح طرح کے خیالات آتے۔ کبھی یہ سمجھتی کہ وہ نہایت عظیم آرٹسٹ ہے جسے اب تک کسی نے نہیں پہچانا۔ کبھی یقین سا ہوتا کہ کسی راجدھانی کی اکلوتی وارث ہے جسے جیتنے کے لیے کئی بانکے البیلے سورما آپس میں لڑ رہے ہیں۔ بعض اوقات اپنے آپ کو اس قدر ہلکی پھلکی محسوس کرتی کہ فضاؤں میں پرواز کرنے لگتی، حتّٰی کہ چاند تاروں کو چھُو کر وہیں نُور کا ہیولہ بن جاتی تو کسی روز یُوں لگتا جیسے شفقت اور دردمندی کا پیکر بن گئی ہو کہ غمزدہ ہستیوں کی دلجوئی کر سکے۔ انہیں نِت نئی امیدوں کا تحفہ بخشے۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

دِن دیہاڑے دیکھے ہوئے اس قسم کے خواب جب اوروں تک پہنچتے تو وہ انہیں مسلسل بیکاری سے منسوب کرتے یا خوش خوراکی سے۔

یوں بھی ملغوبہ کی ذہانت پر کسی کو خوش فہمی نہیں تھی۔ شیطان کہا کرتے کہ اگر اس کا آئی کیو ٹیسٹ کیا جائے تو وہ نقطۂ انجماد سے بھی نیچے ہو گا۔ بلکہ ایک ہی سانس میں دونوں نام لینا سراسر زیادتی ہے۔۔۔ آئی کیو کے ساتھ۔

کیمسٹ کے خیال میں ملغوبہ کو حسین بننے کے لیے اب تقریباً سوا ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہو گا۔

انجنیئر بتاتا کہ ملغوبہ کو آسانی سے، یا مشکل سے بھی، کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ وہ پہلے ہی دل و جان سے فریفتہ ہو چکی ہے۔۔۔ اپنے آپ پر۔ ہر حسین تصوّر، ہر خوشنما شے، ہر دلکش نظارہ اسے فقط ایک چیز کی یاد دلاتا ہے۔۔۔۔ خود اپنی! اور ایسی اُلفت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی رقیب سے واسطہ نہیں پڑتا۔ ویسے بھی خود پسندوں کو محبّت وغیرہ کے لیے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ واقعی ملغوبہ کو عشق وشق کی جھنجھٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کبھی کبھار اس قسم کی معاملات میں زبردستی شامل ہونا پڑتا تو ذرا دیر کے لیے بطور آبزرور شریک ہو جاتی۔

لیکن اُسے پختہ یقین تھا کہ آج تک پندرہ سال سے پینسٹھ تک کے جس مرد نے بھی اس کی کی جھلک دیکھی ہے وہ فوراً عاشق ہو گیا ہو گا۔

سوشل بننے کے سلسلے میں ہر تیسرے چوتھے ہفتے اس کے ہاں نہایت پُر تکلّف تقریب ہوتی۔ ان عمدہ دعوتوں کی شہرت ساری وادی بلکہ گرد و نواح میں بھی

پھیل چکی تھی۔ اتنی کہ جب بھی وہ بیس اکیس مہمانوں کو بُلاتی تو اُن میں سے تیس پینتیس ہمیشہ پہنچ جاتے۔

یوں تو اس کے سارے عزیزوں کو مزیدار کھانوں کا شوق تھا لیکن وہ خود اِس فن میں سپیشلسٹ بلکہ CONSULTANT کا رُتبہ حاصل کر چکی تھی۔ اس کی تقریبوں پر طرح طرح کے لوگ آتے جن سے مِل کر کبھی خوشی ہوتی، کبھی حیرت، کہ ایسے دُور دراز خاموش سے علاقے میں انکم ٹیکس ایڈوائیزر بھی پائے جاتے ہیں، ادبی نقّاد، طبلہ نواز، امپورٹ ایکسپورٹ کے ماہر بھی۔ اور ریڈیو سنگر، آنریری مجسٹریٹ، پولٹری فارم والے بھی۔ اس رنگ برنگی برادری میں کوئی چیز مُشترک تھی تو وہ غذاؤں کا شوق۔ ملغوبہ جب یخنی یا زردے کی کھُرچن اور بالائی وغیرہ منگوانے کچن میں جاتی تو کیمسٹ بتاتا کہ دنیا میں بھوک کو ہر چیز پر فوقیت ہے۔ سارے جانداروں کی اہم ترین طلب فقط ایک ہے۔۔۔۔۔ کھانے کی لگن! عشق، محبّت اور دیگر باتیں بعد میں سوجھتی ہیں۔ تبھی پچھلی صدی کی یورپین مائیں، بیٹیوں کو کامیاب شادی شدہ زندگی کے لیے فقط ایک گُر بتایا کرتیں۔ رُخصتی پر دلہن کے کان میں کہا جاتا کہ "FEED THE BRUTE"۔

اندھیرے میں ملغوبہ کے ڈِنر جاتے ہوئے جہاں یکایک یارڈلے کی خوشبو اور تازہ

بھنگار کی مہک آتی، یا شامتہ العنبر اور مچھلی تلنے کے جھونکے، تو ہم فوراً چِت ہو جاتے کہ منزل بالکل قریب ہے۔ پھر یہ خوشبوئیں آپس میں مدغم ہو جاتیں اور یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ اس وقت ملغوبہ میک اَپ کر رہی ہے یا باورچی خانے میں نگرانی۔

اسی طرح جب وہ کچن سے آتی تو فضا میں گشتابوں، قتلموں کی مہک پھیل جاتی۔ اور جب کچھ کہنے کے لیے واپس لوٹتی تو فرانسیسی لیونڈر کی نکہت سے کمرہ معطّر ہو جاتا۔ بعد میں تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا کہ کوئی بھینی بھینی میں خوشبو دراصل کہاں سے آ رہی ہے۔ ملغوبہ سے یا ڈونگوں اور پلیٹوں سے؟

آہستہ آہستہ اس کے نستعلیق میک اَپ، خوش پوشاکی اور عمدہ کھانوں کا اثر روزمرہ کی گفتگو پر بھی پڑنے لگا۔

پہاڑ کی سخت چڑھائی کے بعد بھوکے کیمسٹ نے جب موڑ پر چودھویں کا چاند دیکھا تو اسے تلا ہوا انڈا یاد آیا۔ اور فلاسفر نے کسی دوست کے ناکام رومان کی داستان یُوں ختم کی۔۔۔۔ ''قصّہ مختصر، وہ حسینہ میرے ساتھی کی زندگی میں قنوج کے مخمور کُن عطرِ نرگس کی طرح آئی۔ اس کی کشش اعلیٰ درجے کے نرگسی کوفتوں سے کم نہ تھی۔ پھر حالات نے یک دَم پلٹا کھایا اور جیسے عطر اُڑ گیا۔ کوفتے بکھر

گئے۔"

ایک دِن شیطان نے مقصود گھوڑے کی صحت (یعنی صحت کی کمی) پر نکتہ چینی کی۔۔۔ "دن بدن دُبلے ہوتے جا رہے ہو۔ بھورے لباس میں کچھ HUNTER'S BEEF سے لگتے ہو اور پیلے کپڑوں میں پاپڑ کا گمان ہوتا ہے۔"

یہاں تک کہ ملغوبہ کی تعریف بھی اسی انداز میں کی جاتی۔۔۔

"یہ لباس تو خوب بچ رہا ہے۔" شیطان کہتے "خصوصاً قمیض کا ڈیزائن۔۔۔ ہرا اور سنہرا۔۔۔ جیسے آلو میتھی کا سالن۔ وہی مرغوب مہک آ رہی ہے۔"

یا یہ کہ۔۔۔ "ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ قرمزی، سُرخ، زرد لہریوں کی ساڑی اور سبز پیٹیوں والا بلاؤز، گویا گاجر کے مفرح حلوے پر پِستے کی ہلکی سی تہہ۔"

پھر کسی روز۔۔۔ "آج تو حد ہو گئی۔ آپی، کاسنی سُوٹ اور نارنجی دوپٹے نے لذیذ حریرے کی یاد دلا دی جس پر ابھی ابھی لہسن اور پیاز کا کڑا کے دار بھگار لگا ہو۔ کیا بات پیدا کی ہے۔۔۔؟"

دوسرے پہاڑ سے نیچے آنے والی لاری دیر سے تیار تھی۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجاتا۔ معلوم ہوا کہ کوئی سواری آنے والی ہے۔

جِس ہستی کا انتظار ہو رہا تھا اس کا قد لمبا اور کندھے مضبوط تھے۔ چہرے پر دلیری اور بے باکی تھی اور چال ڈھال میں مردانہ وجاہت۔ یہ اور بات تھی کہ اسے مس کہا جاتا تھا۔

لیکن اس کے ہونٹوں سے تین چار فقرے سُنتے ہی محسوس ہونے لگتا کہ اس نے کچھ زیادہ مِس نہیں کیا تھا۔ اس کا نام وہمیدہ، سہمیدہ یا رحمیدہ وغیرہ ہو گا لیکن حُلیہ کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ شلوار قمیض پہنے یا غرارہ، ساڑھی ہو یا کوئی اور لباس، دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے تہمد باندھ رکھا ہے۔ چنانچہ سب اسے تہمیدہ کہا کرتے۔

کبھی وہ عورت نما لڑکی نظر آتی تو کبھی لڑکی نما عورت۔ بہر حال لڑکی وہ کبھی نہیں لگی۔ ہر وقت کے بناؤ سنگھار کی وجہ سے یہ بتانا مشکل تھا کہ کتنے برس کی ہو گی۔ مگر جب اسے غصّہ آتا تب چہرہ اصلی عُمر کی چُغلی کر دیتا۔ لوگوں کو وہ اچھی نہیں لگتی

تھی۔ لیکن بُری بھی نہ لگتی۔ مقصود گھوڑا کہا کرتا کہ تہمیدہ کی واہی تباہی اور کرخت پن کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی جاذبیت ضرور ہے۔ اس کے کزن نے بتایا کہ وہ ایک طرح کا ریکارڈ بھی قائم کر چکی ہے۔ آج تک کسی لڑکے نے بھی اس میں دو تین ہفتے سے زیادہ دلچسپی پی نہیں لی۔ ہمیشہ چوتھے ہفتے ضرور لڑائی ہو جاتی ہے۔ نہ جانے قصور ان سب لڑکوں کا تھا یا پھر تہمیدہ کا۔۔۔ لیکن وہ پہلی وجہ کو ہی صحیح مانتی ہے۔ اناپ شناپ ہانکنے کا یہ عالم تھا کہ کچھ کہے بغیر وہ گھنٹوں بول سکتی تھی۔

جب کبھی اس سے ملنا پڑتا تو ذرا سی دیر کے بعد یوں لگتا جیسے ہر ایک خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ یعنی کیمسٹ کا روئے سخن کیمسٹ کی جانب معلوم ہوتا۔ تہمیدہ جس کی تعریف کر رہی ہے وہ تہمیدہ ہوتی اور شیطان شیطان سے مخاطب لگتے۔

مصوّری، موسیقی، ادب وغیرہ کا اسے قطعاً شوق نہیں تھا بلکہ کزن نے تو یہ بتایا کہ تہمیدہ کے لیے ادب وہ ہے جو پرانے زمانے میں بزرگوں کا کیا جاتا تھا۔ ویسے افواہوں کے معاملے میں وہ بالکل بے تعصّب تھی۔ افواہ اہم ہو یا نکمّی، واقف کے بارے میں ہو یا اجنبی کے، معقول ہو یا نامعقول۔۔۔ ہر افواہ اُسے پسند آتی لیکن تنقید کے لیے فقط ملغوبہ کو چُن رکھا تھا۔ کبھی یہ انکشاف کرتی کہ کسی زمانے میں

ملغوبہ اپنے منگیتر کو انکل کہا کرتی تھی۔ یہ کزن کاریکٹ بعد میں شروع ہوا۔ کبھی بتائی کہ ملغوبہ کی چھوٹی بہن کو گلہ رہتا ہے کہ آپا ثابت قدمی سے ایک عمر پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ پچھلے مہینے جب انہوں نے اپنی سترویں سالگرہ منائی تو در حقیقت وہ سترویں سالگرہ کی آٹھویں یانویں برسی تھی۔ تبھی بیچاری چھوٹی بہن اپنی عُمر نہیں بتا سکتی لیکن بالغ ہونے کے لیے کسی نہ کسی روز مجبوراً اسے ملغوبہ سے آگے نکلنا پڑے گا۔

تنگ آکر کسی نے پوچھ لیا۔۔۔ ”تو کیا ملغوبہ میں ایک بھی خوبی نہیں؟“

تہمیدہ نے جو گول مول سا جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔۔ ”بالکل نہیں؟“

”اور جب تک میں موجود ہوں کبھی ہو گی بھی نہیں۔“

افواہوں کے سلسلے میں اکثر اس کی کُھسر پُھسر سُنا کرتے۔۔۔

”بس جو کچھ معلوم تھا اس سے کئی گنا زیادہ تمہیں بتا چکی ہوں۔“

یا۔۔۔ ”فی الحال تو یہی چند سکینڈل ہیں۔ جب تم سے اور خوش ہوں گی تو اور بھی سناؤں گی۔“

چاۓ کے باغوں کی حسینہ کے متعلق مقصود گھوڑا کہیں تہمیدہ سے بھی پوچھ بیٹھا۔

”اسے جانتی تو نہیں؟“ وہ بولی ”لیکن اس کے بارے میں کافی کچھ بتا سکتی ہوں۔“

ملغوبہ سے جہاں خوامخواہ کی نوک جھونک رہتی، وہاں اس کی ہر بات کی نقل بھی کیا کرتی۔ آرائش، لباس، خوشبوئیں، یہاں تک کہ اس کی دعوتوں کی بھی رِیس کرتی۔ رقعے بھی ویسے ہی ہوتے اور خواتین و حضرات کو ”ساڑھے سات بجے۔۔۔ برائے آٹھ بجے“ کا وقت دیا جاتا۔ مگر وہاں نو بجے کے بعد آمد شروع ہوتی اور ایسے ایسے لوگ آتے جنہیں خواتین و حضرات کہنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچنا پڑتا۔ ہمارا گروپ اس کی تقریبوں سے دُور رہتا۔ پہلی وجہ تو وہ عامیانہ گنوارو باتیں تھیں جو وہاں سُننے میں آتیں۔ دوسرے یہ کہ وہ دعوت ہی تب کرتی جب بہت سی باسی چیزیں جمع ہو جائیں، یعنی فریجیڈیئر، نعمت خانہ، کچن وغیرہ کی صفائی کرتے وقت مہمان نوازی کا پروگرام بنتا۔ یہاں تک کہ دعوت والے روز جو کچھ پکتا اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا اور کئی ہفتوں کے بچے ہوئے سالن، چاول، شوربے وغیرہ خوب گرم کیے جاتے۔ اور وہ پرانا گاجر کا حلوہ یا فرنی جسے اب کوئی بھی نہیں چکھتا تھا۔ وہ پھول رکھے جاتے جو بہت پک چکے تھے۔

ایسی ہی ایک دعوت پر کسی نے تہمیدہ کی سرگوشی سُنی جو اس نے اپنے کزن کے

ہاتھ سے ڈونگہ چھینتے ہوئے کی۔ اس میں سے کچھ نہ لیں۔ یہ فقط مہمانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ اس کی دعوتوں میں یا تو وہ سخت جان اور دبنگ قسم کے لوگ پہنچتے جنہیں تازگی اور باسی پن میں تمیز نہیں تھی، یا وہ جو پھکڑ پنے کے شوقین ہوتے۔

شیطان اور مَیں لمبی سیر سے واپس آ رہے تھے کہ انہوں نے اوپر والی سڑک پر سب سے لمبے سفیدے کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "درخت ایک ہے، مگر تنے دو ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے مشورہ دیا کہ عینک کے شیشے صاف کر کے دوبارہ دیکھو۔ چنانچہ انہیں نظر آیا کہ پتلے سے تنے کے ساتھ دُبلی پتلی نحیفہ کھڑی ہے اور بار بار گھڑی دیکھ رہی ہے جیسے کسی کی منتظر ہو۔

پتہ نہیں اسے کس کا انتظار تھا۔ غالباً مقصود گھوڑے کا جس نے اسے چھ بجے کا وقت بتایا ہو اور پھر بھول چکا ہو کہ شام کے چھ بجے ملنا تھا یا شام کے چھ بجے۔ اور اس کے بعد تاریخ بھی یاد نہ رہی ہو۔

شیطان تیزی سے ڈھلان پر اُتر رہے تھے لیکن اب انہیں رُک کر گیئر بدلنا پڑا۔

اوپر جانے والی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگے۔

ہمیں دیکھ کر وہ رسماً مُسکرائی۔ شیطان نے مصنوعی سی بشاشت پیدا کی اور بولے۔ ''تمہاری مسکراہٹ کلاسیکی مُسکراہٹوں سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔ جن مُسکراہٹوں کو دیکھ کر قافلے راہ بھول جایا کرتے تھے۔ یعنی قافلے کا سب سے اگلا اُونٹ سیدھا راستہ چھوڑ کر خواہ مخواہ کسی اور طرف ہو لیتا۔''

نحیفہ نے پھر گھڑی دیکھی اور زیرِلب بولی۔ ''لاحول ولا۔'' ساتھ ہی بجلی چمکی اور زور کا دھماکا ہوا۔

''لاحول ولا ہرگز نہیں۔'' شیطان نے کہا۔ ''دراصل ہمارے پاس ذرائع ہی نہیں ہیں۔ ابھی ابھی بادلوں میں بجلی کے تقریباً نو یا دس کروڑ وولٹ ضائع ہوئے ہیں۔ اگر ہم انہیں محفوظ کر سکتے تو ان سے مدّتوں تک لمبی لمبی سڑکوں پر قمقمے جلتے۔ بہرحال مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آسمانی بجلی کو سٹور کرنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔''

''آپ کہاں تھے؟ مہینہ بھر سے آپ کو نہیں دیکھا۔'' اس نے محض گفتگو جاری رکھنے کے لیے کہا۔

"اسے اتفاق سمجھ لیجئے یا کچھ اور۔ میں نے بھی تمہیں ایک مہینے سے نہیں دیکھا۔"

"روفی صاحب، آپ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ کیا کسی کی تلاش میں ہیں جو آپ کو مل نہیں رہا؟" نحیفہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

شیطان نے پہلے گھڑی دیکھی، پھر جواب دیا۔ "مِل نہیں رہا کی جگہ مِل نہیں رہی زیادہ صحیح ہو گا۔"

"یعنی آپ کی آئیڈیل۔۔۔ آپ کے خوابوں کی شہزادی نہیں ملی؟"

"بالکل! نہ صرف خوابوں کی شہزادی غائب ہے بلکہ دن میں بھی جبکہ خواب نظر نہیں آنے چاہیں، کوئی غیر شہزادی یا اور لڑکی بھی اس علاقے میں نہیں ملی۔"

"تو گویا ان دِنوں آپ مُسرّت سے محروم ہیں۔"

"اگر مسرت کسی لڑکی کا نام ہے مثلاً مُسرّت آغا، مُسرّت شیخ، مُسرّت خان وغیرہ تو اس سے بھی محروم ہوں اور دوسری قسم کی مسرتوں سے بھی۔ دانشمندوں نے شاید سچ کہا ہے کہ دنیا بھر میں اگر کہیں مسرت کا وجود ہے تو وہ فقط ڈکشنری میں ہے جہاں اس کے معنے بھی درج ہیں۔"

”میرا یہ عقیدہ ہے کہ کسی کی تمنّا کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اس کے قابل بنانا چاہئے۔ اور مستحق ہونے کے بعد خواہش کرنی چاہیے۔“

”اور میرا تجربہ یہ ہے کہ قابل اور مستحق ہمیشہ رہو لیکن تمنّا کبھی مت کرو کیونکہ خواہش کرنے والا اکثر خوار ہوتا ہے۔“

اتنے میں مقصود گھوڑا کہیں سے آ گیا۔

اس نے شیطان اور نحیفہ کا اس طرح معائنہ کیا جیسے وکٹ گرنے پر نیا بیٹسمین میدان میں آکر قریب کے فیلڈرز کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر بولا۔ ”بڑے افسوس کی بات ہے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔“

کچھ دیر خاموشی رہی جسے مقصود گھوڑے نے سازگار سمجھ کر بتایا۔ ”اگر واقعی دیر ہوئی ہے تو اس لیے کہ راستے میں بلّیاں اور کتّے لڑ رہے تھے اور لڑتے ہی جا رہے تھے۔ انہوں نے راستہ ہی نہیں دیا۔ اس لیے مجھے رُکنا ہی پڑا۔“

”آپ اُردُو ہمیشہ غلط بولتے ہیں۔“ نحیفہ نے حقارت سے کہا۔ ”در حقیقت مایوسی تو مجھ کو ہونی چاہیے۔ میں نے اتنی دیر انتظار کیا۔ آپ کو اس موقعے پر حیرت ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ مُجھے مایوسی کی جگہ مجھ کو مایوسی کہنا چاہیے۔ سخت مایوسی

کی جگہ شدید مایوسی بہتر ہے۔ اور 'ہی' کا استعمال کم کیا کریں۔ لڑتے ہی جا رہے تھے، کی جگہ لڑتے جا رہے تھے، سے بھی مقصد بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور بلّیاں اور کتّے کی جگہ کتّے اور بلّیاں کہنا چاہیے کیونکہ کتّے کا رُتبہ اور سائز بلّی سے اُونچا ہے۔"

شیطان (جو کافی تھکے ہوئے تھے) انگڑائی لیتے ہوئے بولے۔ "جو کچھ ابھی کہا گیا، وہ درست ہو سکتا ہے یا صحیح ہو سکتا ہے۔ اب مثال کے طور پر مقصود کو لیں۔ اور اسے بے شک لے لیں۔ ہمیشہ کے لیے لے لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"تم کچھ پڑھا رہی تھی؟" مقصود گھوڑے نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "ذرا دیر پہلے نیچے دیکھتیں تو وادی میں نہایت دلکش سینری ہو رہی تھی۔"

"اُفّوہ! پھر وہی غلط اُردُو۔۔۔ سینری نظر آیا کرتی ہے، ہوا نہیں کرتی۔ اور مَیں کیا پڑھ رہی تھی؟ انگریزی کا یہ ناول جس میں سکاٹ لینڈ یارڈ کے حیرت انگیز کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔"

"تعجب ہے کہ ایسی معمولی چیز پر کسی نے پوری کتاب لکھ ماری ہے۔" مقصود گھوڑے نے عقلمند نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" نحیفہ نے پوچھا۔

"یہی کہ سکاٹ لینڈ یارڈ بھی دوسرے ملکوں کے یارڈ کی طرح چھتیس اَنچ ہی کا تو ہوتا ہے۔ ایک گز میں تین فٹ اور فی فٹ بارہ انچ۔ محض اتنے اِنچوں پر ناول لکھ دینا سراسر زیادتی ہے۔ اور یہ دوسری کتاب کون سی ہے؟"

"اس میں FREEMASONS کی پراسرار سرگرمیوں کا نہایت عبرت آموز تذکرہ ہے۔"

"لیکن یہ حضرات تو بہت اچھے میسن ہوتے ہیں جو خدمتِ خلق کے جذبے سے پبلک کے لیے مکان بالکل FREE تعمیر کرتے ہیں۔ ان کا وجود غنیمت ہے۔"

نحیفہ نے ناک بھوں بلکہ کان تک چڑھائے اور دونوں کتابیں اس کے ہاتھ میں پکڑا کر چلی گئی۔

دراصل شروع ہی سے مقصود گھوڑے کا جنرل نالج بلکہ معمولی نالج بھی نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ اور انگریزی تو اس سے بھی کمزور ہے۔ مثلاً وہ بتایا کرتا کہ ملازمت کرتے کرتے کافی وقت گزر جائے تو انسان لازمی طور پر TIRE ہو جائے گا۔ جب اس کے بعد اور تھکے گا تب RETIRE ہوتا ہے۔ اور یہ کہ علم و فن کے شائقین پہلے تلاش یعنی SEARCH کرتے ہیں۔ جب پوری طرح تسلّی نہیں

ہوتی یا علوم اچھی طرح قابو میں نہیں آتے تو پھر دوبارہ ہلّہ بول کر RESEARCH کرنی پڑتی ہے۔

جس سلسلۂ کوہ پر ہمارا کیمپ تھا وہ سارے کچّے پہاڑ تھے۔ ان میں مٹی زیادہ تھی اور چٹانیں کم۔ بارشیں ہوتیں تو چھوٹے چھوٹے پتھر اور مٹّی کے تودے نیچے لڑھکنے لگتے۔ اس پر مقصود گھوڑا جو ہمیشہ شہروں میں رہا تھا شکایت کرتا کی ان پہاڑی باشندوں کو اعلیٰ کوالٹی کے پہاڑ بھی بنانے نہیں آتے۔ پہاڑ تعمیر کرتے وقت باقاعدہ مشقت اور نگرانی سے پوزیشن کہیں بہتر ہو سکتی تھی۔ اگر محنت کی ہوتی تو اتنی سی مٹّی بھی ضائع نہ ہوتی۔

اسی طرح INFERIORITY COMPLEX کو وہ وٹامن بی کمپلیکس کی قسم کا کوئی ٹانک سمجھتا۔ جسے ڈاکٹر کا نسخہ دکھائے بغیر بازار سے خریدا جا سکتا تھا۔

نحیفہ بار بار ٹوکتی کہ اگر انگریزی مشکل لگتی ہے تو کم از کم اُردو ہی اچھی طرح سیکھ لو، لیکن اُردو میں بھی وہ کافی بخشا ہوا تھا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ کسی تقریب کے دعوت نامے پر ج۔ س۔ م۔ ن پڑھا تو جسمت کے معنی لُغّت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کسی نے بتایا کہ یہ ایک لفظ نہیں بلکہ چند حروف ہیں جو ایک فقرے کے مخفف ہیں، تو اس نے بڑے غور کے بعد مطلب 'جواب سے معاف

فرمائیں۔۔۔'اخذ کیا۔ چنانچہ ہر ایسے دعوت نامے پر وہ خاموش رہتا لیکن تقریب میں ضرور جا پہنچتا۔

مگر مقصود گھوڑے پر جب عشق کا دورہ پڑا ہوا ہو تو اس کا ٹمپریچر سائے میں ایک سو دو یا ایک سو تین فارن ہائیٹ سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا نحیفہ کے کہنے پر اس نے میدانی قصبے میں اُردُو کی مطلوبہ کتابوں کی تلاش شروع کر دی، جو دیر تک جاری رہی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اُسے فقط کورس کی کتابیں ہی مل سکیں۔ انہیں پڑھ کر اس کے علم میں کسی قسم کا اضافہ ہوا یا کمی ہوئی اس کے متعلق کہنا مشکل ہے کیونکہ اس کی حرکات کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، نہ اسے خود پتہ ہوتا ہے۔ البتہ اتنا فائدہ (یا نقصان) ضرور ہوا کہ جو الفاظ اُسے مشکل لگتے (اور ایسے الفاظ بے شمار تھے) اُن کے معنے پوچھنے کے بہانے بار بار نحیفہ سے ملنے جاتا۔ پہلے فقروں اور الفاظ کے نیچے نشان لگاتا، پھر ملاقات کے لیے مواد اکٹھا کرتے ہی فوراً پہنچتا۔

ایک دن شیطان نے مجھے بتایا کہ مقصود گھوڑا ابھی ابھی کتابوں کا وزنی بستہ اُٹھا کر نحیفہ کے ہاں گیا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ دونوں بر آمدے میں بیٹھے تھے، اس لیے درختوں کی آڑ لینی پڑی۔

وہ خوب چہک رہا تھا۔۔۔ ''یہاں لکھا ہے کہ۔۔ 'آخر ہاتھی اس ویرانے میں لقمۂ اجل بن گیا۔۔۔' ہاتھی کے سائز کا لقمہ یقیناً بہت ہی بڑا لقمہ ہے اور شاید عالمی ریکارڈ ہے۔ اگر مصنّف صاف صاف لکھ دیتا کہ ہاتھی بھوک سے مر گیا تو اتنا گہرا اثر پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پچاسویں صفحے پر درج ہے کہ۔۔۔ 'تپتے ہوئے صحرا میں اُونٹ اور سوار موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ظاہر ہے کہ پیاس سے ان کا انتقال ہوا ہو گا لیکن صحرا میں گھاٹ کیسے نصیب ہوتا ہے؟ خصوصاً اُونٹ کو تو کوشش کے باوجود بھی میسر نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں بتایا گیا ہے کہ دودھ میں پانی ملاتے ہوئے وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ سب کو پتہ ہے کہ دودھ اور پانی کو ملانے سے کسی قسم کا رنگ نہیں بن سکتا۔ رنگینی پیدا کی ہے تو اس فقرے نے۔ اور یہاں لکھا ہے کہ لکڑیوں کے سہارے ذخیرے کو وہ شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گیا۔ اس پر ہاضمے کی دوائی کا وہ اشتہار یاد آ گیا، لکڑ ہضم پتھر ہضم۔ اور یہ بھی سنئے۔۔۔ فزکس اور کیمسٹری نیوٹن کے در کی لونڈیاں تھیں۔۔۔۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لونڈیاں صرف مشرق ہی میں نہیں پائی جاتی تھیں بلکہ مغرب میں بھی ان کا رواج ہو چلا

تھا۔ ویسے کچھ لوگوں نے یہ افواہ بھی اُڑائی کہ وہ لوگ جو زیادہ سوچتے ہوں مثلاً سائنسدان وغیرہ، انہیں لونڈیوں یا دیگر خواتین میں دلچسپی نہیں رہتی۔ مگر نیوٹن نے یہ افواہ غلط ثابت کر دی۔ ‘‘

اس پر شیطان نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس انداز سے جیسے انہیں مقصود گھوڑے سے اس قسم کی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔

’’اور اس جگہ سانپ اور نیولے کی لڑائی بیان کی گئی ہے جس کا خاتمہ یوں ہوتا ہے۔۔۔۔ 'مقابلہ بڑا سخت تھا، لیکن آخر کامیابی نے نیولے کے قدم چُومے اور فتح کا سہرا اس کے سر رہا۔' یہاں یہ بھی لکھا جا سکتا تھا کہ نیولے نے سانپ کو مار دیا۔ مگر یہ فقرہ سادہ تھا لہٰذا دیگر سادہ فقروں کی طرح استعمال نہیں کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ نیولے کے قدم کس طرح چُومے گئے اور سہرا کہاں سے آیا تھا؟ اور کسی نے باندھا؟ اس کا ذکر غالباً اگلی قسط میں ہو گا۔ اور اس فقرے کا تو جواب ہی نہیں۔۔۔ 'اس کا کاروبار زیادہ دیر نہ چل سکا اور اسے کوئلے کے ٹھیکے سے ہاتھ دھونے پڑے'۔۔۔۔ اب تک تو یہی سُنا تھا کہ کوئلوں کی دلالی سے مُنہ پر کالک لگ سکتی ہے مگر ان سے ہاتھ دھو کر صاف کرنا واقعی معرکے کا کام ہے۔ ‘‘

نحیفہ نے خفا ہو کر ڈانٹا اور پُرانے کلاسیکی اسلوبِ بیان کے نستعلیق پن، مُسجّع نثر،

محاوروں کی دلفریبی، ادب کی شاندار روایتوں اور ان کے احترام وغیرہ وغیرہ پر طویل لیکچر دیا جو مقصود گھوڑے کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا، کیونکہ وہ اتنی دیر اُن مچھروں کو بھگانے کی ناکام کوشش کرتا رہا جو ان دونوں کے گرد بھنبھنا رہے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ مچھر تقریباً آٹھ دس فٹ دُور تھے۔

لیکن جب نحیفہ نے یہ کہا کہ سائنس اور ادب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور جہاں سائنسدان کا (نہ جانے مقصود گھوڑے کو سائنسدان کیوں سمجھتی تھی) مُنہ شمال کی جانب ہوتا ہے وہاں لٹریچر کے شیدائی کا جنوب کی طرف (وہ مشرق اور مغرب بھی کہہ سکتی تھی)۔ تو اسے مقصود گھوڑے نے چیلنج سمجھا اور فوراً قصبے میں کسی لائبریری یا کسی اور چیز کا ممبر بن کر اُردُو ادب پر باقاعدہ ہلّہ بول دیا۔ چنانچہ جب وہ میدانی علاقے سے واپس آیا اور اپنا تھیلا کھولتا، تو کبھی سنگتروں کیلوں کے ساتھ تاریخِ اُردُو (مطبوعہ ۱۸۹۵ء یا ۱۹۰۵ء) کی جلدیں ہوتیں۔ کبھی صابن، بوٹ پالش، فینائل کی گولیوں کے ہمراہ محاوروں اور کہاوتوں کے مجموعے، تو کبھی ڈرائی کلین شدہ کپڑوں میں تنقیدی جائزے۔ غالباً ابتدا اس نے محاوروں سے کی۔ اس کا شُبہ تب ہوا جس دن ملغوبہ نے شاید اپنے منگیتر کو چڑانے کے لیے اپنی بڑی بہن کے منگیتر کی جو تعریفیں شروع کیں تو سننے والوں کی جمائیوں، چھینکوں اور کھانسنے کے باوجود ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ آخر مقصود گھوڑے نے طالبعلم کی

طرح ایک ہاتھ اٹھا کر سوال کیا۔ ”یہ منگیتر صاحب اس وقت کہاں ہیں تا کہ ہم بھی ان کا دیدار کر سکیں۔“

ملغوبہ نے بتایا کہ وہ جزائر انڈیمان میں ہے جہاں اس کا کُنبہ سالہا سال سے آباد ہے۔

”اور اس منگیتر کو آخری مرتبہ تم نے کب دیکھا تھا؟“ اس نے شرلاک ہومز کے انداز میں پوچھا۔

ملغوبہ خاموش ہو گئی۔

اس پر مقصود گھوڑے نے کہا۔ ”یہ تو وہی معاملہ ہوا کہ دیکھا نہ بھالا، صدقے گئی خالہ۔۔۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ ملغوبہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ اور اس کی سب بہنیں، ان کے منگیتر ہی منگیتر ہیں۔ اور یہ کہ ابھی تک شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی۔

شام کو فلم دیکھنے گئے۔ سینما ہال کے تنگ سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے شیطان نے لیڈیز فرسٹ کے سلسلے میں لڑکوں کو روک لیا۔ لڑکیاں آگے بڑھیں۔ انہوں نے اندر جاتے ہوئے ایک دوسری کو قطعاً نہیں دھکیلا تھا لیکن نہ جانے

کیوں مقصود گھوڑے کو وہم سا ہوا کہ ہر ایک پہلے اندر جانے کی کوشش میں ہے۔ فوراً بولا۔ ''آٹھ جلا ہے دس حُقّے، اس پر بھی دھکم دھکے۔''

پھر اُسے حیرت بھی ہوئی کہ ساری شام لڑکیاں مُنہ پھیرے کیوں بیٹھی رہیں۔ اتوار کی پکنک پر مشکوک کی الل ٹپ باتوں کی طوالت سے تنگ آ کر تہمیدہ نے گھڑی دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی کیونکہ وہ گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔

مشکوک بولے گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد تہمیدہ نے پھر خالی کلائی کی طرف دیکھا۔ اُسے فکر تھی کہ دوسرے پہاڑ پر جانے والی لاری نہ نکل جائے۔ پھر اور دیر ہوئی تو وہ بسوں کے اڈّے کی طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ کر چل دی۔ مقصود گھوڑے نے نعرہ لگایا۔

''ایک دِل یاروں میں، ایک چوکیداروں میں۔''

یہ سُن کر مشکوک جیسے آدمی نے بھی مُنہ بنایا اور تقریر ختم کر دی، لیکن مقصود گھوڑا محاورے کو برجستہ سمجھ کر خوش ہوا۔ پھر ملغوبہ کے ڈنر کے بعد پہلی مرتبہ اسے پیلے رنگ کا الائچی والا قہوہ پیش کیا گیا جس کا اس نے معائنہ کیا، سونگھا، چکھّا،

اور نا تسلّی بخش پا کر واپس کر دیا۔

ملغوبہ وضاحت کر رہی تھی کہ روغنی نان، حریسہ، نرگسی پلاؤ، گشتابوں جیسے قوّت بخش کشمیری کھانوں کے بعد یہ ہاضم قہوہ پینا پُرانی رسم ہے۔

"خصم چھُوٹے پر رسم نہ چھُوٹے" مقصود گھوڑے کے ہونٹوں سے آواز آئی۔ اس کے بعد وہ اکثر حیران ہوتا کہ ملغوبہ کی مشہور دعوتوں پر اُسے کیوں نہیں بُلایا جاتا۔ اُدھر ملغوبہ کے سدا کے سُست الوجود اور ڈھیلے ڈھالے منگیتر (کُرسی ہو، صوفہ، بنچ، یا گھاس کا قطعہ۔۔۔ وہ ہمیشہ نیم دراز ملتا) سے ہماری بات چیت مقصود گھوڑے کے اُس محاورے۔۔۔ "کھڑا بنیا پڑے برابر، پڑا بنیا مَرے برابر"۔۔۔ کے بعد تقریباً ختم ہو گئی۔

آخر ایک دن نحیفہ کے صبر کا پیمانہ (بلکہ بڑا سا گھڑا) لبریز ہو گیا۔ آپس میں یونہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف حسن و جمال کا موضوع تھا اور دوسری طرف رفاقت اور دوستی کا۔ نحیفہ موضوع نمبر دو کی حمایت میں بول رہی تھی۔۔۔۔ جب دوستی کا لفظ بار بار آیا تو مقصود گھوڑے نے اعلان کیا "بندر کی دوستی، جی کا جنجال۔" اس پر نحیفہ نے کھلم کھلا طنز کی۔ "آپ اُردُو نثر کا ایسا عجیب و غریب مطالعہ کر کے اس پر اتنے حاوی ہو چکے ہیں یا یہ اس قدر پسپا ہو چکا ہے کہ اب اُردُو

شاعری آپ کی توجّہ کی منتظر ہے۔"

حسبِ معمول یہ فقرہ بھی اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے بعد ایک وقفہ آیا جس میں اُردُو شعرا کے دیوان آگے آگے تھے اور مقصود گھوڑا پیچھے پیچھے۔

اس بے رونق سے کیمپ میں ہم اگر بہت خوش نہ تھے تو اداس بھی نہیں تھے۔ گزرتے ہوئے دِنوں کے ساتھ ماحول اور گرد وپیش سے واقفیت بڑھتی گئی۔ وہاں کی خوشبوؤں کو بھی پہچانے لگے۔ چیڑ کے درختوں کی مہک آتی تو اندازہ ہو جاتا کہ اُونچے جنگل پر بارش ہو رہی ہے۔ سائیں سائیں کرتے جھونکے گھاس جھاڑیوں، چشموں کی ملی جُلی طراوت لاتے تو یہ وادی کی سمت سے آندھی آنے کی اطلاع ہوتی۔ خشک موسم میں گیلی مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو فوراً بتادیتی کہ قریب ہی کہیں بوندیں پڑ رہی ہیں۔ صبح صبح ہوا بند ہوتی تو فضا میں گرد و غبار اور دھوئیں کی آمیزش سے پتہ چل جاتا کہ نچلے قصبے میں گہما گہمی شروع ہو چکی ہے۔ نمناک گرمی میں ادھر حبس شروع ہوا اور طوفان آیا۔ آندھی سے بجلی فیل ہو جاتی۔ لالٹینیں جلتیں۔ ان کی روشنی میں سکول کا زمانہ یاد آجاتا۔

پھر جھینگر بولتے۔ ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ بوندیں گرتیں اور رِم جھِم رِم جھم بارش شروع ہو جاتی۔ جب رُکتی تو قوسِ قزح نکلتی جس کے برابر ایک اور ہلکی سی دھنک ہوتی۔۔۔۔ بالکل اس کی نقل۔ اس دن کا اختتام بھی دلآویز ہوتا۔۔۔ غروبِ آفتاب کی چکا چوند، جیسے آتش بازی کا عکس پڑ رہا ہو۔ جہاں قدرت کے ساتوں رنگ جھلمل جھلمل کرتے وہاں ان کی باہمی آمیزش سے نت نئی رنگ رلیاں دیکھنے میں آتیں۔

مطلع صاف ہونے پر علی الصبح برفانی چوٹیوں سے چمکتی دمکتی کرنیں پڑیں۔ درخشاں دھوپ سے پہاڑوں درختوں کے لمبے لمبے سائے بنتے جو دن چڑھنے پر گھٹتے جاتے۔ چاروں طرف نُور برسنے لگتا اور وادی کے دلکش نقوش اور واضح ہو جاتے، جیسے رنگ برنگ شوخ قالین بچھا ہوا ہو۔

خزاں آتی تو اُوپر کے جنگل سے لے کر تلہٹی تک جگہ جگہ آگ سی لگ جاتی۔ درختوں کے پتّے زرد سُرخ ہو کر وہ تاثر پیدا کرتے کہ موسم بہار بھول جاتا۔

سہ پہر کو دھوپ ہلکی ہو کر زمین و آسمان کو سنہری بنا دیتی۔ ہر طرف تھکا تھکا سا

خمار پھیل جاتا۔

چاندنی پھیلتی تو بادلوں کے ٹکڑے سارا آسمان چھوڑ کر چاند کی طرف سیدھے دوڑتے آتے اور کرنیں مدھم کر کے طرح طرح کی شبیہیں بناتے۔ جب آگے نکل جاتے تو روشنی پہلے سے بھی تیز ہو جاتی۔ اور وہ اندھیری راتیں بھی پُر فسوں ہوتیں جب برسے ہوئے نُچڑے بادلوں سے تارے تک چھُپ جاتے۔ سب کچھ یوں ساکن ہو جاتا کہ پتّہ تک نہ ہلتا۔ تب نہ جانے کہاں سے وہ دھیمی دھیمی جلاء آجاتی جو سارے نظارے پر چاندی کا ملمع چڑھا دیتی۔

ہوا کے جھونکے عجیب عجیب آوازیں پیدا کرتے۔۔۔۔۔

کبھی رات بھر درختوں جھاڑیوں پودوں میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہوتیں۔ جو کبھی سُنائی دیتیں، کبھی نہیں۔ پھر جھونکے منّت سماجت سی کرتے جیسے کچھ منوانا چاہتے ہوں۔ ہَوا تیز ہوتے ہی ٹہنیوں سے ایسی افسردہ سیٹیاں بجتیں کہ کسی کے چِلاّنے کا گمان ہوتا۔ جھکڑ چلنے لگتے اور صدائیں بھیانک ہوتی جاتیں، جیسے گھُپ اندھیرے میں درندے رو رہے ہوں۔ تُندی میں اور اضافہ ہوتا۔ آندھی کی وہ چیخم دھاڑ مچتی کہ سونا محال ہو جاتا۔ طوفان ختم ہو چُکتا تو صبح کو وہی جھونکے یوں ہنستے کھیلتے چہلیں کرتے جیسے رات کو کچھ بھی نہیں ہوا۔

شام کو بادل نہ ہوتے تو سورج ڈوبتے ہی وادی کی بستیوں میں روشنیاں چمکنے لگتیں۔ جیسے دفعتاً کہیں سے لاتعداد جگنو آ گئے ہوں۔ گیلے جھونکے فضا میں ارتعاش پیدا کرتے تو یہ جگنو بھی متحرک ہو جاتے۔ بدلتے ہوئے موسموں کا پرندوں پر بھی اثر پڑتا۔ کسی مہینے چمکیلے پروں، رنگین چونچوں کلغیوں والے خوشنما طیّور کے پَرے کے پَرے آ کر وہاں کے پرندوں میں شامل ہو جاتے۔ اور کچھ عرصہ رونق بڑھا کر چپکے سے اُڑ جاتے۔ ان کے بعد کچھ اور طرح کے جھُرمٹ آتے۔ ملگجی چڑیاں، بھورے مٹیالے بڑے بڑے پرندے۔ ان کی روانگی کا مہینہ بھی مقرر ہوتا۔ پھر کوئی اور گروہ آتا۔

موسمی پرندوں کی یہ آمد ورفت جاری رہتی۔

وہاں مقامی پرندے بھی لاتعداد تھے۔

پہاڑ چڑھتے ہوئے کئی دفعہ یہ ہوا کہ چاروں طرف مکمل خاموشی ہے لیکن درختوں پر بیشمار پرندے بیٹھے ہیں۔ ایک بھی نہیں بول رہا۔ اور کبھی چہچہوں سے جنگل گونج رہا ہے لیکن ٹہنیاں خالی پڑی ہیں۔ بمشکل دس بارہ پرندے گِن سکے۔

کیمپ کے پرندوں کا ٹائم ٹیبل کچھ یوں تھا۔۔۔

علی الصبح کبھی کبھی تو قوّالی سی ہوتی جس میں پہلے لیڈر کی تان سنائی دیتی پھر ہمنواؤں کی آوازیں آتیں۔ کسی روز سب مل کر کورس سا آلاپتے جیسے حمد و ثنا میں مصروف ہوں۔

سورج نکلتے ہی ایک موٹی آواز والا پرندہ کئی دفعہ 'پھرررر۔۔۔۔۔ پھرررر'۔۔۔ کی لمبی سیٹی بجاتا۔ گویا کوئی ریفری فاؤل کا اعلان کر رہا ہو۔ دس بجے کے قریب ایک لٹھ مار قسم کا پرندہ جیسے ڈانٹنے لگتا۔۔۔ 'کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟'

دوسرے جھنڈ سے آواز آتی۔۔ 'کیا کہا؟ کیا کہا؟ کیا کہا؟ کیا کہا؟'

دوپہر کے لگ بھگ کوئی مستری نُما پرندہ آدھ آدھ گھنٹے تک ٹھُک ٹھُک ٹھک، ٹھُک کرتا رہتا۔ ذرا دیر سانس لے کر پھر ٹھُک ٹھُک۔ اس کی روانی میں ایک اور پرندہ مُخل ہوتا جو ہُوک ہُوک کر کے ہارن سا بجاتا۔ کسی اور سمت سے اس سے بھی اُونچی آواز میں ہوک ہوک کی جاتی۔ پھر ایسی ٹھُک ٹھُک اور ہُوک ہُوک مچتی کہ کسی ورکشاپ کا گمان ہونے لگتا۔

دن ڈھلے ایک قنوطی سا پرندہ بڑی بے دِلی سے کہتا۔۔۔ 'مت کرو، مت کرو، مت کرو'۔ پھر اور بھی غمگین لہجے میں۔۔۔ 'یہاں کُچھ نہیں کُچھ نہیں کُچھ

نہیں'۔۔۔۔۔'یہاں کُچھ نہیں کچھ نہیں، ساتھ ہی کہیں آس پاس سے یو کلپٹس، یو کلپٹس، یو کلپٹس کی صدا آتی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے کبھی کبھی شوخ سی آواز میں۔۔۔'ساتھیو ساتھیو آ گیا، ساتھیو ساتھیو آ گیا'۔۔۔۔۔ دوہرایا جاتا۔ ہر چوتھے پانچویں روز 'کانا باتی کرررر۔۔۔۔' 'کانا باتی کرررر۔۔۔۔'کا وظیفہ کرنے والا پرندہ آتا۔ اور وہ جو سب کو پسند تھا کبھی کبھی نمودار ہوتا۔ آتے ہی، بڑی ملائمت اور شستگی سے کہتا۔۔۔'اچھا جی؛، دو تین منٹ کے بعد 'اچھا جی،' پھر وقفہ۔۔۔۔ اور اچھا جی۔

لیکن سب سے زیادہ انتظار MEET THE GIRL, MEET THE GIRL کی خوشخبری سُنانے والے پرندے کا رہا جو بہت ہی کم آیا کرتا۔

مغرب تک سب دانا دُنکا چُن کر واپس پہنچتے تو رونق بڑھ جاتی۔ پہلے چند تماشبین سے پرندے لمبی تان لگا کر اوئے۔ اوئے۔ اوئے۔ کرتے۔ جیسے کسی کو ہُوٹ کر رہے ہوں۔ ان کے خاموش ہونے سے پہلے پچاس ساٹھ گز دُور سے بالکل وہی صدا آتی۔ جس کا جواب اُدھر سے ملتا۔ تھک کر یا اُکتا کر وہ ذرا دیر چُپ رہتے لیکن تازہ دم ہوتے ہی پھر وہی اوئے اوئے اوئے۔۔۔ آخر میں ایک مختصر سی قوّالی ہوتی اور اندھیرا چھانے پر آہستہ آہستہ آوازیں آنی بند ہو جاتیں۔

ساڑھے تین میل فی گھنٹے کی عام پیدل رفتار بھاری بھر کم کاہل مشکوک کے کیس میں اُلٹ تھی، یعنی ساڑھے تین گھنٹے فی میل۔ فلاسفر کو شُبہ تھا کہ جب یہ اکیلا نکلتا ہو گا تو اتنی سُست چال پر پرندے ضرور اس کے سر اور کندھوں پر آ بیٹھتے ہوں گے۔

مشکوک کو دُبلے پتلے انسان ناپسند تھے۔ دراصل اسے وہ بھی اچھے نہ لگتے جو چُست نہ ہوں۔۔۔ اُسے سب پر شُبہ تھا۔ فقط دُبلوں پر ذرا زیادہ۔ اس نے چھریرے مقصود گھوڑے پر شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر کا یہ فقرہ چسپاں کیا۔۔۔ ان CASSIUS لاغر اور حریص لگتا ہے۔ یہ سوچا بہت ہے۔ اور ایسے آدمی خطرناک ہوا کرتے ہیں۔

مقصود گھوڑا سوچنے لگا کہ جولیس سیزر نامی شخص کس فلم میں دیکھا تھا؟ شیکسپیئر سے البتہ تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ بلکہ شکایت بھی تھی کہ انگریزی ہو یا اُردُو، نثر ہو یا نظم، اس آدمی کا نام بار بار کیوں آجاتا ہے۔

”کتنے احمق ہو سکتے ہیں یہ فانی انسان۔۔۔“ شیطان نے PUCK کا مشہور فقرہ

سنایا۔

"یہ کس نے کہا تھا۔۔۔؟"مقصود گھوڑے نے چونک کر پوچھا۔

"شیکسپئر کے کیریکٹر نے۔"

"شیکسپئر کے چال چلن کے متعلق۔۔۔"

"نہیں۔ یہ اس کے ڈرامے کے کردار نے کہا تھا۔"

"وہ کردار ضرور کیفرِ کردار کو پہنچا ہو گا۔"اس نے نحیفہ کی طرف عالمانہ انداز سے دیکھا۔

"اور جب اپسی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے جہات کسی سے سیکھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ عقلمندوں سے۔۔۔"

"یہ کس نے کہا تھا؟"مقصود گھوڑا دوسری دفعہ چونکا۔

"میں نے۔" شیطان بولے۔

ایک روز فلاسفر نے اپنی وزنی کتاب سے سُنایا۔۔۔ "اب ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا

بھر کے موٹوں میں ایک بات مشترکہ ہے۔۔۔ یہ کہ وہ کچھ بھی تو نہیں کھاتے۔۔۔۔ پھر جانے کیوں وزن بڑھ جاتا ہے۔۔۔ کم از کم اوروں کو وہ یہی بتاتے ہیں۔"

"لیکن یہاں کا موٹا آدمی اور طرح کا ہے۔" کسی نے کہا۔ "داؤ لگ جانے پر کچھ بھی نہیں چھوڑتا۔ دکانوں کی مٹھائیوں، پیسٹریوں کو ایسی للچائی ہوئی نگاہوں سے تکتا ہے کہ فرہاد بھی شیریں کو یوں نہیں دیکھتا ہوگا۔"

مشکوک کے اور طرح کے ہونے میں کسی کو شُبہ نہیں تھا۔

جب اس کی لمبی کتھا شروع ہوتی تو شروع میں رُخ دوسروں کی طرف ہوتا۔ بعد میں کچھ گفتگو اَوروں سے ہوتی کچھ اپنی ذات سے۔ پھر جمائیاں لینے لگتا۔۔۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ۔۔۔۔ ان کا تانتا بندھ جاتا۔ دیکھتے دیکھے یہ پھیلنے لگتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے کھڑکیاں دروازے جمائیاں لے رہے ہوں، کھُلی ہوئی الماریاں، صندوق جمائی لیتے۔ آس پاس کی ہر چیز جمائی پر جمائی لیتی۔ اور جب بول نہ رہا ہو تو اس کی خاموشی بھی عجیب سی لگتی۔ چُپ چاپ ہوتا تو یہ تاثّر دیتا کہ کسی فتنے فساد کے متعلق سوچ رہا ہے۔ یا ابھی کسی پر طنز کر دے گا۔ یہاں تک چاند تاروں کی طرف دیکھتا تو اس طرح جیسے یا تو اجرامِ فلکی کی آپس ہمیں لڑائی

کرائے گا یا انہیں کوس رہا ہے۔

اس کے نظریے بھی عجیب تھے۔ مثلاً اسے خبر تب ہی دلچسپ لگتی اگر وہ بُری ہو۔ اس کی رائے میں خیر و عافیت کی اطلاع فقط وہاں سے آسکتی ہے جہاں نِرا جمود ہو۔ رہ گئی خوشخبری، سو اُسے خبر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کا تعلّق کسی اتفاقیہ واقعے سے ہوتا ہے جس سے فقط گِنے گنائے لوگ وقتی طور پر خوش ہو گئے ہوں۔

انجنیئر STATISTICS کا حوالہ دیتا کہ بُری اور اچھی خبروں میں تقریباً ساٹھ اور چالیس فیصد کا تناسب ہوتا ہے۔

"میں نہیں مانتا۔۔۔" مشکوک کہتا جو نہ ماننے کا پہلے ہی سے فیصلہ کر چُکتا۔۔۔۔ ایسی باتیں سُننے کی بیگار سے سب اُکتا گئے۔ مگر مقصود گھوڑے کو یہ مہارت تھی کہ جب چاہتا اپنے کانوں کا SWITCH بالکل آف کر سکتا تھا۔ یا پھر سُننے کی WaveLength تبدیل کر کے کوئی اور اسٹیشن لگالیتا۔

اِدھر مشکوک کی گفتگو شروع ہوئی اُدھر مقصود گھوڑا سماعت کا کنکشن بدل کر کسی پُرانے مہاتما کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ حاضرین یہی سمجھتے کہ نہ

صرف وہ سب کچھ سُن رہا ہے بلکہ اس پر غور بھی کر رہا ہے۔

آدھ پون گھنٹے کی جھک جھک کے بعد مشکوک اس کی رائے پوچھتا تو پُر سکون لہجے میں جواب ملتا۔۔۔ "ایں!" یا "کیا؟"۔۔۔

یہ گھُنّا پن شروع ہی سے اس کا ٹریڈ مارک رہا ہے۔

ایک شام کو جب مشکوک کنٹین کی لاری کا انتظار کر رہا تھا تو اندھیرا گہرا ہونے پر فلاسفر نے مقصود گھوڑے سے کہا کہ اسے موٹر سائیکل پر چھوڑ آئے۔

"مجھے موٹر سائیکل چلانی نہیں آتی۔"

"تو سیکھ لو۔"

"سیکھنا بھی نہیں آتا۔"

یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ کینٹین کی لاری پر مشکوک کو ہر روز لِفٹ مل سکتی۔ ڈرائیور اُسے تبھی ساتھ بٹھاتا جس دن آٹے کی بوری نہ لانی پڑتی۔ پرانے ماڈل کی لاری جب مشکوک کو کھینچتی تو اکثر گرم ہو کر رُک جاتی۔ کیونکہ ڈھائی من کی بوری سے وہ کہیں وزنی تھا۔

اسے بحث مباحثے کا اتنا خبط تھا کہ آتے ہی کوئی اول جلول موضوع چھیڑتا۔ پھر دوسرا، تیسرا، حتّٰی کہ سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اگر کوئی تسلیم شدہ دلیلوں سے تردید کر بیٹھتا تو میز یا کُرسی یا گھُٹنے پر مکّہ مار کر (جو کبھی کبھی اس کی توند پر بھی لگ جاتا) کہتا۔ ”وہی پرانی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ تبھی تو آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ارتقاء رُکا ہُوا ہے۔ انفرادیت ختم کر کے لکیر کے فقیر بن چکے ہیں۔ ریوڑ والی ذہنیت اختیار کر لی ہے۔۔۔۔“

فلاسفر سمجھاتا کہ ”جب بندر ارتقاء کی منازل طے کر کے انسان بنے تھے تب ان میں کہاں کی انفرادیت تھی۔ جنگلوں میں اکٹھے ہی تو رہا کرتے تھے۔ اور اب بھی یہی پوزیشن ہے۔ انفرادیت ہے تو صرف چڑیا گھر کے جانوروں میں، جو الگ الگ رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے کوئی بھی انسان نہیں بن رہا۔“

وہ ایک اور مکّہ کہیں لگا کر پوچھتا۔ ”کیا جانور انسان سے بہتر نہیں؟ ساری مخلوق میں فقط انسان ہی ہے جسے مُسکرانے، ہنسنے کی صلاحیت ملی ہے۔ لیکن کتنے انسان خوش رہتے ہیں؟ یہ پوچھنے کو جی چاہتا کہ وہ خود خوش کیوں نہیں رہتا۔“

کیمسٹ بتاتا کہ جنوبی امریکہ کے گھنے جنگلوں میں کئی بلّیاں ہیں جنہیں مُسکراتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اور لگڑ بگڑ یعنی چرخ تو رات بھر بلا وجہ ہنستا رہتا ہے۔

مشکوک سر ہلا کر کہتا "تم سمجھے نہیں۔ جب جنگ ہوتی ہے تو انسان پہلے جتھے بنا کر منظّم ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے انسانوں کے بڑے سارے گروہ سے لڑتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سُنا کہ کسی جنگل کے پانچ چھ شیر آپس میں صلاح مشورہ کر کے دوسرے جنگل کے شیروں پر حملہ آور ہوئے ہوں یا چالیس پچاس ہاتھی ساز باز کر کے دیگر ہاتھیوں سے مقابلہ کرنے نکلے ہوں۔ یا ساٹھ پینسٹھ اُونٹوں نے ٹریننگ کر کے مخالف اُونٹوں پر دھاوا بول دیا ہو۔۔۔۔؟"

فلاسفر کہتا کہ جانوروں کو ابھی تک روپے پیسے کا پتہ نہیں ہے۔ جب ان میں تنخواہ اور الاؤنسوں کا سسٹم رائج ہو گیا، وہ بھی جتھے بنا کر منظّم ہونے لگیں گے۔

آہستہ آہستہ ہم عادی ہوتے گئے۔ جو کچھ وہ کہتا، یا فوراً مان لیتے یا خاموش رہتے۔ چنانچہ جب وہ لمبے لمبے وعظ کرتا تو ہم کسی گلدان، لیمپ یا جگ کی آڑ لے کر کتابیں پڑھا کرتے۔

اور ذرا ذرا دیر کے بعد درست ہے، یا صحیح ہے کہہ دیتے۔

بعد میں اسے شُبہ ہو گیا۔۔۔۔ "مجھے ہاں نہیں چاہئے۔ تعجّب ہے کہ پڑھے لکھے انسان اتنی آسانی سے متّفق ہو جاتے ہیں۔ تم بحث کیوں نہیں کرتے۔ شاید اس

لیے کہ سب کے ذہنوں کو زنگ لگ چکا ہے۔"

"کل ضرور بحث کریں گے۔" کوئی صفحہ اُلٹتے ہوئے تسلّی دیتا۔

"شاید یہ سچ ہی کہہ رہا ہے۔" کیمسٹ سرگوشی کرتا۔ "جب سے یہ ملا ہے، جو تھوڑے بہت ذہن رہ گئے تھے ان پر واقعی زنگ لگ چکا ہے۔ بلکہ کائی بھی اُگنی شروع ہو گئی ہے۔"

فلاسفر بھی مباحثوں سے کترانے لگا۔ اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ہر بحث کے تین پہلو ہوتے ہیں۔۔۔۔ میری رائے، تمہاری رائے اور صحیح رائے۔

"اب سے مجھے وکیل سمجھا جائے جو تبھی بحث کرتا ہے جب کوئی معقول معاوضہ دے۔" اس نے اعلان کیا۔ "لہٰذا آیندہ میں مفت بحث نہیں کروں گا۔ اور جو کچھ کہوں گا اس سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں۔" کبھی کبھی شیطان مشکوک کی طرفداری سی کرتے۔۔۔۔ "لگاتار انٹ کی سنٹ ہانکنا، حقائق کی توڑ مروڑ اور ہر چیز سے بیزاری۔۔۔۔ شاید یہی ماڈرن رجحان ہو۔ کیونکہ ان دِنوں لٹریچر، ریڈیو، فلمیں وغیرہ سب اسی کی عکاسی کر رہے ہیں۔"

مقصود گھوڑے نے اعتراف کیا کہ مشکوک سے پہلے نہ اُسے بور ہونے کا پتہ تھا نہ

بورنگ لوگوں کا۔ کبھی یہ لفظ سُنا کرتا تو وہ بورنگ یاد آتی جو پٹرول نکالنے کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ تب یہ اندازہ نہ تھا کہ کسی بور کے پاس بیٹھنا پڑ جائے تو ایک گھنٹہ کم از کم چار پانچ سو منٹ کا معلوم ہوتا ہے۔

اور ایسے شخص کو دریافت کرنے کی ذمّہ داری انجنیئر اور مجھ پر عائد ہوتی تھی۔

تہمیدہ ملغوبہ کے بارے میں جو فقرے کہا کرتی وہ اس کی شان (بلکہ کسی کی شان) کے شایاں نہ تھے۔

جب کبھی آمنا سامنا ہوتا اکثر چشم چوٹ ہوا کرتی۔

"آج تو کسی کا میک اپ حد سے گزر چکا ہے۔" وہ ملغوبہ کی سج دھج دیکھ کر بتاتی۔ "اتنا زیادہ کر لیا ہے کہ عمر دس گیارہ برس سے بھی کم لگ رہی ہے۔"

"اگر کوئی میرے متعلق جھوٹ نہ بولا کرے تو میں بھی اس کے بارے میں نہیں بولوں گی۔" جواب ملتا یا یہ کہ۔۔۔ "یہاں ایک لڑکی ایسی ہے جس سے نہ ملنے کا موقعہ میسّر آئے تو کبھی نہیں گنوانا چاہیے۔" تہمیدہ طنز کرتی۔

”اور ایک ایسی بھی ہے جو کانوں کی بجائے ہونٹوں سے سُنتی ہے۔“

یا پھر کھلم کھلا تم اور میں کر کے گفتگو ہوتی۔۔۔۔۔

”معاف کرنا۔ مصروف تھی اس لیے تمہاری پارٹی میں نہ آ سکی۔“ ملغوبہ کہتی۔

”تو کیا تم واقعی میں آئی تھیں؟“ تجاہلِ عارفانہ برتا جاتا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری اگلی دعوت پر معذرت کروں تو بُرا تو نہ مانو گی؟“

”ابھی ابھی معلوم ہوا کہ پندرہ بیس دن تمہاری طبیعت خراب رہی۔ تبھی سب حیران تھے کہ پندرہ بیس دن کوئی افواہ کیوں نہیں پھیلی۔“

اس قسم کی باتیں سن کر شیطان کو افسوس ہوتا۔ فلاسفر کہتے کہ معاشیات کے ماہر MAN POWER کے تحفّظ کی سفارش کیا کرتے ہیں۔ یہاں سب کے سامنے ان دونوں کی جھڑپ سے WOMAN POWER ناحق ضائع ہو رہی ہے اور کوئی کچھ نہیں کرتا۔ اس چپقلش کی وجہ کیا ہے؟ رشک یا حسد۔۔۔ جو غالباً ایک ہی جذبے کے دو اظہار ہیں۔ یا بھر دشمنی؟ اور رقابت تو ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کے لیے کسی کی محبّت پہلی شرط ہے۔ تو پھر کیا ہے؟ اور پہل ہمیشہ تہمیدہ کی طرف سے کیوں ہوتی ہے؟ فلاسفر بتاتا کہ اس کا سبب ہر وقت کی بیکاری ہے۔ لیکن شیطان

تجسس سے مجبور ہو کر ایسے معاملوں میں خواہ مخواہ سینگ اُلجھا لیتے ہیں۔

وہ تہمیدہ میں خالی خولی دلچسپی لینے لگے کہ پہلے رازدان بنیں گے پھر اصل سبب معلوم کیا جائے گا۔ فلاسفر کو بھی یہ خوشخبری سُنائی۔ ”اس طرح ایک THESIS کے لیے تمہیں بالکل انوکھا مواد مل سکے گا۔“ لیکن تہمیدہ تھی کہ انہیں دیکھتے ہی ملغوبہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتی۔ شیطان کو دیر دیر تک بولنے کا موقعہ نہ مل سکتا۔ اس نے اپنے ناقابلِ اشاعت جملوں کا ذخیرہ پانچ چھ ملاقاتوں میں ختم کر لیا پھر انہی کو بار بار دوہرانے لگی۔

شیطان ٹوکتے، کھانستے، ہاتھ کے اشارے سے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے لیکن اتنا سا اثر نہ ہوا۔ یہ اتنی مرتبہ ہوا کہ آخر میں ہار ماننی پڑی اور پسپا ہوتے ہوئے کہا۔ ”جی تو بہت چاہتا تھا کہ خلوت میسّر ہو اور دل کھول کر باتیں کی جائیں۔ واقفیت اتنی بڑھے کہ وہ مقام بھی آئے جہاں یہ شعر پڑھا جاتا ہے۔

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے

کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے کوئی تیسرا بھی ہو

مگر یہ تیسرا روزِ اوّل سے موجود رہا، یا رہی۔ ہم دو کبھی نہیں تھے، ہمیشہ تین

رہے۔۔۔۔

تم ملغوبہ اور میں! اور آئندہ بھی تین ہی رہیں گے۔"

تہمیدہ نہ شعر کے معنے سمجھ سکی نہ ان فقروں کا مفہوم۔ اُلٹا شُبہ سا ہوا شاید اس کی تعریف کی گئی ہے۔

"اچھا اب پتہ چلا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "آبشار سے واپسی پر آپ کھوئی کھوئی نگاہوں سے کبھی چاند کو دیکھتے کبھی مجھے۔ اور اس چیز کی طرف آپ کی نگاہیں ایک دفعہ میں نہیں گئیں جسے ملغوبہ کہا جاتا ہے۔ (اس شام شیطان عینک بھول گئے تھے اور اٹکل پچّو اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے کہ سب کہاں جا رہے ہیں)۔ اور میری دعوت پر بھی آپ نے مجھے زیادہ دیکھا اُسے کم۔ بلکہ آپ اتنے محو تھے کہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ (تب بھی شیطان کی عینک نہیں تھی اور جب تہمیدہ کی دعوت پر جانا پڑتا تو ہم کھانا کھا کر پہنچا کرتے)۔ لیکن آپ اس کی طرف دیکھتے ہی کیوں ہیں؟ آخر کیا ہے اس میں؟" اور پھر وہی CENSOR کی زد میں آنے والے الفاظ اور فقرے شروع ہو گئے۔ مجبوراً شیطان نے تجسس کے اس حصّے کو وہیں

چھوڑااور سوچنے لگے کہ ملغوبہ میں دلچسپی لیں تو شاید وہی کچھ بتا سکے۔

لیکن فلاسفر نے منع کر دیا۔ ”بہت سی باتیں اب تک انسانی عقل سے بالاتر ہیں۔“ اس نے سمجھایا۔ ”شاید یہ بھی ان میں سے ہو۔ تھیسس کسی اور موضوع پر لکھ لوں گا۔“

ملغوبہ کی دعوت پر ڈاکٹر کو پہلی مرتبہ بلایا گیا تو وہ غلطی سے بتائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا۔ وہاں نہ کوئی میزبان تھا نہ مہمان۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔

ملازم نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جہاں بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں جو غالباً ملغوبہ کے رشتہ داروں کی ہوں گی۔ سب کے آنے تک اس نے ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر کسی نے ایک رنگین پینٹنگ کے مصوّر کی تعریف کی تو ڈاکٹر نے تائید میں کہا۔۔ ”دمے کے پرانے مرض کی اتنی عمدہ نقّاشی کوئی اُستاد ہی کر سکتا تھا۔ اور اس کے بائیں طرف جو تصویر ہے اس کا خالق بھی کافی تجربہ کار ہو گا، تبھی مالیخولیا اور خفقان کی علامات اس قدر صحیح دکھائی

ہیں۔ انگیٹھی کے اوپر جو ضرورت سے زیادہ تندرست خاتون ہیں آرٹسٹ نے ان کے ہائی بلڈ پریشر، اختلاجِ قلب، اور گٹھیا کو بخوبی واضح کیا ہے۔ دروازے کے قریب تپِ دق کی پہلی سٹیج نہایت عمدگی سے کھینچی گئی ہے۔ اور کھڑکی کے ساتھ سیاہ فریم میں سے جھانکتے ہوئے ڈھیلی مونچھوں والے کا ہاضمہ مدّت سے جواب دے چکا تھا۔ محض کھینچا تانی سے گزارا ہوتا ہو گا۔۔۔"

ہم۔۔۔۔ 'وہ تو اچھا ہوا کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔۔۔۔' والے فقرے کے منتظر تھے کہ پکّے راگ کے کسی شوقین نے گھڑی دیکھی اور میاں کی ٹوڈی ہو رہی ہو گی کہہ کر ریڈیو اُونچا کر دیا۔

جس قسم کی صدائیں آئیں ان سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جوشیلا تُند خُو کسی سے بدلا لینے پر تُلا ہوا ہے۔ کچھ دیر وہ اور راگنی آپس میں اُلجھتے رہے۔ پھر اس نے وہ بھرپور حملہ کیا کہ بیچاری ٹوڈی کو بے بس کر کے چاروں شانے چِت گرا لیا۔ راگنی نے اتنی توہین کے باوجود بھی ہمت نہ ہاری اور مدافعت کی بہت کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ تھوڑی سی اور دھینگا مُشتی کے بعد گویا اس کے سینے پر سوار ہو کر میاں یعنی تان سین کو چیلنج کر دیا تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا۔ پہلے ولایتی سینٹ کی دلآویز مہک آئی، پھر مُرغ پلاؤ کے

اشتہا انگیز جھونکے۔ اور ان دونوں خوشبوؤں کے عقب سے ملغوبہ بر آمد ہوئی۔

نہ کسی کو موسیقی کا خیال رہا، مصوّری یا کسی اور فن کا۔ فوراً ساری نگاہیں پہلے ملغوبہ کی طرف پھر پلاؤ کی جانب مُڑ گئیں۔

کھانے کی میز پر حسبِ معمول طرح طرح کے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب سیّاحوں کے لیے سرائے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے کا ارادہ چھوٹی پہاڑوں پر زیتون اور تربوز اُگانے کا تھا۔ تیسرے نے بتایا کہ وادی کی کچھ ندیوں میں روپہلی چمک ہے اور چند میں سنہری۔ لہٰذا وہ ان پہاڑوں میں سونے چاندی کی کانوں کی تلاش میں ہے۔

پھر ایک اور نے جو نِچلے قصبے کی انجمن کے سیکرٹری یا صدر یا خزانچی تھے، ہماری غیر حاضری کا گلہ کیا۔ اس انجمن کے ممبر گاہے بگاہے میٹنگ سی کیا کرتے جس میں نثر و نظم کے ذریعے عہد کیا جاتا کہ ہم جیالے، سجیلے، دلیر نوجوان اس قصبے، اس خطے، اس ملک کے گوشے گوشے پر نثار۔ فضاؤں کو جگمگا کر ہم اس کے در و دیوار سونے کے بنا دیں گے۔ وہ عروج لائیں گے کہ آسمان تک ہماری زمین پر رشک کرے گا۔ سب کو خوش اخلاقی، امدادِ باہمی سکھائیں گے۔ یہ کریں گے، وہ کریں گے۔۔۔۔۔

بار بار یہی دوہرایا جاتا لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود مقامی باشندے بالکل ویسے کے ویسے تھے۔ اور قصبہ، خطہ، کسی میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔

یہاں تک کہ جس ہال میں مجلسیں ہوا کرتیں اس کے جتنے بلب فیوز ہو چکے تھے ایک بھی نہیں بدلا گیا۔ شکستہ کھڑکیاں، دروازے مرمّت کے منتظر رہے اور ٹوٹی ہوئی صراحیوں میں پینے کا پانی تک نہیں تھا۔

فلاسفر کی رائے تھی کہ انجمن کو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے دعوے یہ سمجھ کر کیے جاتے ہیں کہ اُن کی تکمیل کرنا دوسروں کا فرض ہے۔ تبھی مدد کرنے والا اپنی تقریر یا تحریر کے بعد فوراً ایک طرف ہو جاتا ہے کہ اب اس پر عمل کرنا نہ کرنا پبلک کا کام ہے۔

انجنیئر نے اعتراض کیا کہ ایسے وعدے پریکٹیکل نہیں ہیں۔ شیطان نے ایضاً کہا اور ہم نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ تو انہوں نے قاصد بھی بھیجا لیکن مقصود گھوڑے نے دعوت نامہ پڑھ کر وہیں کھڑے کھڑے معذرت کر لی۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ تقریب میں شامل نہ ہوسکنے کی وجہ بعد میں سوچ کر انہیں مطلع کر دیں گے۔

دوسرے پہاڑ جہاں لاری رُکتی ملغوبہ کا مکان وہاں سے قریب تھا۔ سہ پہر کو اس طرف جانا ہوتا تو ملغوبہ، اس کی بہنیں، منگیتر، ایک آدھ رشتہ دار سب آرام کرسیوں پر تقریباً اُونگھتے ہوئے نظر آتے۔ مُرغّن لنچ چڑھ جانے سے ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی۔ آپس میں کوئی گفتگو ہوتی ہوگی تو باتوں کی بجائے ان جمائیوں کے ذریعے جو وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر لیا کرتے۔ ایک دن ہم نے سڑک سے ہاتھ ہلائے، ہیٹ اُچھالے، لیکن وہ اسی طرح مراقبے میں رہے۔ جب زور سے منگیتر کا نام لیا تب چونکے۔ اس نے ہمیں چاء پر ٹھہرا لیا۔ ملغوبہ کے ہاں چاء بھی نہایت پُر تکلّف تھی۔ اسے پی کر بلکہ کھا کر باہر نکلے تو ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں سے ساری وادی سنہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے جھونکے سفیدے اور صنوبر کے درختوں کو چھیڑ رہے تھے۔

ایسے سہانے سماں میں ملغوبہ کو کچھ یاد آ گیا۔ ایک طرف اشارہ کر کے اپنے الکسی اور ٹھکے ہوئے منگیتر سے رومانی لہجے میں بولی۔ "بھُولے تو نہ ہوگے۔ جب دسویں کا امتحان دیا تو اسی درخت پر چڑھ تمہیں دیکھا کرتی تھی۔۔۔"

منگیتر نے پہلے اسے دیکھا پھر درخت کو۔ "اور جو اَب چڑھنے کی کوشش کرو تو درخت سمیت نیچے آؤ گی۔" ایسے جواب پر کسی نے شولری کا حوالہ دیتے ہوئے

احتجاج کیا۔۔۔۔

"وزن گھٹا بڑھتا رہتا ہے۔۔۔۔"منگیتر نے بتایا۔"اور دسویں جماعت میں انہوں نے کتنا عرصہ گزارا؟ یہ اب یاد نہیں رہا۔"

ہمیں منگیتر پنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن یہ منگیتر جو کزن بھی کہلاتا تھا کچھ ہونّق سا لگا۔

جب چند دنوں کی بارش کے بعد روشن دن طلوع ہوتا تو سب خوش ہو کر اپنے پسندیدہ پروگرام بناتے۔ انجنیئر اور میں ایک چوٹی کو فتح کرنے کی تیاری کرتے (جو فقط آٹھ نو سو فٹ اونچا ٹیلا تھا) فلاسفر اور کیمسٹ اپنی وزنی کتابوں کی نمی دُور کرنے کے لیے بُرادے میں دری بچھاتے کیونکہ دھوپ میں رکھنے سے صفحے سُکڑ جاتے تھے۔ تہمیدہ نئی (اور پرانی) افواہوں کی تلاش میں نکل جاتی۔ ملغوبہ کو دعوت کا خیال آتا۔ مہمانوں کی فہرست مرتّب ہوتی جس میں زیادہ مرد ہوتے اور خانہ پُری کے لیے چند بخشی ہوئی لڑکیاں (کسی خوبصورت لڑکی کو اس نے کبھی سہیلی نہیں بنایا تھا)۔ لیکن منگیتر جیسے قُطب مینار کو جدھر بھی گھُمالو سوئی کا رُخ شمال ہی کو رہے گا۔ اسے ایسے روز بھی چٹورپن کی دھن رہتی۔

ملغوبہ شکایات کرتی۔۔۔۔ ”انہیں کون سمجھائے۔ دن بھر نیم دراز ہو کر سگرٹیں پیتے رہتے ہیں۔ کوئی قریب بیٹھے تو دھوئیں سے لگاتار کھانستا ہے۔ تقریبوں پر مہمانوں کے سامنے آتے ہوئے اپنے حلیے کا خیال نہیں رکھتے۔ کھانے کی میز پر کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔“

موقعہ ملنے پر منگیتر سے ذکر کیا تو جواب ملا۔ ”مگر مجھے اس سے محبت ہے۔“

”وہ کہتی ہے کہ کئی کئی روز شیو نہیں کرتے۔“

”لیکن میں اس پر عاشق جو ہوں۔“

”اسی کو یہ شکایت ہے کہ دعوت پر مہمانوں کے سامنے سے بھی چیزیں اُٹھا لیتے ہو؟“

”مگر وہ مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔“

”اسے یہ بھی گلہ ہے کہ سگرٹ بہت پیتے ہو اور اب تمہاری کھانسی پر بزرگوں کے کھنگارنے کا گمان ہونے لگا ہے۔“

”کہہ جو دیا کہ اس پر فریفتہ ہوں۔ اسے اور کیا چاہیے؟“

اس قسم کے منگیتر کو اور کیا کہا جا سکتا تھا۔

مگر روزانہ ستّر اسّی سگرٹ پھونکنے پر ڈاکٹر نے پہلے تو حقّہ تجویز کیا۔ اس کے انکار پر سگرٹ کے کاغذ اور TAR سے ڈراتے ہوئے صلاح دی کہ اگر بالکل نہیں چھوڑ سکتے تو کم ہی کر دو۔ اگلی ملاقات پر دیکھا کہ تعداد کم نہیں ہوئی تھی لیکن اب وہ قینچی سے کاٹ کر سگریٹ کا سائز ذرا کم کر لیا کرتا۔

"سگریٹ کی لمبائی نہیں سگریٹ نوشی کم کرنے کو کہا تھا۔" ڈاکٹر نے یاد دلایا "بہتر تو یہ ہو گا کہ سگریٹوں سے دُور رہو۔۔۔۔"

بعد میں پتہ چلا کہ کہیں سے لمبا سا سگریٹ ہولڈر لے آیا۔ چنانچہ کش لگاتے وقت سگریٹ اور وہ ایک دوسرے سے واقعی دُور ہوتے۔

پھر فلاسفر نے مشورہ دیا کہ "ہر شخص کو قوّتِ ارادی عطا ہوئی ہے۔ تم بھی اسے آزماؤ۔" منگیتر نے اپنی قوّتِ ارادی استعمال کی اور آخر کار سگریٹ چھوڑنے کی ترغیب پر غلبہ پانے میں کامیاب ہو گیا۔

نہایت چمکیلے اتوار کو ہم پکنک پر نکلے۔ قہقہے لگاتے ہوئے چڑھائی طے کی۔ ایک

طرف سامان رکھ کر کھیلوں کا پروگرام بنا رہے تھے کہ لاری نظر آئی اور بِن بلایا مشکوک آ پہنچا۔ آتے ہی وہی باتیں شروع کر دیں۔ اتفاق سے عوام نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ہلکے ہلکے بادل آئے اور نظاروں کو چھُپانے لگے۔ روشنی کم ہوتی گئی۔

ہمیں بے توجّہ پا کر وہ لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے کیا کہا، کیا نہیں کہا۔ ان کے مُسکراتے ہوئے چہرے سنجیدہ ہو گئے۔ پھر ناک بھوں چڑھا کر گویا بھُول گئیں کہ پکنک پر اس لیے آئی ہیں کہ ہنسیں بولیں، خوش ہوں۔ جیسے پہلوان اکھاڑے میں کودنے سے پہلے ڈنٹر بیٹھکیں نکالتے ہیں اسی طرح باقاعدہ لڑنے سے پہلے زیرِلب طعنے تشنے شروع ہو گئے کہ کون کون کس کس پر ملتفت ہے۔ کِن کِن کی پوشیدہ ملاقاتوں سے اُن سب کی باہمی دوستی پر اثر پڑ رہا ہے۔ روئے سخن ہماری طرف بھی تھا۔ دبادب چوٹیں ہو رہی تھیں جو سراسر بے تُکی تھیں۔

بادل گہرے ہوتے گئے اور اندھیرا چھانے لگا۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ روشنی کم ہونے پر بیٹسمین امپائر سے کھیل ختم کرنے کی اپیل کر سکتے ہیں کیوں نہ اسی بہانے واپس چلیں۔

سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں کہیں سے ایک پھیری والا آ گیا جس کی کمر پر تھان تھے اور ہاتھ میں گز۔ اس نے لڑکیوں کو دیکھتے ہی گٹھڑ کھولا اور

رنگ برنگے کپڑے پھیلا دیئے۔ وہ ان پر ٹوٹ کر پڑیں اور یوں منہمک ہوئیں کہ پھر ہماری طرف ایک بار نہیں دیکھا۔

وہی لڑکیاں جو ذرا دیر پہلے ایک دوسری پر ناخن تیز کر رہی تھیں اب سگی بہنوں کی طرح بڑے پیار سے کپڑوں کے ڈیزائن، شیڈ، قیمت پر آپس میں باتیں کرنے لگیں اور ہم بے وقوفوں کی طرح یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

محض اس بزاز کی آمد سے پکنک نہ صرف کامیاب رہا بلکہ اگلے اتوار کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ واپسی پر شُبہ سا ہوا کہ کہیں یہ لڑکیاں اور مشکوک ہماری رفاقت پر تو اثر نہیں ڈال رہے۔ اس کا احساس دیر سے ہوا لیکن واقعی ہم میں تبدیلیاں آرہی ہیں

کیمسٹ کی بوسیدہ، چوہوں کی کُتری ہوئی، قابلِ اعتراض مونچھیں اب معقول اور نوکدار نظر آئیں۔ دوسرے تیسرے روز حجامت کرنے والا مقصود گھوڑا روزانہ اتنی سنجیدگی سے شیو کرتا کہ ریزر سے دو تین خراشیں بھی لگا لیتا۔ پہلے اس کی پہاڑی واسکٹ سے بھیڑ بکریوں کی بو آیا کرتی۔ لیکن اب وہ کسی صابن کا اشتہار بنا رہتا۔ شیطان کی عینک کے موٹے موٹے شیشے جن پر مکھّن، دہی اور سالن کے چھینٹے ہوا کرتے اب صاف اور چمکیلے رہنے لگے۔ میری قمیض کے بٹن کھلے رہتے۔

آستینیں کہنیوں تک بلکہ کھینچ کھینچ کر کندھوں تک چڑھائی جائیں۔

ہم ایک دوسرے کی ذرا ذرا سی بات کی جانچ پڑتال کرنے بیٹھ جاتے اور عموماً غلط نتیجہ نکالے۔ یعنی نقّاد سے بنتے جا رہے تھے جو ہر چیز پر نکتہ چینی کرتے ہیں، خواہ وہ اچھی ہی ہو۔ ناشتے پر مقصود گھوڑے کے چہرے پر خراش نظر آئی تو قیاس آرائیوں شروع ہو جائیں۔۔۔۔

"شاید کنجوس ہے۔ پرانے بلیڈ استعمال کرتا ہو گا۔"

"بینائی کمزور ہو سکتی ہے، عینک لگا لینی چاہیے۔"

"نحیفہ کے فکر میں رعشہ لاحق ہو گیا جس سے ہاتھ کانپتے ہیں۔"

"ریڈیو لگا کر حجامت کرتا ہو گا۔ یہ سیاسی خبروں کا اثر ہے۔"

حالانکہ مقصود گھوڑے کا پرائیویٹ معاملہ تھا۔ چہرہ اس کا تھا اور بلیڈ بھی اس کا۔ خراش بھی اسی کو آتی تھی۔

"دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے ڈھنگ ہیں۔" مشکوک کہتا۔ "حجامت وغیرہ محض بہانے ہیں۔" ایک دن انجنیئر نے خبردار کیا "خیال رکھنا

کہیں ان لڑکیوں کی وجہ سے ہم میں پھُوٹ نہ پڑ جائے۔" اس پر دیر تک خاموشی رہی۔

اگلے روز جب مٹیالے بادلوں کی بھاپ سے کمرہ بھرا ہوا تھا تو کسی کو انجنیئر کا فقرہ یاد آگیا، اور لڑکیوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

"میرے خیال میں تو ان سے ملنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔" ایک کونے سے سُنائی دیا۔

"کوئی نقصان بھی نہیں۔"

"مگر یہ فقط گرمیاں گزارنے آتی ہیں۔ ان کی حیثیت فصلی بٹیروں کی سی ہے۔" دوسری سمت سے صدا آئی۔ تیز جھونکا تھوڑے سے کُہرے کو ساتھ لے گیا۔ جس نے بولنا شروع کیا اس کی شکل بھی دکھائی دی۔ فلاسفر کہہ رہا تھا۔ "کم از کم مجھے اسی غیر منطقی باتوں میں مت الجھاؤ۔ سُن سُن کر یونہی کہیں اشتیاق نہ ہو جائے اور خواہ مخواہ اس قِیل و قال میں حصّہ لینے لگوں۔"

پھر دُھندلاہٹ بڑھ گئی۔

"فلاسفر نے سچ کہا ہے۔ یہ میرے ٹائپ کی بھی نہیں ہیں۔" کیمسٹ کی آواز آئی۔

”تو تمہیں کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟“

”کسی اور طرح کی۔“

دھواں ہلکا ہوا اور شیطان کہتے ہوئے نظر آئے۔ ”محض اتفاق سے ایسی لڑکیوں سے واسطہ پڑا ہے جن سے ملنے کی کسی نے درخواست نہیں کی تھی۔ ہمارے بارے میں ان کے خیالات بھی ایسے ہی ہوں گے۔ یا شاید اور بھی گئے گزرے ہوں لیکن یہاں اتنی تنہائی ہے کہ کسی قسم کی بھی لڑکیوں کا دم غنیمت سمجھنا چاہئے۔ لہٰذا ان سے سفارتی تعلقات برقرار رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ البتہ بین الاقوامی اداروں کی طرح جو کچھ دل میں ہو اس کا زبانی یا تحریری اظہار بھی مت کرو“ سیاہ بادل کا بھپارہ آیا جس سے سب کچھ چھُپ گیا، لیکن گفتگو جاری رہی۔ جب باتیں تیز بحث میں تبدیل ہوئیں تو انجنیئر بولا ”جس خدشے کا کل ذکر کیا تھا آج اس کا مظاہرہ تو نہیں ہو رہا؟ کبھی کبھی خراب موسم میں بھی تُو تُو مَیں مَیں کرادیتا ہے۔ لہٰذا اس موضوع کو یہیں ختم کرکے ایک کیس پر مشورہ دو۔“

اس نے فائل کھولی۔۔۔۔

اس کے تین ماتحتوں کے کاغذات ہیڈ آفس سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک کو

ٹرینگ کے لیے پانچ چھ سو میل دُور بھیجنا تھا۔

"تعلیمی لحاظ سے تینوں یکساں ہیں۔" اس نے بتایا۔ "سروس بھی تقریباً برابر ہے اور سالانہ رپورٹیں بھی ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے چُننے میں دقّت ہو رہی ہے۔"

"اگر انہیں واقعی کچھ سکھانا ہے تو STATES بھیجو۔ ورنہ رہنے دو۔" کیمسٹ نے رائے دی۔

"تینوں ایک جیسے ہیں تو تینوں کو بھیجو، ورنہ کسی کو بھی نہیں۔" شیطان بولے۔

"مزید پڑھنے سے کچھ فائدہ ہو گا بھی یا نہیں۔" فلاسفر کہنے لگا "کیونکہ سروس کی قدریں بدل چکی ہیں۔ وہ دن گئے جب قابلیت کی قدر ہوتی تھی۔ اب تو تم کیا کچھ جانتے ہو، کی جگہ تم کس کس کو جانتے ہو کی اہمیت رہ گئی ہے۔"

میں نے انٹرویو کرنے کو کہا لیکن وہ کافی دُور تھے اور جواب کی جلدی تھی۔

ان کی تصویریں دیکھیں جنہیں فوٹو گرافر اس قدر رِی ٹچ کر چکا تھا کہ تینوں چہرے بالکل سپاٹ لگے۔ میں نے دوبارہ مشورہ دیا ایک میل کی دوڑ لگواؤ۔ جو جیتے اُسے چُن لو۔

"یہ نام کے ہی نوجوان ہیں۔" انجنیئر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دوڑنا تو ایک طرف، یہ درشنی پہلوان ایک میل تیزی سے نہیں چل سکتے۔"

"پچھلے سال مجھے بھی کچھ ایسا ہی انتخاب کرنا پڑا تھا۔ شاید میں مدد کر سکوں۔" مقصود گھوڑا بولا۔ پھر اُس نے فائل کے صفحات بار بار پلٹ کر یہ فیصلہ سُنایا۔ "ایک امیدوار ایم۔ آئی۔ میاں ہے۔ دوسرا آئی۔ ایم شیخ ہے اور تیسرا ایم۔ وائی آغا۔۔۔ جہاں پر بظاہر ایک سے ہیں وہاں ان میں فرق بھی ہے۔ ایم۔ آئی۔ میاں کو اپنے اُوپر اعتماد نہیں اور وہ اس اُلجھن میں ہے کہ کیا میں واقعی میاں ہوں؟ ایم۔ وائی آغا کی حالت تو اور بھی مخدوش ہے۔ وہ تو باقاعدہ خلجان میں مبتلا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آغا کیوں ہے؟ البتہ آئی۔ ایم شیخ کو پورا یقین ہے کہ مَیں شیخ ہوں اور شیخ رہوں گا۔ لہٰذا میں اس کی سفارش کرتا ہوں۔"

چند دنوں بعد شیطان نے شکایت کی کہ کوئی ان کی طرف سے ریکارڈوں کی فرمائش کر دیتا ہے۔ اور ریڈیو پر نام اور پتہ شیطان کا سُناتے ہیں۔

ہم نے یہ فرمائشی پروگرام سُنا۔ خاتون اناؤنسر نے آواز کو زبردستی شرمیلی اور سُریلی بناتے ہوئے پہلے کیمپ کا نام لیا پھر کہا۔ "وہاں سے روفی صاحب نے اپنے ڈاکٹر دوست کی سالگرہ پر اس ریکارڈ کی فرمائش کی ہے جس میں شعر ہے۔

آ گئی آپ کو مسیحائی

مرنے والوں کو مرحبا کہیے!

تو روفی صاحب عرض یہ ہے کہ ہم داغ کی ۔۔۔' کہیئے کہیئے مجھے بُرا کہیئے '۔۔۔۔ والی غزل سُنا تو رہے ہیں لیکن شاید آپ کے ڈاکٹر دوست ؔآ گئی آپ کو مسیحائی، کے شعر سے خوش نہ ہوں۔ کہیں یہ گانا رنگ میں بھنگ نہ ڈال دے۔"

دوسرے ہفتے سب آدھ گھنٹہ پہلے ریڈیو کے سامنے موجود تھے۔ خاتون اناؤنسر نے پھر نارمل آواز مصنوعی بنائی اور مٹک مٹک کر بتایا۔۔۔ "ہمارے جانے پہچانے پہاڑی کیمپ سے روفی صاحب کے ڈاکٹر دوست اس مرتبہ روفی صاحب کی سالگرہ پر اُنہیں یہ غزل سُنانا چاہتے ہیں۔

رات شیطان کو خواب میں دیکھا

ساری صورت جناب کی سی تھی!

روفی صاحب کو سالگرہ مبارک ہو لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ ایسا کوئی نغمہ ریکارڈ نہیں ہوا۔ لیکن کہیں آپ مایوس نہ ہوں، اس لیے بڑی تلاش کے بعد فارسی سیکشن سے ایسی غزل مل سکی جس میں شیطان کا ذکر یُوں ہے۔۔ کہ یزداں دارد

شیطان نہ دارد۔۔۔۔اُمید ہے کہ۔۔۔۔"

شیطان نے فوراً ریڈیو بند کر دیا اور جو بُزدل ان کی طرف سے خط لکھتا تھا اس کی شان میں کئی گُستاخیاں کیں۔

تیسرے ہفتے ایک کرخت سی آواز آئی۔

پہلے تو اس نے یہ خبر سُنائی کہ۔۔۔۔"پروگرام کی ہر دلعزیز اناؤنسر اب ہم سے دُور جا چکی ہیں (ہم یہی سمجھتے رہے کہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں)۔ان کی منگنی دیہاتی پروگرام کے چوہدری باغ دین سے ہو گئی ہے۔" پھر چند ریکارڈ سُنانے کے بعد ہمارے کیمپ کا ذکر ضرور کیا۔"نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے، اور ہے بھی یا نہیں، جہاں ہر ہفتے کسی نہ کسی کی سالگرہ ضرور منائی جاتی ہے۔ اب وہاں سے مقصود، اپسی، مِس نحیفہ کی سالگرہ، جو عید کو ہو گی۔نہ گانا سُنانا چاہتے ہیں

خوشی سال بھر کی مِٹا کر ملے

کہ وہ عید بھی کسمسا کر ملے

اپسی صاحب، اگرچہ پوری غزل ہم نے نہیں سُنی لیکن یہ شعر پسند آیا۔ ایسے نغمے ریکارڈ ہونے لگے تو سارے سابقہ ریکارڈ توڑ دیں گے۔ معاف کیجئے، یعنی مقبول ہوں گے۔"

اور اگلے ہفتے اسی اناؤنسر نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ "اُسی پہاڑی کیمپ سے جو فرمائش اس مرتبہ آئی ہے، ہم سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ یا تو پروگرام بند کر دیں۔ اور یا ایسے خطوط پر آئندہ کوئی ایکشن نہ لیا کریں۔"

مشکوک جب آتا کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ جاتا۔

بعد میں ہم چوکنّے رہنے لگے۔ لیکن وہ سب ایسی چالاکی سے کرتا، ہر بار کسی نہ کسی کو ضرور تشویش ہو جاتی۔

"کل ایک اجنبی تمہارے بارے میں پُوچھ رہا تھا۔" وہ چلتے وقت کہتا۔

"کون تھا؟"

"پتہ نہیں۔ لیکن لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے خفیہ پولیس والوں کا ہوتا ہے۔"

کبھی بتاتا کہ "نچلے قصبے میں سُنا کہ تمہارے لیے کسی شہر سے ٹرنک کال آئی تھی۔ اور ڈھونڈنے کے لیے ہرکارہ بھی اُوپر بھیجا گیا۔"

"کس کے لیے تھی؟"

"بھول گیا۔ یاد آیا تو بتادوں گا۔"

نیچے جا کر پوچھتے اور کئی روز تک کال کا انتظار رہتا۔

یا پھر۔۔۔ "کوئی کہہ رہا تھا کہ تمہارے ذمّے کافی انکم ٹیکس نکلتا ہے۔"

ہمیں پتہ تھا کہ جو معمولی سا انکم ٹیکس لگتا ہے وہ باقاعدگی سے وصول کیا جاتا ہے، پھر بھی سوچنے بیٹھ جاتے کہ شاید کچھ ادائیگی رہ گئی ہو۔

ملغوبہ کی دعوت پر شیطان کو لڑکیوں نے گھیر لیا۔

"میری عُمر زیادہ ہے یا ملغوبہ کی؟" تہمیدہ نے کھُلم کھُلا پوچھا۔

"تم ملغوبہ سے کم عُمر نظر آتی ہو اور وہ تم سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔" شیطان کو کہنا پڑا۔

"اور میں۔۔۔؟" نحیفہ بولی۔

"تم جتنے برس کی ہو اتنے کی بالکل نہیں لگتیں۔۔۔۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی مشکوک کی کارستانی تھی۔ شیطان کے سر یوٗنہی منڈھ دیا کہ وہ لڑکیوں کی عُمر جان بوجھ کر زیادہ بتاتے ہیں۔

انجنیئر اپنی رپورٹ ٹائپ کرا رہا تھا۔ مشکوک نے بمشکل ایک صفحہ دیکھا ہو گا کہ بولا۔۔۔

"ایسی رپورٹیں عموماً ہیڈ آفس سے اعتراضات کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہیں۔"

انجنیئر جانتا تھا کہ یہ ٹیکنیکل باتیں مشکوک کی سمجھ میں بالکل نہیں آ سکتیں، پھر بھی کئی روز اس کے ذہن پر بوجھ سا رہا۔

وہ جھوٹی خوشخبریاں بھی سُنایا کرتا جنہیں بعد میں غلط پا کر دُگنا افسوس ہوتا۔

مثلاً کیمسٹ کو بتایا کہ اسے لمبے کورس پر امریکہ بھیجا جا رہا ہے۔ وہ حیران ہوا کیونکہ سروے (جو کچھ وہ تھی) ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مشکوک نے اصرار کیا کہ اس کی عُمدہ کارکردگی پر یہ انتخاب ہوا ہے۔ کافی انتظار کے باوجود کوئی اطلاع

نہ آئی۔

"پوری ٹیم کو سردیوں سے پہلے واپس بلایا جارہا ہے۔" اگلی خبر یہ تھی۔

اس پر سب خوش ہوئے۔ مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔

"تمہاری ترقّی کی خبر گرم ہے۔" انجنیئر سے کہتا۔ وہ خاموش رہتا لیکن ہم پوچھتے کہ اسی جگہ ہو گی یا کہیں اور جانا ہو گا؟

"پتہ نہیں۔"

ایسی باتوں پر سب جھنجلاتے لیکن وہ یہی دوہرایا کرتا ہے کہ "جو کچھ کہا سُنا تھا کہہ دیا۔ کچھ اور معلوم ہوا تو وہ بھی بتادوں گا۔"

کبھی کبھی یوں لگتا کہ ہماری خوش فکری اُسے پسند نہیں۔ اور جیسے چیلنج سا کرتا رہتا ہے کہ اس کی موجودگی میں ہمیں مسرور رہنے کا کیا حق ہے۔

مغرب کے بعد کینٹین کی لاری اسے لے جاتی۔ پھر وہ نظر تو نہ آتا لیکن ذہن پر سوار رہتا۔ دیر دیر تک اُس کی باتیں ہوا کرتیں۔۔۔

انجنیئر بتاتا کہ مشکوک اسے ان مشتبہ ہستیوں کی تصویروں کی یاد دلاتا ہے جو

مغربی ممالک کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ اور جن کے چہروں پر اس مسلسل ایذا اور تشدّد کے آثار نمایاں ہیں جو وہ اپنے آپ کو پہنچاتے رہے۔ اور غالباً اپنے رفیقوں، شاگردوں اور مُریدوں کو بھی۔ اور یہ کہ وہیں اس نے یہ بھی سُنا تھا کہ پچاس سال کی عُمر عبور کر کے ہر ایک کا چہرہ بالکل ویسا ہو جاتا ہے جس کا وہ واقعی مستحق ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں مشکوک کو اس عُمر سے پہلے ہی وہ چہرہ مل چکا ہے۔

ڈاکٹر نے اب تک مشکوک سے مشابہت رکھنے والے فقط چار پانچ کیس دیکھے تھے۔ اعصابی امراض کے وارڈوں میں۔ لیکن جس علامت سے تشخیص پر شُبہ ہونے لگا وہ تھی۔۔۔۔ کھی کھی کھی ہی ہا ہپ۔۔۔۔ کی کھوکھلی آواز۔ جسے مشکوک تو ہنسی سمجھتا ہو گا لیکن ڈاکٹر نے ایسی صدا کہیں نہیں سُنی تھی۔ یہاں تک کہ چڑیا گھر میں بھی نہیں۔

کیمسٹ جو جڑی بوٹیوں کے چکر میں گھنے جنگل کی سیر اکثر کیا کرتا، کہنے لگا۔ "وہاں ایک روز جھاڑیوں میں سے بالکل ایسا ہی چہرہ جھانک رہا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چہرہ کسی درمیانے سائز کے چوپائے کا تھا یا بہت بڑے پرندے کا، لیکن اس پر عینک نہیں تھی۔"

شیطان دوہراتے کہ مشکوک موجودہ مشینی دور کی بے چینی، افراتفری، چھینا چھپٹی

کی نمائندگی بلکہ وکالت کرتا ہے۔ وہ دن گئے جب طلوعِ آفتاب دیکھ کر انسان خوش ہوا کرتا کہ ایک اور دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اب تو جگمگاتی خوشگوار صبح کا استقبال مسرّت کی بجائے چڑچڑے پن سے کیا جاتا ہے۔ ویسے ہر بُرائی کا ذمّہ دار مشینوں کو بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ مشینیں نہ ایک دوسری سے بات کر سکتی ہیں نہ انسان کو ورغلا سکتی ہیں۔

شیطان کو ایک دفعہ یہ وہم بھی ہوا کہ مشکوک کا چہرہ آسیب زدہ سا لگتا ہے۔ پھر فوراً تصحیح کر دی کہ زدہ کو منسوخ کرکے صرف آسیب سُنا جائے۔

مگر مقصود گھوڑا یہی کہتا کہ بار بار دیکھو تو مشکوک نارمل سا نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل مقصود گھوڑے کو ہر واقعہ، ہر نظارہ، ہر جاندار۔۔۔۔ سب کچھ نارمل معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھی نارمل سمجھتا ہے۔

دُھند طرح طرح سے آتی۔۔۔۔۔۔۔۔

جھاڑیوں میں سے دُھنکی ہوئی روئی کا سا بھپکا نکلتا۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا،

چوتھا۔۔۔پہلے چوٹیاں چھپتیں۔ پھر درختوں کے جھُنڈ، کیمپ کی سڑکیں، مکان اوجھل ہو جاتے اور یوں لگتا جیسے بالکل سپاٹ میدانوں میں بیٹھے ہیں۔

یہی دُھند جب نیچے سے اُٹھتی تو وادی کئی کئی دن غائب رہتی۔ تب ایسی گھٹن محسوس ہوتی کہ چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر لیا ہو۔

کبھی یہ اُوپر کے گھنے جنگلوں سے اترتی۔ ڈھلان پر پھسلتی ہوتی جاتی حتّٰی کہ اتنی بڑی وادی سمٹتے سمٹتے ذرا سی رہ جاتی۔ یا پھر نشیب میں پہنچ کر اس طرح موتی بکھرتی کہ وادی کے کئی حصّے کر دیتی۔ ایک طرف چھوٹا سا گاؤں اکیلا رہ جاتا۔ ادھر چند باغ اور کھیت۔ یہاں آپس میں ملتی ہوئی دو شفاف ندیاں۔ تو وہاں صرف بل کھاتی سڑک اور گہرے کھڈ۔

جونہی دُھند نظر آتی ہم فوراً روشن دان کھڑکیاں دروازے بند کر دیتے۔ لیکن کمروں میں سب کچھ دھندلا ہونے لگتا۔ آہستہ آہستہ ہم میں سے ہر ایک بھاپ سے گھرا ہوا تنہا جزیرہ بن جاتا۔ قمقمے جلاتے تو روشنی ایک ڈیڑھ فٹ سے آگے نہ جاتی۔ گراموفون یا ریڈیو بجاتے تو یہ پتہ نہ چلتا کہ آواز کس سمت سے آرہی ہے۔ یہ کیفیت دیر تک رہتی تو کبھی کبھی دُھند میں مبہم سے ہیولوں کا دھوکہ ہوتا۔ پھر یوں لگتا جیسے وہ محض سائے نہیں سچ مچ کے پیکر ہوں۔ ان پر طرح طرح کے وہم

ہوتے۔

ایسے موسم میں زیادہ وقت اپنے اپنے کمروں میں گزرتا جو کیبن جتنے چھوٹے تھے۔ مشکوک آدھمکتا۔ اس کی متواتر موجودگی سے ہماری چھ سات فیصد افسردگی ستّر اسّی کے ہندسوں کو چھونے لگتی۔ اور کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کسی نے جی بہلانے کی کوشش کی تو اس کی طرف 'تجھے اٹکھیلیاں سوجی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔۔۔' کے انداز میں دیکھنے لگے۔

جب دُھند اور بادل کئی روز تک نہ چھٹے تو لوگ تنگ آکر چھتری، برساتی، چوڑے ہیٹ، جو کچھ ملتا لے کر سڑکوں پر نکل آتے۔

گہری دُھند میں صرف تین چار فٹ تک دکھائی دیتا۔ چلتے چلتے دفعتاً شکل سامنے آ جاتی اور فوراً ہی دُھند میں غائب ہو جاتی۔ نیم تاریک کہریلی فضا میں قسم قسم کے کے چہرے سامنے آتے جن پر مختلف اظہار ہوتے۔

کوئی ایسی نگاہوں سے تکتا ہوا گزر جاتا جن میں شک وشُبہ ہوتا اور افسوس بھی کہ ایک اور انسان کیوں نظر آ گیا۔ اس کے بعد ہنس مکھ سی صورت جھلک دکھا کر خوش آئند اثر چھوڑ جاتی۔ پھر کسی کے نظریں بچا کر ٹیڑھی سمت میں نکل جانے یا

سامنا ہوتے ہی نگاہیں موڑ لینے پر حیرت ہوتی۔ کوئی اتنا اداس اور فکر مند دکھائی دیتا کہ اس پر ترس آتا۔ ذرا دیر میں ایک بے باک نڈر سا بانکا سیٹی بجاتا گزر جاتا۔ کبھی پل بھر کے لیے ایسی من موہنی شکل سامنے آتی جسے دوسری دفعہ بلکہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا۔ لیکن دُھند ہر ایک کو چھپا لیتی۔

شروع شروع میں یہ عجیب سا لگتا۔ پھر خیال آیا کہ یہ نظارہ اس پہاڑ تک محدود نہیں۔ ازل سے اب تک چھائی ہوئی دُھند میں بھی یہی پیش آتا ہے۔

زندگی کی غیر واضع راہوں میں جب دُھندلاہٹ کم ہوتی ہے تو طرح طرح کی شبیہوں سے واسطہ پڑتا ہے۔۔۔ کوئی بھولا بھالا، سہما سہما سا، چپ چاپ گُزر جاتا۔ کوئی مُسکراتا، ہنستا خوش باش، ہر ایک سے دوستی کو تیار۔ تو کون مطلب پرست گھاگ، مکر اور چالاکی کی تصویر، دغابازی پر تُلا ہوا۔ اور پھر کوئی نک چڑھا، مغرور اور اس کا تکبّر۔۔۔ یہ اور دوسرے آتے ہیں اور باری باری اوجھل ہو جاتے ہیں۔

نحیفہ نے چاء پر بلایا۔ وہاں ایک میز پر ناشتے سے ڈنر تک کے سارے لوازمات سجا

رکھے تھے۔ کسی چیز کی کمی تھی تو چاء کی۔

مقصود گھوڑا دیر سے پہنچا۔ وہ پیاسا تھا یا بھوکا، یا دونوں۔ اِدھر اُدھر جھانک کر سامنے کھڑی ہوئی لڑکی سے بولا: ”محترمہ کہیں چاء دانی تو نہیں دیکھی؟“

بڑی ہو، ہم عُمر یا چھوٹی۔۔۔ اس کے لیے ہر لڑکی محترم ہے۔ اصلی وجہ صنفِ نازک کا احترام نہیں، بلکہ وہ نام بھول جاتا ہے۔

اس نے چاء دانی اُٹھائی تو وہ ہلنے لگی کیونکہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

سادی سی نحیفہ نے دیدہ زیب بھڑکیلے میک اپ کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی ملغوبہ کی طرف دیکھا اور مقصور گھوڑے سے سرگوشی کی۔ حسن و جمال کے رعب سے تھرّا رہے ہو کیا؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے چاء دانی قابو کرتے ہوئے کہا۔ ”کون سا حُسن و جمال؟ اور کیسا رُعب؟ ابھی ابھی ایک سو ایک ڈنٹر نکال کر آیا ہوں۔ بازو ذرا تھکے ہوئے ہیں۔“

اس کی ورزش پر سب کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ شروع ہی سے اس کا اصول رہا ہے کہ زندگی میں کچھ نہ کرو، اور کچھ نہ کرنا بھی آہستہ آہستہ کرو۔

"یعنی تم لوگ چاء سے پہلے بھی کسرت کرنے لگے ہو؟" مشکوک نے فوراً پوچھا۔

مشکوک کو ہر اُس جنبش پر جس سے سانس چڑھتا ہو اعتراض تھا۔ وہ بار بار کہتا کہ انسان اور خصوصاً انٹلکچوئل آدمی کو جسمانی کسرت نہیں ذہنی ورزشی زیب دیتی ہے۔

اس موضوع پر اکثر بحث ہوا کرتی۔۔۔۔

وہ تمہید باندھتا کہ "سست جانور اور پرندے مثلاً ہاتھی، کچھوا، گدھ وغیرہ طویل عُمریں پاتے ہیں۔ لیکن جو زیادہ پھُرتیلے ہیں جیسے ہرن، شکرا وغیرہ ان کی زندگی مقابلتاً کم ہے۔ سادھو سنیاسی بھی مدّتوں سے تلقین کر رہے ہیں کہ جو دنیا میں آتا ہے اس کے سانسوں کی تعداد مقرر ہو چکی ہے۔ چنانچہ سانس آہستہ آہستہ لیے جائیں تو زندگی طویل کی جا سکتی ہے۔

اگر اُچھل کود سے سانس چڑھتے رہے تو یہ ٹوٹل قبل از وقت ختم ہو جائے گا۔ اور جوانی میں تو ورزش برداشت کی جا سکتی ہے، بعد میں نہیں۔ تبھی پہلوانوں کا بڑھاپا اکثر خراب ہوتا ہے۔"

"اگرچہ مجھے ابھی تک بڑھاپا نہیں ہوا۔" ڈاکٹر بتاتا "لیکن سب جانتے ہیں کہ بڑھاپا

خود ایک بیماری ہے۔ اس عمر میں پہلوانوں اور غیر پہلوانوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہونا چاہیے۔ بڑھاپا تو ایکٹروں ایکٹرسوں کا بھی اچھا نہیں ہوتا حالانکہ وہ ورزش نہیں کرتے۔ ان کا انحطاط شاید پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔"

"ایکٹر تو خیر داڑھی مونچھ لگا لیتے ہیں۔" کیمسٹ کہتا۔ "لیکن ایکٹرسوں کی عُمر اس لیے زیادہ لگتی ہو گی کہ انہیں قسم قسم کے کیمیکل تھوپنے پڑتے ہیں جو چہرے کی نرم جلد کو کھردرا کرتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ جِلد کی جگہ کچھ اور چیز بن جاتی ہے۔"

انجنیئر بھی مشکوک سے اختلاف کرتا۔ "مشینری کو ٹھیک حالت میں رکھنے کا پہلا اُصول یہ ہے کہ اسے مسلسل استعمال کیا جائے۔ اس طرح دیکھ بھال ہو گی اور حفاظت بھی۔ لہٰذا انسانی جسم سے لگاتار کام نہ لیا جائے تو گھُن لگ سکتا ہے۔"

"اگر سانس لیتا ہوا جسم اور بے جان مشینری ایک جیسے ہیں تو ان پر زائد بوجھ ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔" مشکوک کہتا۔ "فالتو وزن کھینچ کھینچ کر کوئی بھی مشین رہ جائے گی۔ جیپ کے پیچھے ٹریکٹر کا ٹریلر باندھے پھر وتو کیا جیپ کا انجن چُست ہو کر زیادہ دیر چلے گا؟ رہ گئے تمہارے کھیل۔۔۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بالغ اور سمجھدار نوجوان ہر وقت اپنے سے کہیں چھوٹی گیندوں کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہیں؟ فٹ بال ہو، بیس بال یا والی بال یا کرکٹ، ہاکی، سکواش وغیرہ کی گیندیں۔

بھاگ بھاگ کر انہیں ٹھوکروں، مکّوں اور بَلّوں سے یُوں دبادب پیٹتے ہیں کہ تفریح کی بجائے افسوس ہوتا ہے۔۔۔"

"چچ چچ چچ۔۔۔۔۔ حد ہو گئی۔" فلاسفر سر ہلاتا۔ "گیند کو پیٹنا ہی تو نہیں ہوتا۔ اصلی چیز ہے مہارت کہ کس زاویے پر، کتنی رفتار اور کیسے انداز سے گیند کو پھینکنا ہے۔ مقابلہ حریفوں سے ہوتا ہے جس کے لیے ہمّت اور پھُرتی کی بھی ضرورت ہے۔"

"بیس بال اور کرکٹ میں بیٹسمین ہٹ لگاتے ہی دوڑ جاتا ہے۔ جو مار کر بھاگ جائے اُسے تم ہمّت والا کہتے ہو؟" مشکوک پوچھتا۔ "اور اگر تمہارا یہ دعوی صحیح مان لیں کہ فلسفہ قدیم ترین علم ہے تو اپنے دلائل سے مجھے قائل کیوں نہیں کر سکتے؟"

"ایسے سوال کا جواب صدیوں پہلے دیا جا چکا ہے۔" فلاسفر بتاتا۔ "جب ایتھنز میں تمہاری قسم کے لوگوں نے سقراط سے پوچھا کہ 'تم جو اپنے آپ کو ہم سے عقلمند سمجھتے ہو، بتاؤ کہ وہ کیا ہے جو تمہیں معلوم ہے اور ہمیں نہیں؟' اس نے کہا کہ 'فرق صرف اتنا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔"

"اور جہاں تک تمہاری اس عمر بڑھانے والی تھیوری کا تعلق ہے، سو اگر زندگی کو نوّے پچانوے سال تک کھینچ دیا جائے تو اس طرح جوانی کا دور طویل نہیں ہو گا بلکہ بڑھاپا لمبا ہوتا جائے گا۔ لٰہذا یہ گننے کی بجائے کہ زندگی کے سال کتنے ہیں یہ جاننا چاہیئے کہ ان برسوں میں زندگی کتنی ہے۔"

مقصود گھوڑا جو ان دِنوں ورزش کی طرفداری کرنے لگا تھا، کہتا۔ "غالباً یہ شعر تو سُنا ہو گا

لق لق نصیبِ خُفتہ کو کیوں رو رہے ہیں آپ

اپنے جگر کے فعل کو بیدار کیجئے!

ظاہر ہے کہ بھاگ دوڑ سے اعضائے رئیسہ ورکنگ آرڈر میں رہتے ہیں۔ بلکہ اعضائے غریبہ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اور سب کو پتہ ہے کہ ذہنی تندرستی کا جسمانی صحّت سے گہرا تعلق ہے۔"

لیکن مشکوک پر اتنا سا اثر نہ ہوتا۔ وہ جس کان سے سُنتا اُسی سے باہر نکال دیتا۔

جب بھی وہ آتا تو ہمارے کھیل کود کے وقت۔۔۔ تاکہ مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے۔

ملازم چاء کے برتن اُٹھاتا تو اسے یاد آتا کہ یہ چاء گرم نہیں تھی۔ دوبارہ منگواتے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ بھی نیم گرم لگتی۔ وہ بتاتا کہ دودھ ٹھنڈا ہو گا۔ دودھ گرم کراتے تو شاید شکر سرد رہ جاتی۔ ساتھ ہی کھڑکی سے باہر جھانکتا رہتا۔ اس انتظار میں کہ اندھیرا خوب گہرا ہو جائے اور آج کسی ورزش کا امکان نہ رہے۔

پھر کسی کتاب سے سُناتا۔۔۔ "وزن پر مُستقل کنٹرول ناممکن ہے۔ میل بھر پیدل چلو تب تقریباً تین سو کیلوری بھسم کی جا سکتی ہیں، یعنی فقط نصف اونس وزن کم ہو گا۔ آدھ سیر وزن گھٹانا ہو تو بتیس تینتیس میل اور ایک سٹون کے لیے لگاتار ساڑھے چار سو میل پیدل چلنا ہو گا۔ اور ورزش چھُٹ گئی تو صرف گھٹائے ہوئے سیر فوراً واپس مل جائیں گے بلکہ وزن پہلے سے بھی بڑھ سکتا ہے۔" یا یہ کہ "دودھ، مکھن پر تنقید کی جاتی ہے کہ بھاری اور سُست کرتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ چھوٹا سا ناتواں بچھڑا گائے کے خالص دودھ سے ایسا تندرست و توانا بیل بنتا ہے جو دن بھر ہل چلانے کے بعد بھی نہیں تھکتا۔"

"وزن اور کیلوری وغیرہ کی باتیں فربہ لوگوں سے کرنی چاہئیں۔" کیمسٹ تنگ آ کر ٹوکتا۔ "یہاں ہمارے ساتھ نہ کوئی موٹا رہتا ہے نہ آرام طلب۔"

نچلے قصبے میں کھیلوں کے میدان تھے۔ کام سے واپسی پر ہم سیدھے وہاں جانے

لگے۔ لیکن اُسے پتہ چل گیا۔ اب وہ سہ پہر کو وہیں منتظر ملتا اور فوراً کھینچ کر کیفے میں لے جاتا جہاں کسی نہ کسی طرح شام کرادیتا۔ چنانچہ پروگرام ترک کرنا پڑا۔

مقصود گھوڑے نے بتایا کہ سینما کا مینجر اکثر شکایت کیا کرتا ہے کہ جن جن کو فلمیں اُدھار دکھانی پڑیں ان میں سے کسی نے بھی قرض نہیں چُکایا بلکہ ایک ایک کر کے روپوش ہوگئے۔ ہیں تو وہ یہیں لیکن سینما نچلے قصبے میں دیکھتے ہیں۔

اس مشورے کو آزمایا گیا۔ پہلی تاریخ کو چندہ اکٹھا کر کے مشکوک سے کہا کہ اتفاق سے ہمیں کئی مہینوں کا سفر خرچ اکٹھا مل گیا ہے۔ اسے ضرورت ہو تو ایک ماہ کے لیے کچھ اُدھار دے سکتے ہیں۔ اس نے فوراً روپے لے لیے۔

مہینہ گزر گیا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اسے یاد نہ رہا ہو، اگلے مہینے پھر قرض دیا۔ تیسرے مہینے اُدھار لوٹانے یا روپوش ہونے کی بجائے جب اس نے اشارتاً یہ ظاہر کیا کہ تیسری قسط کا منتظر ہے تو اس پروگرام کو بھی منسوخ کرنا پڑا۔

کبھی کبھی فلاسفر اس کی طرفداری کیا کرتا۔ ”کچھ بھی کہہ لو۔ آدمی دلچسپ ہے۔“

ایک دن شیطان نے اعتراض کیا۔ ”پتہ نہیں تمہارے لیے کیا دلچسپ ہے، کیا

نہیں۔ شاید یہ تمہارے اُن دلچسپ لوگوں میں سے ہو جنہیں دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ آج ہی ان کی الوداعی پارٹی ہونی چاہیئے۔ جن سے ملنا پڑے تو ہیلو کے ساتھ خداحافظ بھی منہ سے نکل جاتا ہے۔ جو کبھی عبادت کریں تو اصل نیّت یہ ہوتی ہے کہ گڑگڑا کر کسی کے لیے بُری دُعا مانگ سکیں۔ جن کی تعریف کرنا ان کے IMAGE کو تباہ کرنا ہے۔"

"اگرچہ ابھی تک مَیں نے اس کا بلڈ پریشر چیک نہیں کیا۔" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن یا تو بہت زیادہ ہو گا یا بالکل کم۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی یہ لگتا ہے کہ یا تو یہ بہت زیادہ سو کر آیا ہے یا رات بھر نہیں سویا۔"

"لیکن اس کی اس کوشش کو کسی نے نہیں سراہا۔" فلاسفر مُسکرانے لگا۔ "کہ قبل از مسیح، بعد از مسیح کی طرح یہ سب کے خیالات نظریات کو آہستہ آہستہ قبل از مشکوک، بعد از مشکوک میں تبدیل کر رہا ہے۔"

"مگر اس کی سب سے بڑی خوبی سب بھول جاتے ہیں۔" انجنیئر نے کہا۔ "یہ کہ اس کی جدائی کتنی خوشگوار ہے۔ جب یہ رخصت ہوتا ہے تو یہی بوسیدہ نیم تاریک کمرے کیسے جگمگا اُٹھتے ہیں۔"

قصور ہمارا بھی تھا۔ پہلے پہل تو مشکوک کی باتیں آدھی سُنا کرتے آدھی نہیں۔ جب برسات شروع ہوئی تو کھیل کود، سیر سپاٹے پر اثر پڑا اور ہماری مدافعت بھی گھٹنے لگی۔

کبھی کبھی یہ شُبہ ہوتا کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اگر صحیح نہیں تو شاید غلط بھی نہ ہو۔

پھر مسلسل بارش اور مسلسل مشکوک نے ورزش بالکل ختم کر دی۔ کام سے واپس آ کر تاش کھیلتے، یا کیرم، شطرنج، یا کچھ بھی نہیں۔

ورزش چھوڑنے کے بعد جو کچھ ہوا اُسے چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

سب سے پہلے طمانیت کا دور آیا۔ کسی کو دوڑتے بھاگتے یا پہاڑ پر چڑھتے دیکھتے تو اطمینان ہوتا کہ کم از کم ہم اس کی طرح سانس چڑھا کر عُمر کم نہیں کر رہے۔ نہ بھوک بڑھا کر مٹاپے کو دعوت دے رہے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ایسا تھا جیسے چاروں طرف خلاء ہی خلاء ہو۔۔۔ اس کی مثال کچھ یوں

دی جا سکتی تھی کہ دن بھر موٹر چلا کر شام کو منزل سے فقط چند فرلانگ پہلے "ہالٹ! نہر ٹوٹ جانے سے سڑک زیرِ آب ہے" کا بورڈ نظر آ جائے۔ یا کسی جاسوسی فلم کے آخر میں جب پیچیدہ گتھی سلجھنے میں چند منٹ رہتے ہوں تو یکایک بجلی فیل ہو جائے اور فیل رہے۔ یا کسی دلچسپ رومانی ناول کے آخری دس بارہ صفحے غائب ملیں۔ چنانچہ ہم کھوئے کھوئے سے رہتے اور غالباً دوسروں کو دیسی فلموں کے ایکٹر معلوم ہوتے ہوں گے۔ بار بار اپنے بازوؤں، کندھوں کے پٹھوں کو ٹٹولتے جو ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ چاروں اطراف مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک روز تو بہت ڈرے، کیونکہ شوپنہار کی تحریریں پسند آنے لگی تھیں۔ تیسری منزل غور و فکر کی آئی۔ ایسی کہ جب سوچ چکے تو پھر سوچنے لگتے۔۔۔۔ زندگی کے نادر موقعوں کے متعلق جو گنوا دیئے۔ اور وہ موقعے جو ابھی تک نہیں گنوائے۔ یہاں تک کہ ان موقعوں کے بارے میں بھی فکر کرتے جو ابھی پیش ہی نہ آ سکے۔

غلطیاں، بھول چوک، زیادتیاں۔۔۔۔ دوسروں کی اور اپنی۔۔۔۔ بار بار یاد آئیں۔

شیطان ان بارہ روپے پندرہ آنوں یا پندرہ روپے بارہ آنوں کا اکثر ذکر کرتے جو انہوں نے کسی پڑوسی کے برتھ ڈے پر خرچ کیے تھے۔ لیکن اس نے ان کی کسی

سالگرہ کا نوٹس نہیں لیا۔ یہ واقعہ نو دس برس پہلے کا تھا۔ کیمسٹ عہد کرتا کہ میدانوں میں واپس پہنچ کر اس شخص کو ضرور زدوکوب کرے گا جس نے اس کے امریکن لہجے کی کئی مرتبہ نقل اتاری۔ افسوس تھا تو یہ کہ اپنی شرافت یا سُستی، یا دونوں کی وجہ سے وہ اب تک خاموش کیوں رہا۔ ڈاکٹر بار بار ان کتابوں کا ذکر لے بیٹھتا جنہیں مانگتے ہوئے اس کے ہم جماعتوں نے وعدہ کیا تھا کہ پڑھ کر واپس کریں گے لیکن لوٹانے کی بجائے کباڑیوں کو بیچ دیں، جن سے ڈاکٹر کو دوبارہ خریدنی پڑیں۔ فلاسفر اپنے اس جونئیر کی شکایت کیا کرتا جو یوں تو چہیتا دوست بنا ہوا تھا لیکن محض ہیرا پھیری سے اس نے اپنی تنخواہ زیادہ کرا لی تھی۔ ویسے یہ جونئیر کئی برس پہلے ملازمت چھوڑ چکا تھا۔

ڈاکیہ نظر آتا تو اندیشہ ہوتا کہ وی پی لایا ہو گا یا بیرنگ خط۔ حالانکہ وہ عموماً رجسٹری لاتا۔ ایک دفعہ تو منی آرڈر بھی لایا۔ ڈاک آتی تو لمبا سا لفافہ دیکھتے ہی یقین ہو جاتا کہ اس میں کوئی بِل ہے جو اب تک ادا نہیں کیا۔ پولیس کا سپاہی دکھائی دیتا تو شُبہ کرتے کہ کچھ پوچھنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جبکہ وہ اپنی مقررہ گشت پر

ہوتا۔

دوسروں سے ملنے میں جھجک محسوس ہوتی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی کام سے آئے ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے بینک کے مینجر سے (جو کئی مرتبہ ہمارے ہاں آ چکا تھا) ملنے نکلے تو یکایک مقصود گھوڑے کو اپنی بیاض یاد آ گئی جسے نکال کر اس نے صفحے اُلٹے اور بولا۔

"انشاء خیال محض ہے ہر گز نہ بھولیو!

ہر گز کسی کے ساتھ نہ ڈالے خُدا غرض

سید انشاء اللہ خاں انشاء سنہ ۱۷۵۶ سے ۱۸۱۷ تک۔۔۔۔۔۔"

اس پر یاد آیا کہ بینک سے تو کبھی کبھی قرض لیتے رہے ہیں۔ اگرچہ فی الحال مقروض نہیں تھے لیکن راستے ہی سے واپس آ گئے۔

پھر طرح طرح کے وسوسے مسلط رہنے لگے۔ کبھی آدھی رات کو اچانک خیال آتا کہ پانی کا نلکا بند کر دیا تھا یا نہیں؟ کچن کا بلب اب تک تو نہیں جل رہا؟ جو لفافے لیٹر بکس میں ڈالے تھے ان پر ٹکٹ کس نے لگائے تھے؟ کبھی فکر لاحق ہو جاتا کہ رات گئے جو عجیب و غریب آواز آتی رہی وہ کہیں بھیڑیے کی تو نہیں تھی؟

بھیڑیے بھونکتے ہیں یا کچھ اور کرتے ہیں؟ کسی کو کاٹ لیں تو وہ پاگل تو نہیں ہو جاتا اور جو چھت سے لٹکا ہوا بلب ہل رہا ہے، شاید زلزلہ آنے والا ہو۔ یہ علاقہ زلزلوں کے لیے مشہور ہے۔

اِن ہی دنوں سیلاب سے دو پُل ٹوٹ گئے۔ ٹریفک بند ہوا اور باہر سے چیزیں نہ آئیں تو کیمپ میں سگریٹ، چاکلیٹ، شکر، وغیرہ کو راشن کر دیا گیا۔ اس پر شیطان نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس افسردگی، بیزاری کو بھی راشن کیا جائے۔ یعنی فی شخص روزانہ ایک گھنٹہ۔۔۔ اور بیزار رہنے کے لیے کوئی وقت مقرر کر لیں۔ اس سے پہلے یا بعد میں بیزار ہونے والے پر جرمانہ کیا جائے۔ یہ تجویز سب نے پسند تو کی لیکن پھر چُپ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ہم اور بھی وہمی ہوتے گئے۔ اپنی صحت پر شُبہ کرنے لگے، بلکہ دوسروں کی صحت پر بھی۔ اور پھر وہ حد آئی جب ہم نے دن میں سونا شروع کر دیا۔

اب اس سے زیادہ زوال ناممکن تھا۔ اور چوتھی یعنی فائنل سٹیج لازمی تھی!

اس کی بشارت فلاسفر نے ناشتے سے انکار کر کے دی۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ کرہِ ارض اور کولہو کے بیل والا خواب پھر نظر آیا ہے۔ جب یاد دلایا کہ اس پر وہ خوش ہوا کرتا ہے تو سر ہلا کر بولا۔۔۔ "رات بیل ایک سمت میں گردش کر رہا تھا

اور دنیا دوسری طرف گھوم رہی تھی۔ اب تک یوں کبھی نہیں ہوا۔"

"دنیا صحیح رُخ میں گھوم رہی تھی یا بیل؟" انجنیئر نے دریافت کیا۔

"یہ یاد نہیں رہا۔"

"اگرچہ خواب اور تعبیر دونوں غیر سائنٹفک چیزیں ہیں۔" انجنیئر بولا۔ "ممکن ہے کہ یہ ٹیلی پیتھی کی لہریں ہوں جنہیں کسی تبدیل کی توقع میں محسوس کیا گیا ہو۔ کیمپ جیسی جگہ میں اور تو کیا بدل سکتا ہے، شاید مشکوک سے جدائی قریب ہے۔"

ہم ہی نہیں دراصل مشکوک کو وہاں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ پہلی وجہ اس کی شر پسندی اور منافقت تھی۔ دوسری وجہ بھی یہی ہو سکتی تھی۔ اور تیسری، چوتھی پانچویں بھی۔

لوگ اکثر شکایت کرتے کہ وہ جو بھاری سا گِدھوس آپ کے ہاں آیا کرتا ہے اس نے بلاوجہ فلاں کو فلاں سے لڑوا دیا۔ اس کی اس سے ناچاقی کرا دی۔ یہ کر دیا، وہ کر دیا۔

سینما کے مینجر کو گلہ تھا کہ اس کے عملے میں مشکوک نے پھوٹ ڈلوائی۔ ٹکٹ فروخت کرنے والے کو اُکسایا کہ تمہیں سب پر اپنی چوہدراہٹ جمانی چاہیے۔

جب تک پورے ٹکٹ نہ بِکیں کھیل شروع نہ ہونے دیا کرو۔ اِدھر پروجیکٹر والے کے کان میں پھونک دیا کہ ٹکٹ مشین سے بھی خریدے جاسکتے ہیں لیکن تم نہ چاہو تو فلم کوئی بھی نہیں چلا سکتا۔ گیٹ کیپروں اور چوکیدار کو الگ ورغلایا۔ ہیڈ ماسٹر پریشان تھا کہ اس کے دو ٹیچر اگلے گریڈ کے لیے دبادب درخواستیں دے رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے میری قابلیت زیادہ ہے۔ دوسرا کہتا ہے میرا تجربہ زیادہ ہے اور عرضیوں کے ڈرافٹ مشکوک لکھواتا تھا۔ تحصیلدار نے شکوہ کیا کہ مشکوک نے اس کے پٹواری اور گرداور کا آپس میں جھگڑا کرادیا۔ اور دونوں ہوٹلوں کے مینجر جو اچھے خاصے دوست تھے، ان میں کاروباری رقابت شروع کرادی۔ حالانکہ ایک ہوٹل نچلے قصبے میں تھا اور دوسرا اگلے پہاڑ پر۔

کبھی کبھی مقصود گھوڑا بلند آواز سے سوچا کرتا کی بحیثیت ایک گینڈ اویٹ (جسے وہ ہیوی ویٹ سے برتر سمجھتا) مشکوک کو کسی اور طرح کا ہونا چاہئے تھا۔ اب تک تو یہی سُنا ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگ نہ تو کسی سے لڑ سکتے ہیں، لڑائی ہو جائے تو تیزی سے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا انہیں صُلح پسند اور خوش مزاج رہنا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں پتہ نہیں کس جگہ کسر رہ گئی۔ کیونکہ یہ پلے ہوئے آدمیوں کی نمائندگی ہرگز نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے رویّے سے بعض اوقات تو ایک فرسٹ کلاس ساس معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس گیلے دھندلے موسم سے دور رہنا ممکن نہیں، لیکن

اس آدمی سے فاصلہ رکھا جا سکتا ہے۔

پہل بھی مقصود گھوڑے نے کی۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ کسی کباڑیے سے یوگا پر پھٹی پُرانی کتاب خرید لایا اور تعریفیں شروع کر دیں کہ جب موسم یا مشکوک کی وجہ سے آؤٹ ڈور ورزش ممکن نہ ہو تو بنی نوع انسان بلکہ بنی نوع حیوان تک کی سب سے بڑی ضرورت یوگا ہے۔ جس سے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ باقی ماندہ طبق بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ فلاسفر نے اعتراض کیا کہ اس میں جو سر کے بل کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی سراسر توہین ہے۔ ڈاکٹر نے تائید کی۔۔۔۔۔ "اگرچہ مجھے ابھی تک یوگا نہیں ہوا اور HORIZONTAL ہو کر ڈنٹر وغیرہ نکالنے میں کوئی ہرج نہیں، کیونکہ ڈارون کی تھیوری کے مطابق پہلے ہم اسی پوز میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر سر کے بل تو کوئی جانور یا پرندہ کھڑا نہیں ہوتا۔ یوں اُلٹے ہو کر ورزش کرنے سے سارے جانداروں کی پوزیشن آکورڈ ہو سکتی ہے۔"

باتیں ہوتی رہیں لیکن مقصود گھوڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کانوں کا کنکشن آف کر چکا تھا۔ چند دنوں کے بعد جب وہ یوگا کی مشق نمبر تین کرتے ہوئے سر کے بل ہو کر سارا خون اپنے دماغ میں جمع کر رہا تھا تو ملازم چاۓ لایا۔ اس نے وہیں

سے ڈانٹا کہ سر نیچے پاؤں اوپر کر کے چاء کے برتن اُلٹے مت پکڑو۔ کسی نے بتایا کہ برتن سیدھے ہیں اور ملازم بھی جس کے قدم زمین پر ہیں۔ کوئی چینی اُلٹی ہے تو وہ ہے مقصود گھوڑا۔ لیکن تب تک ذہن میں اتنا خون اکٹھا ہو چکا تھا کہ اس نے ایسی الٹی چاء پینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پھُول آسن یا تتلی آسن یا شاید پنچھی آسن اختیار کرنے کے لیے اپنا دہنا ٹخنہ کھینچ کر گردن کے پیچھے رکھنے کی کوشش کی۔ بائیں پاؤں کا انگوٹھا کمر سے چھوا کر دہنے بازو سے لگایا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سر کے پیچھے لے جا کر دایاں کان پکڑا۔ پھر کچھ اور کیا۔ اس کے بعد کچھ اور۔

دفعتاً درد کی شدید لہر آئی اور وہ بالکل جُڑ کر رہ گیا۔ اصلی حالت میں آنے کی بڑی کوشش کی لیکن جیسے سارے اعضاء کو قفل لگ چُکا تھا۔

شیطان دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تعریف کی کہ اس طرح وہ کافی ہینڈسم لگتا ہے۔

کاش کہ وہ سدا اسی حالت میں رہا کرے۔

جب درد بڑھا تو اس کے ہاتھ پاؤں کھینچے مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر گُدگُدی کی

گئی۔ اس نے قلابازیاں سی لگائیں جن کے بعد اعضاء اپنے پرانے مقامات پر پہنچے۔ لیکن کئی روز اُسے ہسپتال میں لیٹنا پڑا۔

موٹر سائیکل کو اوور ہال کرانے قصبے کے ورکشاپ میں چھوڑ کر پیدل آرہا تھا کہ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد مشکوک خوانچے والے سے جلیبیاں کھاتا ہوا ملا۔ مجھے ہانپتے ہوئے دیکھ کر اس نے یوں گھورا جیسے میں نے عمداً ورزش کا ارتکاب کیا ہو۔ پیچھا چھُڑانے کے لیے کہنا پڑا کہ اوپر جاتے وقت آئندہ لاری میں لفٹ لیا کروں گا۔

پیدل چڑھائی جاری رہی۔ اتنے طویل جمود کے بعد آج اچھی طرح سانس چڑھا تھا۔ خوب پسینہ آیا۔ ہاتھ پاؤں کھُلے اور پھر وہی پرانی چُستی اور بشاشت آ گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ اتنے دنوں کی کاہلی کے بعد اب جسم کو بھی باقاعدہ اوور ہالنگ کی ضرورت ہے چنانچہ اسی سہ پہر سے باقاعدہ ورزش شروع کر دی۔

مقصود گھوڑے کو یوگا سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچا ہو گا۔ کیونکہ وہ اب روزانہ کسرت کرنے لگا تھا۔

جب مشکوک سے کسی نے مُخبری کی تو وہ نحیفہ کو ساتھ لے کر موقع پر پہنچا۔ دیکھا

کہ

مقصود گھوڑا کھلم کھلا سڑک کے کنارے ڈنڈ نکال رہا ہے۔۔۔۔

”اکتالیس، بیالیس، تینتالیس، ہیلو! کیا حال ہے؟“ اس نے گنتی جاری رکھتے ہوئے نحیفہ کی طرف دیکھا۔ ”چھیالیس، سینتالیس، اڑتالیس، آج تو بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اکاون، باون، بلا کا نکھار ہے۔ چوّن، پچپن، عجب دلکشی ہے۔ ستاون، اٹھاون، غالباً شہر سے میک اپ کا سامان پہنچ گیا ہو گا۔ باسٹھ، تریسٹھ، کئی روز سے تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔ چھیاسٹھ، سڑسٹھ، سچ مچ، انہتر، ستر، اکہتر، نہ جانے تم کہاں، تہتر تھیں۔ پچھتر چھہتر، جا کیوں رہی ہو؟ کہیں جلد پہنچنا ہے کیا؟ اسّی، اکیاسی، اچھا! تراسی، چوراسی، پچاسی۔۔۔۔“ اور مطلوبہ تعداد مکمل کرنے سے پہلے اس نے مشکوک کی جانب دیکھا تک نہیں۔ بعد میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر بیٹھکیں شروع کیں جنہیں گنتے ہوئے گفتگو کرنی چاہی۔ لیکن بیسویں ہی بیٹھک پر دیکھا کہ مشکوک آہستہ آہستہ جا رہا ہے۔

اس چوتھی سٹیج کو حکومت آپا کے اچانک آجانے سے بھی کافی مدد ملی۔

پہلی نگاہ کی محبت کے متعلّق سُنا کرتے تھے لیکن حکومت آپا کو مشکوک سے پہلی

نظر

پر چڑِہو گئی۔

کیمپ کے سینما میں انگلش پکچر آتی تو اس کا اوٹ پٹانگ سا ترجمہ بھی کیا جاتا جو بطور عُرف ساتھ لگتا۔ جب ہالی وُڈ کی رومانی فلم MOON OVER MIAMI کو 'عرف میانمر کا چاند' بنا کر جگہ جگہ اشتہار لگائے گئے تو ہم بھی میٹنی پر اپنے پہنچے۔ ٹکٹ لیتے وقت شیطان نے اشارہ کیا۔ ”مجھے جو نظر آرہا ہے کیا تمہیں بھی نظر آرہا ہے۔“ لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک شکل دکھائی دی، ہو بہو وہ حکومت آپا کی نقل۔

قریب گئے تو قیاس درست نکلا۔ ملتے ہی شیطان نے پوچھا۔ ”رضیہ کیسی ہے؟“

”بالکل ویسی ہے جیسے پہلے تھی۔“

"پہلے کیسی تھی؟"

"پتہ نہیں۔"

اتنے میں آخری گھنٹی بجی اور دروازے بند ہونے لگے۔

لڑکیاں پھرتی سے لپکیں اور شیطان نے تعاقب کیا۔ وہ حکومت آپا کے ساتھ بیٹھنا چاہتے تھے لیکن اندھیرا ہو چکا تھا۔ کسی اور کو حکومت آپا سمجھ کر اس کے برابر جا بیٹھے۔

تاریکی کا اثر زائل ہوا تو۔۔۔ "معاف کیجئے سامنے لمبا سا آدمی بیٹھا ہے، سکرین صاف نہیں دکھائی دے رہا۔" کہہ کر اُٹھ آئے اور مجھ سے سیٹ بدل لی۔ لیکن وہاں سے حکومت آپا پانچ چھ لڑکیاں دور تھیں۔

انہوں نے حکومت آپا کی طرف جھانک کر اس اچانک اور خوشگوار ملاقات پر مُسرّت کا اظہار کیا۔

"خوشی وُشی کیسی۔۔۔" جواب ملا۔ "اس اُجاڑ کیمپ کی تنہائی ہے جو یہ کہلوا رہی ہے۔"

فوراً ”ہشت “اور ”چپ رہیے “کی آوازیں آئیں۔

فلم سے پہلے ٹریلر دکھائے جارہے تھے۔

”تمہیں اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن آج کل تم اس ایکٹرس جیسی لگتی ہو۔“ شیطان نے اُونچی سی سرگوشی کی۔

اس ایکٹرس نے لباس تو خوب پہن رکھا تھا لیکن پینتالیس پچاس کی ہو گی۔ میں نے ٹوکا تو انہوں نے عینک بدلی۔ ان دنوں وہ کبھی ایک عینک لگاتے کبھی دوسری۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں ایک جیسی ہیں۔

”بہر حال اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ کافی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔“

”تم بھی کچھ اتنے بُرے نہیں لگ رہے۔“

”خاموش رہیے یا بالکل آہستہ بولیے۔“کسی نے احتجاج کیا۔

”دراصل تم اس نئی حسینہ جیسی سمارٹ ہو۔“ شیطان نے پھر سرگوشی کی۔

اس وقت پردے پر ایک بنی ٹھنی عورت (جو کسی کی آنٹی نکلی) مٹکتی ہوئی جارہی تھی۔

"اسے وہی سمارٹ سمجھ سکتا ہے جس کی عینک کے نمبر غلط ہوں۔" حکومت آپا چہک کر بولیں۔ شیطان نے دوسری عینک اُتار کر پہلی لگائی اور۔۔۔ "معاف کیجئے سامنے بالکل چھوٹا سا آدمی بیٹھا ہے۔ سکرین صاف نظر آرہا ہے۔" کہتے ہوئے کسی اور لڑکی سے سیٹ بدل لی۔

اس ادلا بدلی میں مُجھے بھی اُٹھنا پڑا۔ اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے نکلا تو انہیں بتایا گیا کہ اب تک نہ اصل فلم شروع ہوئی ہے اور نہ کوئی خوبصورت ایکٹرس آئی ہے۔ جب آئی تو کھانسی دوں گا۔

"یہ غل غپاڑا ختم کیجئے۔۔۔ کچھ پلّے نہیں پڑ رہا۔" کسی نے مایوسی سے کہا۔

اگلی دفعہ شیطان نے یوں جگہ بدلی کہ حکومت آپا کے قریب آنے کی بجائے اور دور ہو گئے۔ جب تک ہیروئن آئی اتنی دفعہ سیٹ بدلنی پڑی کہ مَیں گیٹ کیپر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اتنے فاصلے سے کھانسنا بیکار تھا، اس لیے زور سے بتانا پڑا۔۔۔ "روفی! یہ ہے اصلی ہیروئن!"

شیطان کی بینائی اس قدر کمزور ہے کہ صحیح عینک کے بغیر انہیں کچھ نظر نہیں آتا بلکہ کچھ سُنائی بھی نہیں دیتا۔ لیکن یہ فقرہ کسی طرح سُن لیا اور فوراً حکومت آپا سے

کہا۔

"اُفّوہ! یہ ایکٹرس تو بالکل تمہاری کاربن کاپی ہے۔۔۔۔"

"یہ ایکٹرس؟ یہ تو ہمیشہ مجھے زہر دکھائی دیتی ہے۔"

"آخر یہ ہڑبونگ کب ختم ہو گی۔۔۔۔"پچھلی سیٹوں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

کچھ دیر کے بعد ایک لڑکا چلّایا۔"آپا! لاری نیچے جارہی ہے۔"

اس پر حکومت آپا لڑکیوں سمیت فوراً چلی گئیں۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بُلانے والا ان کا چھوٹا بھائی ننھے میاں تھا۔ جس پھُرتی سے وہ غائب ہوئے ہم یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ اس علاقے میں کیسے آنا ہوا اور قیام کہاں ہے۔

چند روز بعد انجنیئر اور میں موٹر سائیکلوں پر جارہے تھے کہ نچلے بازار میں ننھے میاں نے روک لیا جو کیمرہ پکڑے فوٹو گرافر کی دکان کھُلنے کا انتظار کررہا تھا۔

معلوم ہوا کہ حکومت آپا بطور مانیٹر اپنے کالج کی لڑکیوں کے ہمراہ وادی کی سیر پر آئی ہیں۔ ساتھ چند اُستانیاں بھی ہیں۔ تبھی شام کو واپسی کی جلدی ہوتی ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے سب کی حاضری لگتی ہے۔

”اور بالکل پڑوس میں ایک عجیب سا آدمی عجیب سے لوگوں میں گھِرا رہتا ہے؟“ وہ بتا رہا تھا۔

”بار بار ایسے خوفناک فقرے سنائی دیتے ہیں کہ بہت ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے آپ کو ڈھونڈ تا رہا ہوں۔ چلیے، اس وقت وہ ضرور ہو گا۔“

وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ریسٹ ہاؤس کے لان میں ایک شخص موڑھے پر بیٹھا پان کی جگالی کر رہا ہے۔ سامنے حُقّے اور بہت سارے ملاقاتی۔ ایک کے اُٹھنے پر دو اور آ جاتے ہیں۔ تانتا بندھا ہوا ہے۔

”آپ نے کئی دفعہ یقین دلایا لیکن دو کی جبکہ تین مہینے ہو گئے اور اب تک میرا انتقال نہیں ہوا۔“ کسی نے شکایت کی۔

”دُنیا اُمید پر قائم ہے۔ حوصلہ رکھو۔ انتقال ہوا ہی چاہتا ہے۔“ اس نے کش لگاتے ہوئے تسلّی دی۔

”آپ کی نوازش سے تو ایسوں ایسوں کا انتقال ہو چکا ہے جو بالکل مستحق نہ تھے۔ نہیں ہوتا تو بس ہمارا انتقال نہیں ہوتا۔“ دوسرے نے گلِہ کیا۔

”پوری کوشش کر رہا ہوں کہ صرف آپ کا بلکہ آپ کے قریبی رشتہ داروں کا

بھی انتقال ہو جائے۔ جس خاندان کے مجھ پر احسان ہوں اسے میں کیونکر بھول سکتا ہوں۔"

ایک نے تو با قاعدہ الٹی میٹم دے دیا۔۔۔ "بُرا نہ مانیں تو ایک عرض کروں۔ اگر واقعی میرا انتقال نہیں کرا سکتے صاف صاف بتا دیجئے کہ کوئی اور وسیلہ ڈھونڈوں۔"

"اگر مہینے کے اندر اندر تمہارا فوری انتقال نہ کرا سکا تو مجھ پر چار حرف۔"

پہلے تو ہم بھی چونکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر چوکیدار نے بتایا کہ گفتگو کا تعلّق انتقالِ اراضی سے ہے اور یہ صاحب دورے پر اکثر آیا کرتا ہے۔

اس پر ننھے میاں کی تشویش کم تو ہو گئی لیکن پوری طرح اطمینان نہ ہوا۔ پوچھنے لگا کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ بتایا کہ سب سے اُوپر جو تین متوازی سڑکیں ہیں، ان میں بیچ والی سڑک پر۔ لیکن وہ کیمپ کے سینما سے آگے نہیں گیا تھا، اس کے ساتھ لے جا کر اپنے کمرے دکھانے پڑے۔

پھر ایک انوکھا تماشا شروع ہوا۔

آہستہ آہستہ اُن سب ایکٹرسوں اور حسیناؤں کی تصویروں پر جنھیں رسالوں سے

نکال کر کمروں میں آویزاں کیا تھا، مونچھیں اُگنے لگیں۔ ان کی مقناطیسی آنکھوں پر موٹی عینکیں سوار ہو گئیں۔ پھر سب نازنیں سگار بھی پینے لگیں۔

شروع شروع میں نقّاش صرف پنسل استعمال کیا کرتا، چنانچہ ہم ربڑ سے چہروں کو اصلی حالت پر لے آتے۔ شاید چِڑ کر وہ پکی سیاہی لے آیا، بلکہ داڑھی بھی لگانی شروع کر دی۔ کیمسٹ نے کئی ترکیبیں آزمائیں لیکن یہ سیاہی نہ مِٹ سکی۔

قصبے سے اور رسالے لائے۔ نئی تصویریں تراش کر لگائیں۔ لیکن ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اچھے بھلے حسین چہروں کو بار بار اس حالت میں دیکھ کر سب کا جی اُترنے لگا، اور وہ ساری تصویریں گودام میں بند کرنی پڑیں۔

پھر باورچی نے بتایا کہ جب ہم باہر تھے تو اس نے آہٹ سُنی۔ لپک کر پہنچا لیکن کوئی لڑکا کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ اس نے لڑکے کا جو حلیہ بیان کیا وہ ننھے میاں سے ملتا تھا۔

ملغوبہ کے ڈنر پر مقصود گھوڑے کے ذہن میں یا تو یہ واقعہ تازہ تھا، یا یہ کہ وہ ٹکٹکی باندھے ایک لمبی لمبی گھنی مونچھوں والے مہمان کو یوں تک رہا تھا جیسے ہپناٹزم کا سبق

لے رہا ہو۔ (مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ پُشت سے بھی دکھائی دیتیں)۔ جب برتنوں چمچوں کے کھڑکنے کے پر چونکا اور لڑکیوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ یہ کون ہے۔ باتوں کے شور میں ملغوبہ نے تو سُنا ہی نہیں، تہمیدہ دوسری طرف دیکھنے لگی اور نحیفہ جو فرش پر کچھ ڈھونڈ رہی تھی اس کی نظریں نیچی رہیں۔ مقصود گھوڑے نے کاپی نکالی اور سُنایا۔

جاتے ہی بزم میں جو اس نے جھکائی مونچھیں

جب تلک بیٹھے رہے ہم نہ اُٹھائی مونچھیں

نحیفہ نے ٹوکا تو جلدی سے تصیح کی۔۔۔ ”مونچھیں نہیں، آنکھیں! یعنی جو اس نے جھکائی آنکھیں۔۔۔ نہ اُٹھائی آنکھیں۔۔۔۔۔“

جب سے برسات شروع ہوئی فلاسفر کہا کرتا کہ ایسے ماحول میں انسان

INTROVERTبن سکتا ہے۔ لہٰذا EXTROVERTرہنے کی کوشش کیا کرو۔

مقصود گھوڑا ایکسٹر اوورٹ بننے کے لیے تیار تھا۔ کسر تھی تو اتنی کہ نہ اس لفظ کے معنے آتے تھے نہ دوسرے کے۔ فلاسفر نے تشریح کی جو رائیگاں گئی۔ مقصود گھوڑا قصبے سے ڈکشنری لایا اور فلاسفر کو وہ صفحے دکھائے جہاں انٹروورٹ کے سامنے لکھا تھا۔۔۔ مطالعۂ باطن کا عادی۔ اُدھر ایکسٹر اوورٹ وہ تھا جو اس کے اُلٹ ہو۔

"یہ مطالعۂ باطن کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "اور ڈکشنری میں آسان لفظ کیوں نہیں ملتے؟"

"یہاں لٹریچر کی باریکیاں فقط نحیفہ جانتی ہے۔ وہی بتا سکے گی۔" فلاسفر نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ نحیفہ نے یہ سُن کر ہنسی ہنسی میں مقصود گھوڑے کو SIMPLETON کہہ دیا، جسے سب سادہ لوح سمجھے۔ لیکن اس نے وہیں لغت کھولی۔۔۔ "اس لفظ کا مطلب ہے جلد بے وقوف بن جانے والا۔ باؤلا۔ آسانی سے جھانسے میں آجانے والا۔ گاؤدی خوش فہم۔"

"ہر لفظ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔" وہ بولی "اصل چیز ہے وہ موقع جس پر لفظ

استعمال کیا گیا۔ اگر ضرورت پڑے تو ڈکشنری کی مدد لی جا سکتی ہے۔"

مقصود گھوڑے نے فقرے کا دوسرا حصّہ سُنا اور فوراً جیبی لغت خرید کر مطالعہ شروع کر دیا۔ جب شیطان کو ڈاکٹر سے زکام لگا (جو اُسے کسی مرضی سے مِلا تھا) اور نحیفہ نے مقصود گھوڑے سے حالت پوچھی تو اس نے لغت نکال کر بتایا۔ "ایسی ہے جیسے پژمردہ، غمگین، مایوس، ملول، کہا جا سکتا ہے۔"

"معمولی ساز کام ہی تو ہے۔ چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہارے اس فقرے میں استحسان پسندی ہے اور خوش اُمیدی۔ لطفِ غائبانہ بھی ہے۔"

پھر ملغوبہ نے اپنے منگیتر کو چھیڑنے کے لیے فقط حضرات کی دعوت کی۔ نحیفہ کہیں پوچھ بیٹھی کہ "یہ مردانہ پارٹی کیسی رہی۔"

"وہاں ملغوبہ غلو اور تعلّی سے کام لے رہی تھی، نمک مرچ لگا رہی تھی، بڑھا چڑھا کر بیان دے رہی تھی۔" مقصود گھوڑے نے بتایا "اور قصبے کے لڑکے اتّو پتّو کر رہے تھے، چاپلوسی سے خلوص جتا رہے تھے، غلامانہ خوشامد کر رہے تھے، لیکن ملغوبہ کے منگیتر کا رویّہ وہ نہیں تھا جس کی توقع کی جاتی۔ یعنی کڑی نظر رکھنا، چوکسی

دکھانا، کسی سے اُلّو نہ بننا۔ تقریب پھیکی پھیکی سی رہی۔ کاش کہ وہاں کوئی ایسا بھی ہوتا جسے بے باک، من چلا، جان

پر کھیل جانے والا، بے دھڑک، کہہ سکتے۔ جو سب کو سیدھا کرتا۔"

اس سے اگلی دفعہ جب مقصود گھوڑے نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو نحیفہ نے وہیں ٹوک دیا۔

"ڈکشنری کے متعلق اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ آئندہ اس کا حوالہ کبھی مت دیں۔"

اسے برہم ہوتے دیکھ کر مقصود گھوڑے نے تعریف کرنی چاہی۔

"یہ پہاڑ چھ ہزار فٹ اونچا ہے، لہٰذا اسے ہل اسٹیشن سمجھنا چاہیے۔ کمال ہے کہ اتنی بلندی پر بھی تم اور لڑکیوں کی طرح شوخ بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتیں۔"

"بقول تہمیدہ، اس پہاڑ پر سینری کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے؟ طرح طرح کے لباس ساتھ لائی تھی لیکن ان کا فائدہ؟ کیا بندروں، پرندوں، ریچھوں کو دکھانے کے لیے پہنوں۔"

"یہ بھولپن فوراً بتادیتا ہے کہ تم اوروں سے بالکل مختلف ہو۔" اس نے مزید ستائش کی۔

"جو حسّاس ہوں وہ مختلف ہوا کرتے ہیں۔۔۔ کیسے کیسے طوفان دل میں اُٹھتے ہیں؟ کتنی امیدیں اُمنگیں پنپنے سے پہلے کُہرے کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ یہ کیسے بیان کروں۔ ان کا ذکر بے سود ہے۔۔۔۔۔"

"بے سود ہے تو رہنے دیجئے۔۔۔۔" مقصود گھوڑے نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سُنا۔

"اگر بُرا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں؟" وہ بولی۔

"جو فقرہ اگر بُرا نہ مانو سے شروع کیا جائے اس میں ضرور کوئی برا ماننے والی بات ہوتی ہے۔ بہر حال فرمایئے۔۔۔۔"

اس نے جواب کا انتظار کیا۔

جھینگروں کی آواز کے علاوہ چاروں طرف خاموشی رہی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ نحیفہ جاچکی ہے۔ اس کے بعد مقصود گھوڑے کو دوسرے پہاڑ کی آبشار کے پاس اتوار کو تنہا ٹہلتے دیکھا گیا۔ حالانکہ پہلے اس طرف جاتا تو بڑے اہتمام اور ساز و

سامان کے ساتھ، جو عموماً دوربین، تھرماس، سینڈوچز، نحیفہ اور کیمرے پر مشتمل ہوتا۔

پھر سُنا کہ دونوں میں شکر رنجی ہوگئی ہے اور یہ کہ وہ ان دِنوں خودی یا خودداری پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ لکھی ہوئی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے پہلے اکڑفوں دکھائی۔ جب کوئی اثر نہ ہوا تو نحیفہ کو چڑانے کے لیے ملغوبہ کے ہاں جانے لگا۔

کبھی کبھی ساٹھ میل دور شہر سے آرائشی سامان اور خوشبوئیں لاتا لیکن ملغوبہ جیسی ایکسپرٹ ان میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتی۔ "یہ شیشیاں دراصل سانولی رنگت کے لیے ہیں۔ اور ایسی خوشبوئیں فقط سردیوں میں لگائی جاتی ہیں۔" یا "یہ لوشن، پاؤڈر اور کریم وہ لڑکیاں استعمال کرتی ہیں جن کے چہرے پر کوئی نشان ہوں۔ اور یہ سینٹ بھی موسمِ خزاں کے لیے ہے۔" بار بار یہی ہوتا۔ مجبوراً ملغوبہ کی پسند نمبر دو یعنی کھانے پکانے پر ہلّہ بولنا پڑا۔

"برطانوی شاہی دستر خوان"، "روسی پرولتاری دستر خوان"، "چین کے عوامی پکوان" جیسی کتابیں اِدھر اُدھر سے ڈھونڈ کر لاتا۔ لیکن ملغوبہ جو پڑھائی لکھائی سے ہمیشہ دور رہی تھی، یہ کوشش کرتی کہ کہیں کچھ پڑھنا نہ پڑ جائے اور پھر کھانوں کے موضوع پر تو اسے پوسٹ گریجویٹ کا رتبہ مل چکا تھا جبکہ مقصود گھوڑا

رنگروٹ بھی نہیں تھا۔

اب فقط حُسن وجمال کی تعریف باقی رہ گئی تھی۔

اگلے ڈنر پر ملغوبہ سے سرگوشی کی۔ ”تم سے کچھ کہنا ہے، جسے ہر دفعہ بھول جاتا ہوں۔“

اور اسے ایک طرف لے گیا۔

”میں بھی کیا ہوں۔ یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ تمہاری آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ ہونٹ گلاب کی پتّیاں ہیں اور دانت موتیوں کی طرح۔“

”مجھے خوشامد ذرا اچھی نہیں لگتی۔“

”مجھے پتہ ہے۔ تبھی تو چاپلوسی کی بجائے سچ بول رہا ہوں۔“

ایسی چکّر دار خوشامد سے وہ بے حد خوش ہوئی۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟ کچھ کہہ رہے تھے۔“

اچانک ٹوک دیئے جانے پر شاید اسے رٹّا ہوا سبق بھول گیا۔

”یہی کہ تمہارے چہرے پر ایسی جلاء رہتی ہے۔ ایسی۔۔۔ بالکل دودھ جیسی۔ بلکہ دودھ کی بالائی جیسی۔ (ذرا دیر پہلے اس نے زردے کی کھرچن پر بالائی ڈالی تھی)۔ اور تمہاری ناک۔۔۔ ناک پتہ نہیں کس سے مشابہت رکھتی ہے اور کان۔۔۔“

”چچ چچ چچ۔۔۔ ناک کو سُتواں تو کہا جا سکتا ہے لیکن نسوانی کانوں کی دلکشی کا ذکر کبھی نہیں سُنا۔“

اب مقصود گھوڑے نے اپنی طرف سے تُرپ کا یکّہ چلنا چاہا۔ اپنی کاپی نکال کر شکل وصورت کا سیکشن ڈھونڈنے لگا۔ لیکن جلدی میں یہ پڑھ گیا۔۔۔

”ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا۔ تری صورت تری صورت کبھی تھی۔۔۔ نواب مرزا خاں داغ سنہ ۱۸۳۱ سے سنہ ۱۹۰۵ تک۔“

اگرچہ ملغوبہ کو شاعری سے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا کہ اس کے منگیتر کو چُستی اور زندہ دلی

سے، تاہم اس شعر کا وہی اثر ہوا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔

اگلی مرتبہ نحیفہ کے ہاں چاء پر گئے تو مقصود گھوڑا غائب تھا۔

وہ بار بار شیطان سے کچھ پوچھنا چاہتی جسے وہ ٹال جاتے۔ جب باہر نکلے تو بوندیں

رُک گئی تھیں۔ پھر غروبِ آفتاب پر شفق پھولا اور ساری فضا گلابی ہو گئی۔ خشک ہوا کے جھونکوں سے پودے اور درخت جھوم رہے تھے۔ روشنی کم ہوئی تو کہیں کہیں تارے ٹمٹمانے لگے۔

شیطان کو عینک کے بغیر ایسے سہانے نظارے اور بھی زیادہ سہانے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ اتنے کہ خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کو جی چاہتا ہے۔

"یہ مقصود صاحب اپنے آپ کو کیا۔۔۔۔"

"تمھارے ہاتھ میں پیکٹ سا تھا۔ اس میں کیا ہے؟" شیطان نے بات کاٹی۔

"تصویریں۔"

"دیکھیں۔۔۔"

اس نے ایک تصویر نکالی۔

"اس میں تم کتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ اور۔۔۔۔"

"تصویر اُلٹی پکڑ رکھی ہے۔" نحیفہ نے بتایا۔

شیطان نے تصویر سیدھی کی اور پوچھا۔۔ ”یہ جو پیچھے سلسلۂ کوہ نظر آرہا ہے، یہ آتش فشاں معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہ پہاڑ نہیں ملغوبہ کھڑی ہے۔ عینک لگالو تو بہتر ہو گا۔ اور یہ جو مقصود۔۔۔۔“

”اچھا یہ بتاؤ“ شیطان نے جلدی سے کہا۔ ”آج تمہارے ہاں جو نئی لڑکی تھی، وہی جو ہمیں اپنے کالج کی باتیں سناتی رہی۔ وہ دیکھنے میں دراصل کیسی ہے؟“

عینک لگاتے ہی انہیں ساری وادی نظر آئی تو خوش ہو کر بولے۔ ”آہاہا۔۔۔۔۔ دن بھر کی بارش کے بعد سب کچھ نکھر گیا ہے۔ وادی اتنی صاف ستھری لگ رہی ہے جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلین کرائی ہے۔ ایسے ہی مناظر تو حیاتِ ابدی، صداقت، شرافت، شائستگی وغیرہ وغیرہ جیسی چیزوں کی یاد دلاتے ہیں۔۔۔۔۔“

لیکن نحیفہ مقصود گھوڑے پر تنقید کرنے لگی۔ اسے یہ بھی شکایت تھی کہ لوگ تو بس چہرے پر فریفتہ ہونا جانتے ہیں، دیگر خوبیوں کو کوئی نہیں پرکھتا۔ ”ظاہری رنگ رُوپ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”ظاہری رنگ روپ بہت کچھ ہوتا ہے۔“ شیطان نے بتایا۔ ”چہرے سے محبت نہ ہو تو اور کس چیز سے کی جائے؟ آج تک نہیں سُنا کہ کوئی کسی کے بازو، ٹخنے یا کہنی پر عاشق ہوا ہو۔“

"مطلب یہ تھا کہ خوبصورت شکل سے تو ہر ایک وہیں متاثر ہو جاتا ہے لیکن طبیعت، ذہانت، قابلیت کو جانچنے میں جان بوجھ کر دیر لگائی جاتی ہے۔"

"شاید اس لیے شکل تو فوراً نظر آ جاتی ہے لیکن عقل، مزاج، تحمل وغیرہ دکھائی نہیں دیئے۔" ویسے مقصود گھوڑے اور نحیفہ کے باسی رومان کی باتیں سُن سُن کر سب تنگ آ چکے تھے خصوصاً شیطان جن کی دِلی خواہش تھی کہ کوئی اور بھی کسی اور پر عاشق ہو تا کہ کم از کم موضوع تو بدلے۔ انہوں نے نحیفہ کو چیونگم پیش کیا کہ اسے چباتے ہوئے باتیں کم ہوں گی۔ لیکن اس کی شکایتیں جاری رہیں اور شیطان اتنی مدھم روشنی میں بھی اخبار پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔

"تو آپ مجھ سے متّفق ہیں نا؟" انہیں خاموش پا کر نحیفہ نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"شکریہ رونی بھائی! آپ سے یہی اُمید تھی۔ مگر آپ دونوں کی دوستی جُوں کی تُوں ہے، پھر کیسے متفق ہو گئے؟"

"شاید اس لیے کہ میں متوجہ نہیں تھا۔" انہوں نے لفظ بھائی پر چونک کر جیبیں ٹٹولیں۔ (ایسے موقعوں پر شیطان کے رومال اکثر غائب ہو جاتے ہیں تبھی

دعوتوں کے بعد وہ یا تو پردوں سے انگلیاں پونچھتے ہیں یا کوئی بچہ مِل جائے تو پیار کے بہانے اس کے سر پر دونوں ہاتھ پھیر لیتے ہیں۔ عذر یہ ہوتا ہے کہ رومال بھول آیا ہوں اور میزبان کے واحد گیلے تولیے سے بے شمار آدمی ہاتھ پونچھ چکے ہیں)۔ پھر نحیفہ کا رومال مانگ کر عینک چمکائی۔۔۔۔ "معاف کرنا تمہیں پورے غور و خوض سے دیکھنا پڑا۔ اگرچہ خوض کا پتہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اب تک حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ جو اصول مجھے جھوٹ بولنے سے منع کرتے وہی سچ کہنے سے بھی روکتے تھے۔ مگر اب جبکہ بقول انگلش محاورے کے۔۔۔۔ بلّی تھیلے سے باہر آ چکی ہے، تمہارے جنرل نالج میں اضافہ کرنے کے لیے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بھائی کا دُم چھلّانہ تمہیں فائدہ پہنچائے گا نہ کسی اور کو۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ تم مجھے روفی ماموں یا روفی چچا کہہ لیا کرو۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے آپ کو کم عُمر تو سمجھو گی۔ ممکن ہے کہ سُن کر دوسروں کو بھی یہی غلط فہمی ہونے لگے۔"

مقصود گھوڑا خودی با خودداری پر وہ کتاب واپس کرنے گیا تو لائبریرین نے اسی موضوع پر ایک اور کتاب دکھائی۔ اس کے انکار پر بولا۔ "کھوئے کھوئے سے لگتے ہو، جیسے کسی شش و پنج میں ہو۔ ایسی حالت میں ہمیشہ فال نکالنی چاہیے۔"

مقصود گھوڑے کی خاموشی پر لائبریرین نے اس کی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر کہا کہ

کسی الماری سے کوئی کتاب نکالے اور اس کے ایک صفحہ پر کہیں انگلی رکھ دے۔ انگلی جہاں رکھی گئی وہاں لکھا تھا۔

دِلوں کا حال تو ہے نہ ربط ہے گریز

محبتیں تو گئی تھیں عداوتیں بھی گئیں

نہ جانے کس فارمولے سے لائبریرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ "شگون اچھا ہے مگر بہتری اسی میں ہو گی کہ اپنا ارادہ بدل دیں۔"

چنانچہ مقصود گھوڑے نے نحیفہ کو منانے کا پروگرام بنایا۔

اگلی مرتبہ جب دوسرے پہاڑ پر آمنا سامنا ہوا تو بلند آواز سے پڑھا۔۔۔

؎ کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا

زردی نہیں جاتی مرے رُخسار سے اب تک

میر تقی میر سنہ ۱۷۲۳ سے سنہ ۱۸۱۰ تک۔

مگر وہ سیدھی نکل گئی۔ مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

"سڑک پر یوں آوازے کسنا آداب کے خلاف ہے۔" فلاسفر کو بُرا لگا۔

"نِری ہلّڑ بازی ہے۔" شیطان بولے۔ "اور اگر موقع بے موقعہ، یعنی اکثر بے موقعہ شعر سُنانے ہی ہیں تو شاعر کی عُمر کو ساتھ کیوں گھسیٹ لیتے ہو؟"

"شعر کے نیچے جو لکھی ہوتی ہے، اس لیے۔" مقصود گھوڑے نے بتایا۔

اب اس نے تہمیدہ کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ لیکن تہمیدہ کو وہ زیادہ اچھا نہیں لگتا تھا (جبکہ کم اچھا بھی نہ لگتا)۔ شاید اس لیے کہ باسی کھانوں کو پسند کرنا تو ایک طرف رہا وہ تازہ چیزوں سے بھی ہچکچاتا۔ نہ اُسے پھکڑپنے اور شستگی میں تمیز تھی (تبھی تہمیدہ کی واہی تباہی پر ویسی داد نہ دے سکتا جس کی اسے توقع ہوتی)۔ اور نہ یہ اندازہ تھا کہ کب بات کرنی چاہیے اور کب چپ رہنا بہتر ہو گا۔ کیونکہ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب خاموشی گویائی سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

تہمیدہ تک کی بے رُخی کا اس پر کیا اثر ہوا؟ اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

شاید اس لیے کہ مشکوک کی وجہ سے وہاں بیزاری کا معیار کافی اُونچا ہو چکا تھا۔

آخر ایک دن شیطان نے اسے گھیر لیا۔۔۔ "یہ کیا ہر وقت سنٹر ہاف کی طرح بے فائدہ چاروں طرف بھاگتے رہتے ہو؟ ہر بار اس طرح ناکام ہوتے ہو کہ افسوس کی جگہ غصّہ آتا ہے۔ تم جیسے لوگوں نے ہی ناکامی کو اتنا بدنام کر رکھا ہے۔ مقصود میرے دوست، میرے عزیز، گھوڑے یعنی پرانے رفیق۔۔۔ سچ مچ تم ان میں سے ہو جو لاٹری کا ٹکٹ لیے بغیر اوّل انعام کے منتظر رہتے ہیں، اور جن کا رویہ سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ مثلاً سنجیدہ محفلوں میں تم شوخ بننے کی کوشش کرتے ہو لیکن جہاں سب چہک رہے ہوں وہاں تمھیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔۔۔۔۔"

"لیکن تم ہی نے تو کہا تھا کہ مجھ جیسے لوگ ہر جگہ مقبول ہوتے ہیں۔" مقصود گھوڑے نے شکایت کی۔

"میری مراد تم جیسے افراد سے تھی، نہ کہ تم سے۔ وہ یقیناً مقبول ہوتے ہوں گے۔ عجب تماشہ ہے۔ تم تو مجھے اچھے لگتے ہو لیکن تمھارے نظریے اور حرکتیں بالکل پسند نہیں۔ زندگی کتنی پیچیدہ ہے۔"

"میں تو کوشش کرتا ہوں کہ چُست، ذہین، محنتی اور خوش باش بنوں۔۔۔ لیکن دوسرے نہیں بننے دیتے۔"

مقصود گھوڑے میں یہ خوبی ہے کہ سمجھانے یا نصیحتوں سے کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ ان موقعوں پر وہ ایسا امپائر نظر آتا ہے جو بولر کی اپیل سے پہلے ہی ناٹ آوٹ دینے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ چوتھے، پانچویں روز شیطان کا پیغام ملا کہ ”مقصود گھوڑا بستہ سا باندھ کر نحیفہ کے مکان کی طرف نکلا ہے۔ فوراً آؤ۔“

سڑک پر وہ منتظر ملے۔ جب تک ہم وہاں پہنچے اور آڑے لے کر قریب جا سکے تو مقصود گھوڑا تمہید ختم کر چکا تھا اور اب بتا رہا تھا کہ انسان جہاں جانوروں سے زبردستی کام لیتا ہے وہاں لٹریچر میں بھی ان بیچاروں سے انصاف نہیں برتتا۔ نثر ہو یا نظم، اپنی حرکتوں کو حیوانوں کے سر تھوپنا سراسر زیادتی ہے۔ کوئی آہستہ چلے تو اسے الکسی کہنے کی بجائے کچھوے کو کھینچ لاتے ہیں کہ اس کی طرح سُست ہے۔ دشمن کے بغض پر اُونٹ کو بدنام کیا جاتا ہے کہ یہ نِرا شُتر کینہ ہے۔ مغرور محبوبہ کی ادائیں بھی اُونٹ کے کھاتے میں لکھی جاتی ہیں کہ یہ شُتر غمزے تھے۔ بناوٹی دوست بے وفائی نہیں کرتے طوطے کی نقل اُتارتے ہوئے طوطا چشمی دکھاتے ہیں۔ کوئی مکار جھوٹی دلجوئی کرنے آئے تو قصوروار مگرمچھ کو ٹھہرایا جاتا ہے جس کے آنسو وہ بہانے لگتا ہے۔ اور گدھے کا آئی کیو ٹیسٹ کے بغیر اس پر خردماغی کا بہتان لگایا گیا۔ رہ گئی خرمستیاں، کم از کم میں نے تو آج تک کسی گدھے کو چہلیں کرتے نہیں دیکھا۔ مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں لیکن افسوس ہے تو اس پر کہ حیوانوں کو بیان

کرتے ہوئے انسان نے اپنی خصوصیات کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ مثلاً یہ کہ بھیڑیے، میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ آدمی کی طرح ہٹ دھرم ہے۔۔۔یا یہ کہ کوّا اشرف المخلوقات کی طرح احسان فراموش ہے۔ یا یوں کہ چیتے انسان سے بھی زیادہ چالاک اور مکّار ہوتے ہیں۔

پھر ہم نے دیکھا کہ نحیفہ نے دو سالم بستہ ضبط کر کے اپنے ملازم کو دیا اور مقصود گھوڑے کو خبر دار کیا کہ آج سے لٹریچر کی کسی بھی صنف پر کوئی گفتگو نہیں ہو گی۔

"اور اگر آپ نے پہل کی تو یقین دلاتی ہوں کہ اسی دن واپس چلی جاؤں گی۔"

مِلر سے پہلی ملاقات کچھ اس طرح ہوئی جیسے فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔

بارش کا چھٹا یا ساتواں دن تھا۔ کمرے میں رکے ہوئے بادلوں اور ان کی نمی سے تنگ آ کر چوڑے گھیرے کا گورکھا ہیٹ پہنا اور باہر نکلا۔ تیز جھکڑوں میں چھتری بیکار تھی۔

راستے پر پانی بہہ رہا تھا۔ چڑھائی آئی تو رفتار تیز کی۔ ورزش شروع ہوتے ہی جسم میں چستی آ گئی۔ قدم خود بخود اُٹھنے لگے۔

سڑک پر ایک جگہ بھیگا ہوا رومال دیکھا جس کے کونے پر انگریزی کے حروف

M.G- کڑھے ہوئے تھے۔ کچھ دور آگے چمڑے کا بٹوہ ملا جس سے پائپ کے بڑھیا تمباکو کی مہک آئی۔ اس پر بھی M. G- لکھا تھا۔ پھر دو کیلے پڑے تھے اور ذرا آگے سنگترے۔ انہیں بھی اُٹھایا لیکن ان پر کوئی نشان نہیں تھا۔

دُھند گہری ہوتی گئی۔ کسی سے ٹکر نہ ہو جائے اس لیے بار بار کھانسنا بلکہ کھنگارنا پڑتا۔

ایک موڑ کے بعد کہیں دور کھانسی سنائی دی۔ خیال آیا کہ اپنی ہی کھانسی کی گونج نہ ہو۔ دوبارہ کھانس کر انتظار کیا لیکن کوئی صدا نہیں آئی۔

کچھ دیر کے بعد پھر ویسی آواز سنائی دی۔ آگے ایک سیب ملا اور اس کے قریب پاؤں کے نشان جو کسی چوپائے کے تھے۔ ذرا آگے جا کر ان کا رُخ ایک غار کی طرف مُڑ گیا۔

سوچنے لگا کہ ایسا چوپایہ کون سا ہو سکتا ہے جس کے پاس فالتو رومال اور پھل ہوں۔ اور پائپ کا تمباکو بھی۔ غار میں جھانکا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ کسی جانور کی چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی نہیں دیں۔

جانے ہی لگا تھا کہ آچھیں سے غار گونج اُٹھا۔ یہ چھینک کسی حیوان کی ہرگز نہیں تھی کیونکہ ساتھ ہی انگریزی کا ایک ترقّی پسند لفظ بھی سُنا۔

اندر جاکر دیکھا تو ایک چاق و چوبند شخص مُسکرا رہا تھا۔ تمباکو کا بٹوہ لیتے ہی اس نے پائپ بھرا۔ لمبے لمبے کش لگا کر بولا۔ ''شکر ہے کہ میرے پھٹے ہوئے تھیلے سے اور چیزوں کے ساتھ ماچس نہیں گری۔ ورنہ اس وقت تمباکو کے لُطف سے محروم رہ جاتا۔''

پائپ پی کر پھل مانگے۔ سنگترہ کھاتے ہوئے ہنسا۔ ''اس ندیدے پن کو اسکاٹس مین کی کنجوسی مت سمجھنا بلکہ اس وقت سخت بھوک لگی ہے۔ ویسے میرا تعلق پسماندہ ایبرڈین سے ہے، جسے لندن والے اتنا ہونّق سمجھتے ہیں کہ پچھلے سال انہوں نے اپنے ایک معمّے کا اوّل انعام 'گرمیوں میں ہرے بھرے ایبرڈین میں دو ہفتے کی مفت سیر' رکھا جبکہ دوئم انعام تھا۔۔۔۔ گرمیوں میں ہرے بھرے ایبرڈین میں ایک مہینے کی مفت سیر۔۔۔''

میں نے چوپائے کے پنجوں کا ذکر کیا تو اس نے ایسا قہقہہ لگایا کہ غار ہلنے لگا۔

''وہ میرے ربڑ کے جوتوں کے نشان ہیں۔ میرے پاؤں کے نہیں۔''

معلوم ہوا کہ G ۔M۔ جاری مِلر کا مخفف ہے لیکن یار دوست اس کی جہان گردی کی وجہ سے اسے GYPSY مِلر کہتے ہیں۔ جپسی مِلر سُن کر وہ تار یاد آگیا جسے ڈاکیہ لیے لیے پھرتا رہا۔ سینما کے مینجر کے سامنے جی۔ ایم کو جلدی میں ایم-جی کہہ بیٹھا۔ مینجر نے مقصود گھوڑا اسمجھ کر اسے ہماری طرف بھیج دیا۔

مقصود گھوڑا تار لے کر بہت خوش ہوا کیونکہ یہ لندن سے آیا تھا اور اس میں تتلیوں، پرندوں اور سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا حوالہ تھا۔ لیکن پانچ ہزار میل دور سے یہ کس نے اور کیوں بھیجا؟ اس کا نہ اُسے علم تھا، نہ وجہ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھی۔

شیطان نے تار دیکھا تو بولے۔ جپسی زنانہ نام معلوم ہوتا ہے۔ ضرور یہ کوئی فرنگی حسینہ ہے جو سیر کے لیے یہاں آئی ہے، مقصود گھوڑا کسی دن اس ولایتی نازنین کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

مِلر سے اس تار کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ وہ تتلیوں، خوشنما پرندوں اور دلآویز قدرتی نظاروں کے رنگین سکیچ بنا کر ایک ولایتی آرٹ کمپنی کو بھیجتا ہے جو وال پیپر اور دیگر آرائشی چیزوں کے ڈیزائن بناتی ہے۔

غار سے باہر نکلے تو دُھند اتنی ہی گہری تھی اور بوندیں بھی ویسی ہی تیز۔ پھر یوں لگا جیسے اس کے قہقہے مینہہ کو ہلکا کر رہے ہیں اور دُھند بھی چھٹتی جا رہی ہے۔

"یہ موسم کا بھی خوب تماشہ ہے؟" وہ کہنے لگا۔ "برطانیہ میں تقریباً سب باشندے دھوپ والے چمکیلے ملکوں کے لیے آہیں بھرتے رہتے ہیں لیکن دنیا کے جس گوشے میں بھی کسی انگریز سے ملاقات ہوئی وہ گیلے دھندلے 'HOME' کو یاد کر رہا ہو گا۔"

مشکوک یہاں کیوں آیا تھا؟ کس لیے ٹھہرا ہوا ہے؟ کب جائے گا؟ اس پر قیاس آرائی ہوا کرتی۔ سب کو اس کی روانگی کا اشتیاق تھا لیکن فلاسفر بتاتا۔ "دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جس واقعے کا اتنی بے صبری سے انتظار کیا جائے اتنا ہی وہ آگے سرکتا جائے گا۔"

باتوں باتوں میں مشکوک سے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر ہر دفعہ وہ کِھی کِھی کِھی ہی ہا ہپ۔۔۔۔ سے ٹال دیتا۔

جہاں بالغ معلوم نہ کر سکے وہاں ننھے میاں کو کامیابی ہوئی۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنی محبوبہ کے سلسلے میں یہاں آیا تھا اور تب تک رہے گا جب تک ایم۔ ایم

(ننھے میاں نے محبوبۂ مشکوک کو مخفف کیا) یہاں ہے۔ ثبوت چاہیئے تو ڈیری فارم کے اُونچے مکان کا گیٹ دیکھ لیں۔ پہلے وہاں ایک تختی لگی ہوئی تھی، مشکوک کے میزبان کے نام کی۔ اب دو ہیں اور دوسری پر مشکوک کا نام لکھا ہے۔

انجنیئر نے بتایا کہ اس نے بھی وہاں دو بورڈ دیکھے ہیں۔ ایک پر کسی کا نام ہے اور دوسرے پر 'کتّے سے خبر دار رہیں' کی تنبیہ۔ ننھے میاں نے کہا کہ اگلی دفعہ ذرا غور سے پڑھیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ واقعی مشکوک کی تختی بھی لگ چکی ہے۔ پھر کسی نے دیکھا کہ کتّے

سے خبر دار رہیں، سے لفظ کتّے کو کھُرچ کر اسے دونوں تختیوں کے بعد اس طرح آویزاں کیا گیا کہ اب یوں پڑھا جاتا تھا کہ 'مشکوک اور اس کے میزبان سے خبر دار رہیں'۔

ضرور یہ ننھے میاں کی کرتوت ہو گی۔

چند دنوں کے بعد سب کچھ اُتار دیا گیا، کتّے والی تنبیہ بھی۔ غالباً وہاں کوئی کتّا تھا ہی نہیں۔ وہ بورڈ چوروں یا پھیری والوں پر رُعب ڈالنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

پھر ننھے میاں نے دور سے وہ محبوبہ دکھائی۔ اس کے مُٹاپے، چھوٹے قد اور سُست روی سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ہماری طرف آ رہی ہے یا ہم سے دور جا رہی ہے۔

ننھے میاں جس پر ان دنوں جیومیٹری کی ٹیوشن سوار تھی، کہنے لگا۔۔ ”وہ رہی ایم۔ ایم جو کبھی گنبد نما معلوم ہوتی ہے تو کبھی مُستطیلِ ناقص۔ اسے متوازی الاضلاع بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور چہرہ ایسا دائرۂ کامل ہے جسے باقاعدہ پُرکار سے کھینچا گیا ہو۔“

پہلے سب یہی کہا کرتے کہ مشکوک جیسے انسان میں کوئی صحیح الدّماغ لڑکی دلچسپی نہیں لے سکتی لیکن اسے دیکھا تو سوچنے لگے کہ کیا واقعی کوئی مرد بقیدِ ہوش و حواس ایسی ہستی کا بھی گرویدہ ہو سکتا ہے۔ متفقہ رائے یہی تھی کہ لڑکوں میں جو حیثیت مشکوک کی ہے۔، مؤنث طبقے میں وہی مقام اس کی محبوبہ کا ہو گا۔

یہ راز راز ہی رہتا اگر ایم۔ایم کی ننھے میاں سے جھڑپ نہ ہوتی۔

وہ میٹی دیکھنے آئی تو ننھے میاں حکومت آپا سے جیومیٹری پڑھنے کا بہانہ کر کے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ فلم سے پہلے خبرنامے میں کسی محاذ پر ٹینکوں کی لڑائی دکھائی گئی۔

اچانک ننھے میاں کو یوں لگا کہ جیسے ایک چھوٹے سے ٹینک نے مُڑ کر گیٹ کیپر پر حملہ کر دیا ہو۔ لیکن غور سے دیکھنے پر یہ ایک عورت نکلی جو گیٹ کیپر سے بحث کر رہی تھی کہ اس نے اتنے بڑے صوفے پر بیٹھنے کو کیوں کہا؟ کیا وہ اس کی صحّت مندی اور تن و توش سے حسد کرتا ہے؟

پھر خوانچے والے سے ٹافیاں، چوسنے کی گولیاں، چاکلیٹ خرید کر آلو کے قتلوں اور فرنچ ٹوسٹ کا آرڈر دیا۔ ذرا سی دیر ہوئی تو مینجر کو بلا کر شکایت کرنے لگی۔ اُدھر خوانچے والا بار بار کہتا کہ میں تو پلیٹیں لیے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، آپ کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ اس فقرے کو اپنے چھوٹے قد پر چوٹ سمجھ کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

اب ننھے میاں کی باری آئی جو بالکل آگے بیٹھا تھا۔ پہلے ٹوکا کہ "سر جھکاؤ۔ فلم نظر نہیں آرہی۔" سر نیچے کیا تو 'دہنی طرف ہو جاؤ' سنائی دیا۔ پھر "نچلے کیوں نہیں بیٹھتے؟" اور اس کے بعد "ذرا بائیں کو ہو جاؤ۔"

اس بے انصافی پر وہ چِڑ گیا۔ فلم ختم ہوئی تو کسی طرح اس لڑاکا خاتون کا تعاقب کر کے اس کا مکان دیکھا اور جاسوسی شروع کر دی۔

وہ ہمیں پہلے بھی کئی بار نظر آئی تھی لیکن کبھی توجہ نہیں کی۔ تب ہمیں مشکوک کی محبت کا علم نہیں تھا اور وہ رہتی بھی تھی کافی دور۔

ننھے میاں نے بتایا کہ پہلے اس کا کُنبہ نچلے قصبے میں تھا لیکن اس کی جھگڑالو عادت کی وجہ سے بار بار رہائش بدلنی پڑی۔ آخر بَن باس ملا اور اب یہ جنگل میں رہتے ہیں۔

بعد میں اسے قریب سے بھی دیکھا پتہ نہیں اس کی نگاہیں ہم تک پہنچ سکیں یا نہیں کیونکہ چہرہ اتنا فربہ تھا کہ آنکھیں کبھی نظر نہیں آئیں۔ البتّہ ان پر بغیر فریم کی عینک خوب چمکتی۔ اچھے خاصے میک اَپ کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب سبزی مائل یا کچھ نیلی سی جھلک ہوا کرتی۔ خصوصاً سہ پہر یا شام کو۔ انجنیئر کا خیال تھا کہ شاید مغرب کا یہ فیشن یہاں ابھی ابھی پہنچا ہے۔ وہاں چہرے کی آرائش اب طرح طرح کے رنگوں سے کی جاتی ہے۔ زلفیں بھی سیاہ، سُرخ اور سنہری ہی نہیں رہیں بلکہ سبز، کاسنی، نیلی بھی رنگی جاتی ہیں۔

"مگر مغرب میں نسوانی شبیہ کو جو انچوں میں بیان کیا جاتا ہے، یعنی ۳۶-۲۲-۳۸

یا ۳۸-۲۲-۳۹ وغیرہ، اسے یاد رکھنا مشکل ہوتا ہو گا۔" فلاسفر نے کہا۔ "لیکن اس محبوبہ کے پیکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تناسب بالکل آسان

ہے۔۔۔۔۔۴۵-۴۵-۴۵ہو گیا۴۶-۴۶-۴۶۔"

"شاید اس کے خدوخال اور طرح کے لگیں۔" کیمسٹ سمجھانے لگا۔ "ان پہاڑوں سے آگے جو بلندیاں ہیں یہ وہاں کی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل اتنی اونچائی پر کیمیائی اثرات سے حیوانوں انسانوں میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ شاید تبھی اس کے اصلی حُسن کو ہم اچھی طرح نہ سمجھ سکیں۔۔۔" اِدھر ننھے میاں نے بتایا کہ ایم-ایم پہاڑی نہیں میدانی ہے۔ اُدھر ڈاکٹر بولا۔ "اگرچہ اب تک اصلی حُسن سے میرا واسطہ نہیں پڑا لیکن اگر حُسن ایسا ہی ہوتا ہے تو کیا کیمسٹ اس سے شادی کرنے پر رضامند ہے؟"

اور کیمسٹ "ابھی آیا" کہہ کر ایسا غائب ہوا جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔

یہ خبر بھی ننھے میاں کی تھی کہ ایم ایم کا کُنبہ نہایت مالدار اور بارُسوخ ہے۔

مشکوک کو دولت کا لالچ ہے یا کسی عہدے کا، کیونکہ یہ اکلوتی بیٹی ہے۔ جب بھی جنگلات والوں کی لاری میں لِفٹ مل جائے یہ ان کے ہاں پہنچتا ہے اور واپس آتے وقت چہرے پر وہ مُسکراہٹ ہوتی ہے جو الف لیلیٰ کے عُمرو عیّار کے منہ پر دکھائی جاتی ہے۔

”شاید یہ جنگلات والوں سے کچھ سیکھنے جاتا ہو۔“ فلاسفر بولا۔

مگر ننھے میاں کو پورا یقین تھا کہ یہ ایم۔ ایم ہی ہے جو اسے پڑھاتی سکھاتی ہے۔ جیسے فلم شروع ہونے پر ایکٹروں، موسیقاروں، مددگاروں وغیرہ کے ناموں کے بعد آخر میں سب سے اہم نام آتا ہے۔۔۔ اُس کا جس نے فلم ڈائریکٹ کی ہے۔ اسی طرح ایم۔ ایم ہی مشکوک کی اصلی ڈائریکٹر ہے۔

”ممکن ہے کہ وہ اسے اچھی اور مفید باتیں سناتی ہو۔“ فلاسفر نے کہا۔

لیکن ننھے میاں نہیں مانا۔ اس لیے کہ تہمیدہ جب بھی افواہیں پھیلاتی تو ایک دن پہلے اُسے ایم۔ ایم کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ملغوبہ جیسی خوش مزاج اور خوش خوراک کا مُوڈ محض تب خراب ہوتا ہے جب ایم ایم سے ملاقات ہو جائے۔

”محبوبہ کی یہ خوبی کسی نے نوٹ نہیں کی کہ بعض اوقات وہ اتنی بدمزاج نہیں ہوتی، جتنی کہ عموماً رہتی ہے؟“ فلاسفر نے ایک اور کوشش کی۔

ننھے میاں نے چھُپ کر یہ بھی دیکھا کہ صبح صبح وہ مشکوک کو خوب ڈانٹ رہی تھی اور وہ ہیں ہیں کر رہا تھا۔ اس پر کئیوں کو یقین نہ آیا۔ شاید اس لیے کہ مشکوک قد میں محبوبہ سے دُگنا تھا

”لیکن یہ علی الصبح کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ اتنی دور پیدل تو جا نہیں سکتا، خواہ کوچۂ یار ہی کیوں نہ ہو۔ اُس طرف صرف جنگلات کی لاری جاتی ہے۔ اور جو پروگرام لاری کا ہوتا ہے وہی مشکوک کا۔ کسی دن آپ کو لے چلوں گا۔“

میٹنی پر تیز آندھی سے بجلی فیل ہو گئی۔ اعلان کیا گیا کہ ان ہی ٹکٹوں پر فِلم کل دکھائی

جائے گی۔ ہال سے باہر نکلتے ہوئے مِلر نظر آ گیا۔ اپنے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرایا اور چاء کے لیے کہا۔

”تمہاری چاء بعد میں ہو گی۔ آج میری پسندیدہ دکان پر چلو۔“

وہ ہمیں نچلے بازار کے سِرے پر ایک بیکری میں لے گیا جو کیفے کا حصّہ تھی۔

”اس میدان میں ہمارے خیمے نصب تھے۔“ اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

"کئی برس ہوئے سڑکیں بنانے کے سلسلے میں اس وادی کے سارے حصّوں میں قیام رہا۔ اسی لیے چپّے چپّے سے واقف ہوں۔ پگڈنڈیاں تک یاد ہیں۔ یہ دُکان بھی تب کی ہے۔ ہمارے ماہر بیکر نے انہیں ٹریننگ دی تھی۔ بسکٹوں کے بعد ان کی ڈبل روٹی بھی چکھو۔"

واقعی ڈبل روٹی کیک سے بھی زیادہ مزیدار تھی۔

"اُن دنوں کی ایک اور چیز دکھاؤں۔۔۔۔۔" ہم ایک پرانی سی عمارت کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا۔ "دروازے کے پاس سفید پتھّر پر سیاہ الفاظ نظر آئے؟"

وہاں انگلش میں لکھا ہوا تھا کہ فلاں تاریخ کو ڈپٹی کمشنر اینڈرسن نے کرکٹ پیویلین کا سنگِ بنیاد رکھا۔

"اب اسے قریب سے بھی دیکھتے ہیں۔"

نزدیک پہنچ کر پڑھا تو جلی الفاظ کے ساتھ ساتھ باریک حروف بھی تھے۔۔۔۔۔

کرکٹ پیویلین کا سنگِ بنیاد

مسٹر بی ایف اینڈرسن۔ ایم بی ای سی ایس۔ ڈپٹی کمشنر

اپنے دستِ خاص سے نصب

نہ کر سکے کیونکہ موصوف کو اتنی گرمی لگی کہ ہمیں بتائے بغیر کشمیر چلے گئے۔

”اینڈرسن نے وعدہ کیا تھا لیکن آیا نہیں۔ اس لیے ہمیں اس قسم کا کتبہ لگانا پڑا۔ بعد میں ایک میچ ڈپٹی کمشنر کی الیون سے رکھا۔ موسم اچھا تھا اس لیے اینڈرسن بھی کھیلا۔ کتبہ دیکھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر اُتروائی۔۔۔۔کالج کے دنوں میں ضرور اسپورٹسمین رہا ہو گا۔“

آگے ایک طرف چبوترہ سا تھا۔

ہمارے سینیئر افسر نے یہاں قدِ آدم آئینہ لگوا دیا۔ کام پر نکلتے تو آئینے کے سامنے سے گزرتے، جس پر یہ فقرے لکھے ہوئے تھے۔۔۔۔

باہر جا رہے ہو تو اپنا لباس چیک کرو

پھر اپنی مسکراہٹ چیک کرو

مشکوک جیسے آدمی سے ملنے کے بعد ہم اجنبیوں سے کترانے لگے تھے لیکن مِلر کو سب نے پسند کیا، خصوصاً اس کی زندہ دِلی کو، اور بشاش گفتگو کو بھی جو ہمیشہ نپی تُلی

اور مختصر ہوا کرتی۔

اس نے بتایا کہ ہر سال جب مشرق کا چکر لگاتا ہے تو اس خوشنما وادی کی سیر بھی ہوتی ہے۔

”اگلی دفعہ لمبی جھڑی لگی تو تمہارے ہاں چاۓ پئیوں گا۔“

جھڑی کی شرط عجیب سی لگی۔ پوچھا تو کہنے لگا۔ ”تب ایک خاص نظّارہ دیکھیں گے۔“

کچھ دنوں کے بعد بارش شروع ہوئی تو اس کا وعدہ یاد آیا۔ روزانہ لاری کے ڈرائیور سے اسی بیکری کے بسکٹ منگواتے اور انتظار رہتا۔

پھر سوچا کہ شاید بھول گیا ہو گا۔ لیکن برستے مینہ میں وہ پہنچا۔ پلاسٹک کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں مُڑا اتُڑا وزنی ڈنڈا اور کندھے پر تھیلا۔

سب سے پہلے تو اسے ہماری رہائش کی زبوں حالی پر افسوس ہوا کہ ایسے بوسیدہ، اندھیرے کمروں میں رہنا مایوسی اور بیزاری کو خوش آمدید کہنا ہے۔ فوراً ان کی مرمّت کرانی چاہیے۔

"لکڑی کی دیواروں پر سفیدی کراؤ۔ اور جس قسم کے بلب لگا رکھے ہیں ان سے روشنی کی جگہ اداسی پھیلتی ہے۔ انہیں ابھی بدلو۔ پردے بھی ہلکے رنگ کے ہونے چاہئیں تا کہ اُجالا ان سے منعکس ہو سکے، نہ کہ ان میں جذب ہو کر رہ جائے۔ کمروں میں شوخ رنگ تصویریں لگاؤ۔۔۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو اسی وقت اپنا سامان اُٹھا کر کسی صاف سُتھرے اور روشن ریسٹ ہاؤس میں چلے جاؤ۔ کیونکہ ایسی جگہ رہ کر کسی قسم کی شادمانی یا جولانی کی توقع رکھنا نری بے وقوفی ہے۔"

ہم نے وعدہ کیا جب وہ اگلی مرتبہ آیا تو کمرے بہتر ہوں گے۔

چاء کے بعد بارش میں ہم سب باہر نکلے۔ ایک بالکل نئے شارٹ کٹ سے اس نے ہمیں پہاڑ کے بالکل دوسری طرف پہنچا دیا جہاں سے ایک درّہ شروع ہوتا تھا جو آگے جا کر کھُل جاتا۔

"جب اس وادی میں پہلی مرتبہ آنا ہوا۔" وہ کہہ رہا تھا "تو ہمیں پتہ تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بارش آسام میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ پہاڑ تیسرے یا چوتھے نمبر پر ہے۔ گرمیوں میں لگاتار برسات اور سردیوں میں برفباری کی طوالت سے تنگ آتے اور سورج دیکھے ہوئے کافی عرصہ گزر جاتا تو سیدھے اس درّے کا رُخ کرتے جو پرلے میدانوں کی طرف کھلتا ہے۔ وادی میں موسم کتنا ہی خراب ہو

لیکن یہاں سے ہمیشہ وہ دور دراز چمکیلا ہرا بھرا علاقہ نظر آتا ہے۔“

درّے کے پار نہایت خوشنما منظر دکھائی دیا۔ سبز شاداب کھیت تھے۔ ایک بل کھاتی ہوئی ندی چمک رہی تھی۔ دہنے بائیں سے نالے آ آ کر اس میں گِرتے۔۔۔۔ یہ دریا کا منبع تھا۔

”اور اس دلکش نظارے پر نگاہیں جماتے ہی روشنی کی دمک، دھوپ کی تمازت، سچ مچ محسوس ہونے لگتی۔ بچپن میں پڑھی ہوئی وہ کہانی یاد آ جاتی۔ کسی برفانی ملک کے حکمران کے سامنے ایک آدمی پیش کیا گیا جس پر جرم کا شُبہ تھا۔ جب کوئی ثبوت یا چشم دید گواہ نہ مل سکا تو فیصلہ ہوا کہ شہر سے باہر حوض میں وہ رات بھر کھڑا رہے۔ اگلے دن زندہ ملا تو بے قصور سمجھیں گے۔ جب اُسے کچھ نہ ہوا تو سب کو حیرت ہوئی۔ وجہ پوچھنے پر بتانے لگا کہ جونہی یخ پانی میں اُترا گھپ اندھیرے میں کہیں دور ٹمٹماتی روشنی نظر آئی۔ فوراً اس پر نظریں جمالیں اور پھر نہ ہٹائیں۔ آہستہ آہستہ یوں لگا جیسے روشنی کی گرمی آنکھوں سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں حلول کر رہی ہے اور اُمّید دِلا رہی ہے کہ کچھ دیر کے بعد صبح ہو گی اور سورج نکلے گا۔۔۔“

مِلر نے پائپ منگوایا۔ مرمّت شدہ تھیلے سے پھل نکال کر بانٹے اور فلاسفر کی

طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ”خوش رہا کرو۔ پریشان رہنے والوں کو کبھی کچھ نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو وہ اس سے لطف اندوز کبھی نہیں ہو سکے۔“

جب اسے یاد دلایا کہ یہ تو فلاسفر ہے۔ اس پر ایسا قہقہہ سُنا کہ پہاڑوں سے کئی مرتبہ گونج واپس آئی۔

”صرف اس لیے کہا تھا کہ میں خود اس دور سے گزر چکا ہوں۔ برسوں تک خُوب دل لگا کر پریشان رہا۔ شاید اس لیے کہ پریشان ہونا بے حد آسان ہے۔ لیکن سوائے اس کے کہ چہرے پر غلط جگہ لائنیں پڑ گئیں، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چہرے پر لائنیں پڑتی ہی ہیں تو فقط وہاں پڑنی چاہئیں جہاں مُسکراہٹ سے بنتی ہیں۔“

چھُٹی کے دن موسم نہایت اچھا تھا۔ شیطان کو دفعتاً یاد آ گیا کہ ہماری PIN-UP تصویریں بگاڑنے پر ننھے میاں کو ڈانٹنا باقی ہے۔

پگڈنڈیوں سے اُترتے ہوئے ہم کافی نیچے آ چکے تھے کہ حکومت آپا اوپر آتی دکھائی دیں۔ پیچھے پیچھے چند لڑکیاں تھیں اور آخر میں ننھے میاں۔

"آیئے آیئے۔۔۔ اُوپر آ جایئے۔" شیطان بولے۔ "اور اپنا حسین و جمیل چہرہ بھی ساتھ لایئے۔"

لڑکیوں کے سامنے وہ شرما سی گئیں۔ "سُنا بولے یہیں کہیں سرکس آیا ہوا ہے۔ سوچا کہ ننھے میاں کو وہاں لے چلیں۔"

"ہم کیوں لے چلیں؟ سرکس والوں کو ضرورت ہو گی تو خود آ کر اسے لے جائیں گے۔" شیطان نے کہا۔

"یا اللہ تیرا شُکر ہے۔" ننھے میاں آہستہ سے بولے۔ (شیطان کے قد کے سلسلے میں یہ فقرہ کبھی کبھی سُننے میں آتا ہے)۔ مگر شیطان نے یوں ظاہر کیا جیسے کیا جیسے کہیں سُنا اور

تصویروں پر پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"اگر واقعی وہ گودام تک پہنچ چکی ہیں تو ان میں کبھی کشش تھی ہی نہیں۔ کیونکہ چہرہ سچ مچ حسین ہو مونچھ، داڑھی، عینک اور سگار کے باوجود بھی اچھا لگے گا۔"

ننھے میاں نے اپنی تھیوری پیش کی۔

"شاید سرکس وہ ہے۔۔۔" انجنیئر نے رنگین خیمے اور قناتوں کی طرف اشارہ کیا جہاں ڈھول بج رہا تھا۔

"آپ کسی قسم کے انجنیئر ہیں؟" ننھے میاں نے پوچھا۔

"جیسے ہوا کرتے ہیں؟"

"لیکن امریکہ میں تو ریلوے انجن کے ڈرائیور کو بھی انجنیئر کہا جاتا ہے۔"

سرکس کے احاطے میں وہ ضِد کرنے لگا کہ جانوروں کو بیک گراؤنڈ میں رکھ کر ہماری تصویریں اتارے گا۔ آٹھ فوٹو لے کر اس نے لڑکیوں سے کہا۔ "بس کیمرے کی فلم ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے آپ مُسکرانا بیشک بند کر دیں۔"

"بڑوں کے ساتھ تمیز سے پیش آنا چاہئے۔" شیطان نے ڈانٹا۔

"چھوٹوں سے بار بار کہا جاتا ہے کہ اچھے آداب سیکھو۔ لیکن کس سے سیکھیں، یہ کوئی نہیں بتایا۔"

"بہر حال تمہارا رویّہ مایوس کُن ہے۔" شیطان بولے۔

''مگر مایوس تو مجھے ہونا پڑتا ہے؟'' جواب ملا۔

شیطان خفا ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ سرکس کا شو شروع ہو گیا۔ بالکل معمولی سا تھا۔ ایک تو جانور بہت کم تھے اور پھر انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ رنگ ماسٹر کا حکم نہیں

مانیں گے۔ باہر نکلے تو آئس کریم والے کو دیکھتے ہی مشکوک جو ہمیں سرکس میں ملا تھا۔ سڑک پار کر گیا۔

''کون ہے یہ بد تمیز؟'' حکومت آپا نے پوچھا۔ ''اِتنا باتونی ہے کہ اس کی آواز سُن سُن کر میرا گلا بیٹھ گیا۔''

''اسے مشکوک کہتے ہیں۔'' شیطان نے بتایا۔

''یہ شخص جو خود اپنا کارٹون معلوم ہوتا ہے، کیا اس کے بغیر تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا؟ مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا کہ یہاں بھی تم نے کوئی ہم ذوق ضرور ڈھونڈ لیا ہو گا۔''

''ڈھونڈا نہیں۔ آپ ہی تسمہ پیر کی طرح مسلط ہو گیا ہے۔''

"لیکن جس کے ہاں مقیم ہے وہ اسے جینئیس سمجھتا ہے۔" فلاسفر نے حمایت کی۔

"جینئیس کا تو پتہ نہیں۔ البتہ جِن ضرور لگتا ہے۔" حکومت آپا نے کہا۔

چاء پر سب سے حکومت آپا کا آفیشلی تعارف کرایا گیا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" مشکوک بولا۔

"کسی اجنبی سے بات کیے بغیر یکایک کیسے خوشی ہو سکتی ہے؟" حکومت آپا نے پوچھا۔

"ملاقات پر واقعی خوشی ہوئی ہے۔" مشکوک نے محض رسماً کہہ دیا۔

"اگر مان لیا جائے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو جھوٹ کے سر میں سینگ ہوتے ہوں گے۔"

شیطان نے موضوع بدلنے کے لیے مشکوک کی اُنگلی میں بندھی ہوئی پٹّی کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ صبح صبح مسوڑھوں پر منجن رگڑتے وقت انگلی دانتوں میں آگئی۔

حکومت آپا نے ڈاکٹر کو مشورہ دیا کہ ANTI-RABIC ٹیکوں کا کورس شروع

کرانا کیسا رہے گا؟ مشکوک نے منہ اور بھی بُرا بنالیا۔

شیطان نے پھر بات ٹالی۔۔۔ ”ہم پہاڑ پر ہیں اور رضیہ میدانوں میں پتہ نہیں وہاں کتنی گرمی ہو گی۔“

”میں پوچھنا بھول گئی۔۔۔ اس وادی میں موسم عموماً کیسا رہتا ہے؟“

”جولائی اگست ستمبر موسلادھار بارش کے مہینے ہیں۔ البتہ جون میں تمہارے مزاج جیسی تمازت ہوتی ہے۔ اور نومبر سے فوری تک سب کچھ یُوں یخ رہتا ہے جیسے تمہارا دِل۔۔۔“

”دیر ہو گئی۔۔۔۔“ حکومت آپا نے گھڑی دیکھی۔ ”آج کافی وقت ضائع کرنا پڑا۔“

”جو کہتے رہتے ہیں کہ وقت ضائع مت کرو، شاید وہ نہیں جانتے کہ وقت بھی آہستہ آہستہ اُنہیں ضائع کر رہا ہے۔“ شیطان بولے۔

حکومت آپا اور لڑکیاں جانے لگیں تو ہم دونوں انہیں چھوڑنے نکلے۔

راستے میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ جب لڑکیاں اندر چلی گئیں تو حکومت آپا نے

شیطان سے کہا۔ ”یہ دیکھ لینے کے بعد کہ میرا قیام کہاں ہے، کبھی اس طرف آنے کو جی چاہے تو بیشک تشریف مت لانا۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے۔“ شیطان نے شکایت کی۔ ”خصوصاً جب تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تقریباً آٹھ برس سے مجھے پہلے رضیہ کا اور بعد میں تمہارا خیال رہا ہے۔ مگر ان آٹھ برسوں میں پہلے رضیہ اور بعد میں تمہاری طرف سے مکمل بے توجہی رہی۔ یہ آٹھ سال اداسی کے تھے۔ یہ آٹھ سال مایوسی کے تھے۔۔۔۔۔“

”انہیں جمع کرنے پر میزان چوبیس سال بنتا ہے یعنی جب تم ننھے سے بچّے تھے تب سے بِلا دیکھے میرا خیال رہا۔۔۔۔۔۔“

”اور رضیہ کا بھی۔“ شیطان نے لقمہ دیا۔ ”اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ رضیہ کی غیر موجودگی میں تم اس وادی کی سب سے دلکش لڑکی ہو۔ یعنی اُس ٹیلے، اس مکان اور سڑک کے درمیان جو علاقہ ہے، اس کی۔۔۔۔“

”اور تمہارا چہرہ اس وادی کے خوشنما مرغزاروں کے کسی مُرجھائے ہوئے پھول کی طرح تروتازہ دکھائی دے رہا ہے۔“

”شاید پرانا زمانہ بہتر تھا۔“ شیطان ٹھنڈا سانس بھر کر بولے۔ ”تب نہ تو لڑکیوں

سے ملاقات کے موقعے ملتے تھے، نہ ان کے ایسے ایسے فقرے سننے پڑتے ہوں گے۔ بس کسی تنہا گوشے میں آہیں بھر بھر کے یاد کر لیا۔ جدائی میں محبوبہ کے خوشگوار تصوّر کو برقرار رکھنا کتنا آسان ہے۔ مگر ان دنوں محبت بھی دیرپا ہوتی ہو گی۔ کیونکہ محبوبہ کا چہرہ صابن سے دُھلنے کے بعد بھی پہلے جیسا ہی رہتا ہو گا۔"

"بعض اوقات تمہاری باتیں اتنی معقول لگتی ہیں کہ تعجّب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تم ایسے شاعر معلوم ہوتے ہو جس نے شاعری کبھی نہ کی ہو۔"

"مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ خصوصاً اس پر کہ تم سمجھاتو سب کچھ سکتی ہو لیکن سمجھ بالکل نہیں سکتیں۔ تم جہاں ناز سے قدم رکھتی ہو وہاں کیلے کے چھلکے بچھانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ جاؤ مت۔۔۔۔ ابھی ٹھہرو۔۔۔ میں کچھ اور دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔"

گیٹ کی طرف جاتی ہوئی حکومت آپا کو یہ بھی بتایا۔۔۔ "یاد رکھنا کہ مجھے پہلے رضیہ کا انتظار رہے گا، بعد میں تمہارا۔ میں ابد تک منتظر رہوں گا اور اس کے بعد EXTENSION مانگوں گا۔۔۔" دفعتاً تیز جھونکے سے حکومت آپا کا دوپٹہ اُڑ گیا جسے شیطان نے پھرتی سے دوڑ کر دبوچ لیا۔ اور واپس دیتے ہوئے گلہ کیا۔۔۔ "تم نے میری فیلڈنگ کی داد نہیں دی۔"

اگلے پکنک پر حکومت آپا اور ننھے میاں کو بھی بلایا گیا۔

مشکوک ان سے پَرے پَرے رہا۔ کھیلوں کے بعد چاء تقسیم ہو رہی تھی کہ حکومت آپا سے آمنا سامنا ہو گیا۔

"آپ پہلے سے بہتر لگ رہے ہیں۔ ان دِنوں کیا بیمار رہے تھے؟" انہوں نے مشکوک سے پوچھا۔

"محترمہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔" اس نے احتجاج کیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں بھی تو آپ کو بالکل نہیں جانتی۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ کچھ بتانا ہو تو صاف صاف کہا کریں، کیونکہ آدھی یا پونی نامکمل بات تب کی جاتی ہے جب دوسرے کو پریشان کرنا ہو اور اتنی تیز گفتگو بھی اچھی نہیں لگتی کہ الفاظ مشین گن سے فائر کیے جا رہے ہوں۔ سُننے والوں کو چھینک آ جائے یا کھانسی تو فوراً تین چار فقرے گزر جاتے ہیں۔ ذرا دیر پہلے آپ نے ڈیمو کریسی کہا لیکن DEMOCRAZY سُنائی دیا اور فلاسفی بالکل فولو سفی لگی۔ کئی لفظ تو سمجھ میں ہی نہیں آئے۔"

"اگر آپ ذکی الحس اور وسیع النظر ہوتیں تو سمجھاتا۔ جب یہ خصوصیتیں غائب

ہوں تو کچھ کہنا سُننا بیکار ہے۔"

"اگر میں ذکی الحس اور وسیع النظر۔۔۔ ان کے معنے جو بھی ہوں گے۔۔۔۔ ہوتی تب بھی یہی کہتی کہ باتیں کم کی جائیں تو بہتر ہو گا۔ جیسے گوالے دودھ میں پانی ملاتے ہیں، اسی طرح زیادہ بولنے سے گَنے گنائے خیالات اور ہلکے ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی اگر اصلی مطلب معلوم کرنا ہو تو ساری گفتگو کو نو یا دس پر تقسیم کرنا پڑتا ہے۔"

اتنے میں ننھے میں نے وہ فوٹو نکالے جو سرکس میں اُتارے تھے۔ تصویریں یونہی سی تھیں۔ مشکوک کو بالکل پسند نہیں آئیں۔ "اتنی دُور سے اُتاری ہیں کہ چہرے پہچانے نہیں جاتے۔ CLOSEUP لینے چاہئیں تھے۔" اس نے کہا۔

حکومت آپا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر PANSY کا پھول تلاش کر کے توڑا۔

"کلوز اپ دیکھنا ہو تو اس پر بنا ہوا ہے۔" انہوں نے پھوں دکھایا۔ واقعی اس پر رنگوں سے جو ڈیزائن بنا ہوا تھا مشکوک کے مُعنّک چہرے کا عکس لگتا تھا۔

وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ بات اس کے ہونٹوں تک آئی پھر جیسے یکلخت ہالٹ کر دیا۔ شاید اپنی بات کا جواب حکومت آپا کے چہرے پر پڑھ لیا تھا۔

اس کے یُوں خاموش ہو جانے پر سب کو اطمینان ہوا۔ پہلی مرتبہ کسی نے اُسے چُپ کرایا تھا۔

اتوار کو ننھے میاں دو تین دفعہ آیا اور کھُسر پھُسر سی ہوتی رہی۔ معلوم ہُوا کہ وہ پروگرام بن رہا ہے جس کے لیے صبح چار بجے اُٹھ کر کئی میل پیدل چلنا ہو گا۔ سوچا کہ بوندا باندی میں ایسے وقت میں کون جاگے۔ یہ واپس آئیں گے تو بتا دیں گے کہ کیا ہوا تھا۔ لیکن ان کی آوازوں سے آنکھ کھل گئی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ بادلوں کے گالے نیچے اُتر رہے تھے۔

ہم چلے گئے حتیٰ کے ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔ تیسرے چوتھے موڑ کے بعد مشکوک کی محبوبہ کا مکان تھا۔ کہرا اور بادل نہ ہوتے تو سورج کبھی کا نکل آیا ہوتا۔ آخری نکّڑ پر ننھے میاں ملا۔ وہ ان درختوں تک لے گیا جن کے پیچھے ہمیں چھپنا تھا۔

وہاں سے جو نظارہ دیکھا وہ اس سے مختلف نہیں تھا جب مشکوک کو سپاہیوں نے

مشتبہ سمجھ کر گھیرا۔ فرق تھا تو اتنا کہ وہاں دو مرد تھے اور یہاں ایک عورت، جو اسے ڈانٹ بھی رہی تھی۔

پسپا ہوتے ہوتے وہ پھاٹک تک پہنچ جاتا۔ پھر رُخ بدل کر اُلٹا گیئر لگاتا۔ محبوبہ سیدھی چلتی چلتی اسے برآمدے تک لے جاتی۔ وہاں سے پھر واپس لوٹتے۔

فاصلے کی وجہ سے باتیں نہ سُن سکے۔ لیکن اس کے چہرے اور ہاتھ پھیلانے کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ وہی پائیں پائیں پائیں ہو رہی ہو گی۔

"بھیڑ کی کھال میں سے بھیڑیا شاذو نادر ہی برآمد ہوا۔" انجنیئر نے میرے کان میں کہا۔ "وہ رات یاد آ گئی جب نچلے قصبے میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ تب اس سے واقفیت کا آغاز ہوا تھا۔ اب اختتام کا انتظار ہے۔۔۔۔"

لاحول پڑھتے ہوئے تیزی سے واپس لوٹے۔ کیمپ پہنچتے پہنچتے موسم کھل گیا۔ راستے میں جیپسی مِلر ملا جو پانچ چھ سیر وزنی ٹیڑھا ترچھا ڈنڈا اُٹھائے سیر کر رہا تھا۔

ایک کونے پر اس نے قوسِ قزح دکھائی۔۔۔۔ "دھنک جھڑی ختم ہونے پر نکلتی ہے۔ اب مطلع صاف رہے گا۔" سب مُسکرانے لگے۔

پھر دیکھا کہ وادی سے گہری دُھند اُٹھ رہی ہے تو مُسکراہٹیں رُک گئیں۔

مگر ایک اور نظّارے نے حوصلے بلند کر دیئے۔۔۔ سب سے نچلی سڑک پر مشکوک لاریوں کے اڈّے کی طرف جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے اس کا سامان اٹھائے ہوئے دو قُلی۔

یہ فسوں بھی عارضی ثابت ہوا۔ وہ دونوں آدمی ایک طرف مُڑ گئے اور مشکوک دوسری جانب۔ جب چھینک لیتے ہوئے اس نے منہ اُوپر کیا تو دیکھا کہ یہ تو کوئی اور تھا جو ہمیں محض خوش فہمی سے مشکوک نُماد کھائی دیا۔

آگے چل کر شیطان نے اشارہ کیا۔۔۔ اس مرتب واقعی مشکوک تھا جو آہستہ آہستہ ہانپتا ہوا نیچے سے آ رہا تھا۔ پھر ترِچھی پگڈنڈی پر ایک لڑکی چڑھائی طے کرتی نظر آئی۔ اگلے چوک پر ان دونوں کی مُڈھ بھیڑ لازمی تھی۔ مشکوک نے پہلے تو چھُپنے کی کوشش کی لیکن جھاڑیاں اس کے سائز چھوٹی تھیں۔ اس لیے فوراً سڑک چھوڑ کر نیچے جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ اب وہ لڑکی سے دُور جا رہا تھا۔

وہ ذرا اُوپر آئی تو حکومت آپا نکلی جو شاید ننّھے میاں کی تلاش میں تھی۔ مشکوک کے اس طرح فرار ہونے پر سب کے چہرے روشن ہو گئے۔

”ایک عظیم سائنسدان نے کہا تھا کہ کرۂ ارض پر طرح طرح کے خطرناک

PATHOGENS ہیں۔" مِلر بولا "جراثیم، وائرس، زہریلی چیزیں۔۔۔۔۔۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان سب میں سفاک ترین پیتھوجن خود انسان ہے۔" وہ شارٹ کٹ سے ہمیں پہاڑ کے اس طرف لے جارہا تھا۔

"اسے اتفاق سمجھ لو۔ تقدیر یا قدرت کی سِتم ظریفی کہہ لو۔" وہ بتانے لگا "لیکن مشکوک جیسے آدمی ہر SETUP میں ملتے ہیں۔ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کرو لیکن یہ کہیں نہ کہیں سے آجاتے ہیں۔ آبادی ہو یا ویرانہ، بزنس، ملازمت، زمیندارہ یا کوئی اور دھندہ۔۔۔ ہر جگہ اس طرح کا کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا۔ اگر ایسوں کو دُور نہیں رکھ سکتے کو کُڑھنے کی بجائے انہیں نظر انداز کرنا سیکھو۔ جیسے کسی سے بُرے پڑوسی یا پُرانے عارضے سے بھی بے اعتنائی برتنی آجاتی ہے۔ اور یہ آدمی تو منصوبہ باز معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کسی چکر میں یہاں آیا ہے۔ میں پھر وہی دوہراؤں گا جو پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔۔۔ یہی کہ ایسے ماحول اور حالات سے بے تعلّق رہنے کی کوشش کیا کرو۔ ان سے بیگانگی بہتر ہے۔ اور پھر اس سیّارے پر کچھ بھی تو نہیں جو بہت زیادہ اہم ہو۔ نہ واقعات کی مستقل اہمیت ہے نہ افراد کی۔ اتنی بڑی کائنات میں یہ سب معمولی اور عارضی ہیں۔ بس کسی طرح یاد دہانی ہوتی رہا کرے کہ یہ گھڑی بھی گُزر جائے گی۔۔۔۔ جو آج محسوس کر رہے ہو وہ اگلے مہینے نہیں کرو گے۔ جو تب بیحد ضروری لگے گا وہ اگلے سال تک بدل چُکا ہو

گا۔۔۔۔۔"

اب ہم اس موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں سے وہ درّہ شروع ہوتا تھا۔

اس نے دریا کے منبع کی طرف اشارہ کیا جو دُور جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ جہاں ہرے بھرے میدان دھوپ سے روشن تھے۔ "اور اس خطّے کو بھی دیکھ لیا کرو۔ جہاں موسم مختلف ہے، تنہائی نہیں ہے اور دُھند بھی نہیں۔۔۔۔نہ اصلی دُھند اور نہ انسان کی لائی ہوئی۔"

ڈینیوب

ٹرین کی کھڑکی سے ایک دریا نظر آیا جو گھُوم کر پہاڑیوں میں چھُپ گیا۔ آگے چل کر سامنے آ گیا۔ کچھ دُور ساتھ دے کر پھر مُڑ گیا۔

"یہ کون سا دریا ہے؟" مُجد ہی نے 'زہے روانیٔ عُمرے کہ در سفر گزرہ' گنگناتے ہوئے پوچھا۔

"ڈوناؤ۔۔۔" جرمن لہجے میں جواب ملا۔

"استروس۔۔۔" یونانی بولا۔

"ڈوناریا۔۔۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

ہیمل نے عینک اُتاری، ریلوے ٹائم ٹیبل بند کر کے وی آنا کا نقشہ سمیٹنے لگا۔

"جانتے نہیں یہ وہی مشہور بین الاقوامی دریا ہے، کسی کا ڈونا، کسی کا ڈوناؤ اور سب کا

بلیو ڈینیوب۔۔۔۔"

ہم تینوں زِلبر مین کی دعوت پر وی آنا جا رہے تھے۔ اس نے تاکید کی تھی کہ ضرور بضرور آنا۔۔۔ اگر کوئی بہانہ کیا تو عُمر بھر نہیں بولوں گا۔ زِلبر مین چالیس بیالیس کا پلا ہوا نوجوان تھا جس کا پورا نام اتنا مشکل تھا کہ لندن میں مجد ہی نے اُسے دِلبر کہنا شروع کیا۔ وہ کئی برس سے نفسیات کا مطالعہ کر رہا تھا اور بڑی تیزی سے گنجا اور وزنی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح دوسری شادی ہو جائے۔ ورنہ پھر پہلی بیوی ہی سے صلح ہو جائے۔ اخباروں میں اغوا اور بھاگ جانے کی خبریں پڑھتا تو ٹھنڈی آہ بھرتا۔۔۔ "دیکھا، پھر کوئی خوش نصیب اپنے محبوب کو بھگا کر لے گیا۔ صد حیف کہ میرے ساتھ کبھی کوئی نہ بھاگا۔ ایک دفعہ بھی تو خوشگوار تجربہ نصیب نہیں ہوا۔۔۔"

مجد ہی دلجوئی کرتا۔۔۔ "دِلبر جی بُرا نہ کرو۔ ہم جو تمہارے ساتھ بھاگنے کو تیار ہیں۔ بس حکم دو۔۔۔۔"

اپنی پہلی بیوی جوہانا کے متعلق نہ کبھی اس نے تفصیلاً بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔ اتنا سُنا تھا کہ دس گیارہ برس پہلے شادی ہوئی تھی اور جونہی دِلبر نے نفسیات کی ڈگریاں لینی شروع کیں دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔

نفاست پسند، خوش پوشاک، ہنس مکھ مجد ہی کو ہم جماعت مشرقی موسیو کہا کرتے۔ شاعری، راگ رنگ کا یہ دلدادہ تفکّرات کو قریب نہ آنے دیتا۔ اُلجھنوں پریشانیوں پر کندھے ہلا کر کہتا: "دوستو زندگی اتنی طویل نہیں کہ اسے معمولی باتوں پر کُڑھنے میں ضائع کیا جاسکے۔۔۔۔"

کلاس میں جب پہلی مرتبہ ہم دونوں اکٹھے بیٹھے، تو دیکھا کہ جہاں سب بائیں سے دائیں کو لکھ رہے ہیں وہاں مجد ہی بڑی تیزی سے دائیں سے بائیں لکھ رہا ہے۔ لیکچر ختم ہوا تو میں نے اشارۃً امتحان کا ذکر کیا کہ سوالوں کے جواب بائیں سے دائیں یعنی انگریزی میں دینے ہوں گے۔ ہنس کر بولا:

"میں تو ان عالم فاضل پروفیسروں کے بیش قیمت لیکچر سُننے آیا ہوں۔ امتحان تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

چنانچہ ہیمل، دِلبر اور میں چند امتحانوں کے بعد اے بی سی ڈی کے مختلف حروف حاصل کر چکے تھے، لیکن مجد ہی کو کوئی ڈگری نہ مل سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ برطانوی یونیورسٹیوں کو اس کی قابلیت کا اعتراف نہ تھا۔ اس نے کوئی امتحان ہی نہیں دیا۔ لہٰذا دوستوں کو مجبوراً ایک اعزازی ڈگری (M۔ S & R L(London دینی پڑی۔ وہ اب ماسٹر اف رمبا اینڈ سامبا (لندن) بن چکا تھا۔ یہ

حقیقت تھی کہ رقص گاہوں میں وہ رمبا اور سامبا اس خوبصورتی سے ناچتا کہ پارٹنروں کی قطار بندھ جاتی۔ یہ ڈگری اس کے نام کے ساتھ لکھی جائی، وی آنا کے ہوٹل میں بُکنگ کراتے وقت بھی اس ڈگری کو خاص طور پر شامل کیا گیا۔

وہ پہلے بھی وی آنا ہو آیا تھا۔ دِلبر کے بلاوے پر کہنے لگا۔۔۔ ”پیشتر اس کے کہ واپس وطن پہنچ کر دفتروں میں فائل کر دیا جاؤں، کیوں نہ وی آنا کی پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔۔۔“

ہیمل انگریز تھا۔ لیکن ایسا انگریز جس کا پڑدادا جرمن تھا۔ دادا سوئٹزرلینڈ سے انگلستان چلا گیا۔ باپ کچھ کچھ جرمن نژاد انگریز رہا۔ مگر ہیمل دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی فوج میں شامل ہو کر جرمنوں سے لڑا۔ بقول دِلبر جرمن، سوِس اور انگریز ہیمل ایک طرح کا سہ آتشہ بن چکا تھا۔

ہیمل بڑا پریکٹیکل انسان تھا۔ وی آنا پہنچنے سے پہلے اسے ساری ٹرینوں کے اوقات، وہاں کے ہوٹلوں کے کرائے، مقامی زبان کے عام فقرے سب زبانی یاد تھے۔ اس کے صندوق میں فالتو عینک تھی۔ روزمرہ کے استعمال کی دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان، سفری چیک، کچھ بٹوے میں تھے، کچھ صندوق میں اور بقیہ تھیلے میں۔۔۔ کہ کہیں سارے چیک اکٹھے ہی نہ کھو جائیں۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتا۔

ہر گزرنے والے اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کرتا، پھر ٹائم ٹیبل دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتا کہ ٹرین ٹھیک چل رہی ہے۔

جرمنی کے سرسبز و شاداب جنگل بلیک فارسٹ سے دو چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں۔ بویریا کے ملک میں ان سے ایک اور ندی آ ملتی ہے جو نوخیز ڈینیوب کو دریائے رائن سے ملاتی ہے۔ ڈینیوب پیچ کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جرمن شہر اُلم اس کے کناروں پر آباد ہے جہاں آئن سٹائن پیدا ہوا۔ یہیں ڈیڑھ سو سال پہلے انسان نے پرندے کی طرح اُڑنے کی پہلی کوشش کی۔ ایک درزی نے کپڑے کے پَر سیے اور انہیں باندھ کر اونچے مینار سے چھلانگ لگا دی۔ سیدھا ڈینیوب میں گیا اور اللہ کو پیارا ہوا۔ جہاں دریا جرمنی سے آسٹریا میں داخل ہوتا ہے وہاں پاسو ہے جو دنیا کے سات حسین ترین شہروں میں گنا جاتا ہے۔ یہاں کیمرے یا مصوّری کے سامان کے بغیر آ جاؤ، تو لوگ بُرا مانتے ہیں اور بدمذاق سمجھتے ہیں۔ آسٹریا میں شہتوت اور

زیتون کے درختوں، انگور کی بیلوں اور اونچی پہاڑیوں میں سے گزرتا ہوا ڈینیوب آخروی آنا کو چھوتا ہے جس نے اسے اتنا مشہور کیا ہے۔ آگے چل کر چیکوسلوواکیہ اور ہنگری کی سرحد بناتا ہے۔ پھر مُڑ کر قدیم بوہیمیا کے ہرے بھرے مرغزاروں میں سے ہوتا ہوا دو شہروں بوڈا اور پسٹ کے بیچ میں سے اس طرح گزرتا ہے کہ دونوں مِل کر بوڈاپسٹ بن جاتے ہیں۔ ہنگری میں جگہ جگہ شاخوں میں بٹتا ہے۔ یہ شاخیں دوبارہ ملتی ہیں تو نہایت خوشنما جزیرے بنتے ہیں۔ پھر یوگوسلاویہ کی سرحد آتی ہے اور بلگراڈ۔ وہاں سے ایک خاصا بڑا دریا ساتھ مل کر مشرق کی سمت میں مُڑ جاتا ہے اور یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ رومانیہ میں داخل ہوتے وقت اسے مشہور ''آہنی دروازے'' میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارپیتھین پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں اتنا بڑا دریا سمٹ کر تند و تیز ندی بن جاتا ہے اور ساٹھ میل تک بڑی تیزی سے جاتا ہے۔ ''آہنی دروازے'' کا نام ترکوں کا دیا ہوا ہے کیونکہ پانی میں چھپی ہوئی چٹانوں کی وجہ سے یہاں جہازرانی بہت مشکل ہے۔ کئی چٹانوں پر کتبے کھدے ہوئے ہیں جن میں جرمن بادشاہ تراجن کی تعریف ہے (تراجن کی زبانی)۔ دُور دُور تک تُرکوں کے قلعوں کے کھنڈر ہیں۔ غالباً سب سے اُونچی باباکائی کی چٹان ہے (تُرکوں کے پانچ سوسالہ دورِ حکومت میں باباکائی شاید کوئی بزرگ ہوں گے جنھوں نے اس چٹان پر

بسیرا کیا ہو گا۔ یہ ان ہی کی برکت ہے کہ چٹان کی ملکیت پر رومانیہ اور بلغاریہ والے اب تک جھگڑ رہے ہیں)۔ پہاڑ ختم ہوتے ہیں تو ایک نئ سرحد آتی ہے۔ ایک طرف رومانیہ دوسری طرف بلغاریہ۔ آہستہ آہستہ منزل قریب آنے لگی ہے۔ پورٹ اسٹویل آتی ہے اور دریا تھک کر بالکل لیٹ جاتا ہے۔ اس کا پانی چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ سارے علاقے کو دلدل میں تبدیل کر کے اتفاق سے ایسے سمندر میں جا پہنچتا ہے جو ہر طرف سے بند ہے سوائے فاسفورس کی طرف سے۔

بلیک فارسٹ سے بلیک SEA تک یہ پونے دو ہزار میل کا سفر طے کرتا ہے۔ خانہ بدوش اسے بے گرد و غبار سڑک کہتے ہیں۔ (ہنگری میں ان دِنوں بھی بیس اکیس ہزار خانہ بدوش ہیں اور آس پاس کے علاقوں میں جِپسی موسیقی کی دُھنیں۔۔۔ "مفلس عاشق" اور "خانہ بدوش نواب" بہت مقبول ہیں)

شاید ہی اتنے موڑ پیچ کسی اور دریا میں ہوں۔ اتنے ملکوں کی سرحدیں بنانے کا کام بھی کسی اور دریا کے حصّے میں نہیں آیا۔ ان سب ملکوں کی تقریباً چار سو ندیاں اور دریا ڈینیوب سے آ کر ملتے ہیں۔ اور ایک نہر کے ذریعے بحیرۂ اسود کو بحرِ شمالی سے مِلا دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے دریا کو قابو میں لانا کس قدر مشکل ہو گا۔ جہاز رانی کے سلسلے میں برسوں کانفرنسیں ہوتی رہیں اور متعلقہ ملک ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے۔

اس کا طویل سفر بڑا دلچسپ ہے۔ کہیں میلوں تک تنہائی ہے، تو کہیں رونق ہی رونق۔ کہیں اونچی اونچی برفانی چوٹیاں ہیں، کہیں دُور دُور تک کنول کے پھُول، گلاب اور لالہ کے تختے اور ان کی مہک۔ کہیں چیڑ کے جنگل، شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں کے جھُرمٹ، انگور کی بیلیں، سبزے اور خُودرو پھولوں سے ڈھانپی ہوئی پہاڑیاں، ہرے بھرے کھیت۔ پھر خشک پتھریلی چٹانیں اور آخر میں عریض دہانہ اور ٹاپوؤں میں بسیرا کرنے والے بے شمار پرندے۔

یہ دریا بلقان کی سب ریاستوں کی نمائندگی کرتا ہے، سوائے یونان اور ترکی کے۔ لیکن کسی زمانے میں یہ سارا علاقہ ترکوں کا تھا، مدّتوں یہ اُن کا دریا رہ چکا ہے۔

بلقان کی سیاست کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدیوں تک بلقان کا نام ”یورپ کا بارود خانہ“ تھا۔ اس وسیع علاقے میں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں جن کے لباس مختلف ہیں۔ زبان، بود و باش، مذہبی عقیدے، سب مختلف ہیں۔ اگر یہ اپنے اپنے ملکوں میں رہتے تو کوئی بات بھی تھی، لیکن رومانیہ والے بلغاریہ میں رہتے ہیں اور بہت سے بلغاریہ والے تُرکی میں۔

اور سب فخریہ کہتے ہیں کہ ہم کسی اور جگہ سے آئے تھے۔ مثلاً البانیہ والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ الیرین لوگوں کی اولاد ہیں جو تین ہزار سال قبل مسیح آئے تھے (پتہ نہیں کہاں سے؟)۔ رومانیہ والوں کو یقین ہے کہ وہ روم سے آئے تھے۔ دیکھا جائے تو گِنے گُنائے لوگ تو تفریحاً اِدھر اُدھر آ جا سکتے ہیں لیکن مُلک ایک دوسرے میں خلط ملط تبھی ہوتے ہیں جب کوئی خاص وجہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ سب ایک ہی عظیم قبیلے کے افراد ہوں جنھوں نے مختلف نام چُن لیے ہوں۔۔۔۔ بوہیمیا، بی تھینیا، سلوویکیہ، سلیشیا۔۔۔ بہرحال یہ اپنے نام کے ساتھ پرانے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتے۔ جیسے کہ بہت سے حضرات غزنوی، بخاری، بغدادی، کرمانی وغیرہ کہلاتے ہیں۔

مذہبی فرقے بھی بے شمار ہیں۔ رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ، مُسلمان، یہودی، آرمینین کیتھولک، سادے کیتھولک۔

ڈینیوب سے جتنے جرائم، قتل، سازشیں اور فسادات وابستہ رہے ہیں، اتنے شاید ہی کسی دوسرے دریا سے رہے ہوں۔ اس دریا کے کناروں نے بڑی رسّہ کشی دیکھی ہے۔ اس طرف والے دریا عبور کر کے اس طرف جا پہنچے۔ پھر وہ انہیں واپس دھکیلتے دھکیلتے اتنی دور لے جاتے کہ خود کہیں اور چلے جاتے۔ یا اگر لوٹے بھی تو

اتنے عرصے میں ملک کا نام بدل چکا ہوتا۔ آج رومانیہ، ہنگری پر حملہ کر رہا ہے تو کل بلغاریہ یوگوسلاویہ پر۔ سیمی فائنلز ہوتے۔ آخر میں فریقین کو برابر برابر چھڑا دیا جاتا اور چند عہد نامے ظہور میں آتے۔ دو تین برس میں لوگ تازہ دم ہو کر پھر تیار ہو جاتے۔ کوئی کسی کو خوامخواہ قتل کر دیتا اور یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ جب ٹورنامنٹ سے جی بھر جاتا تو سب بادشاہ، نواب، ڈیوک اکٹھے ہو کر کانفرنس کرتے۔ کبھی ایک ایک ملک کے دو دو حصّے کر دیئے جاتے، تو کبھی تین کے دو بنا دیئے جاتے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے موریویا اور بوہیمیا کو سِرے سے غائب کر دیا گیا۔ مقدونیہ کو یوگوسلاویہ میں شامل کر دیا گیا۔ اُدھر آسٹریا میں چیکوسلوواکیہ کو جمع کر کے پھر تفریق کر دیا گیا۔ جنگِ عظیم کے بعد سربیہ اور رومانیہ بڑھا دیئے گئے۔ بلغاریہ گھٹتا چلا گیا۔

وہ پہیلی یاد آ جاتی ہے کہ دریا کو عبور کرنا ہے۔ ایک طرف شیر، بکری اور پھول ہیں۔ پہلے بکری دریا کے پار جائے گی، کیونکہ شیر پھولوں کو کچھ نہیں کہے گا۔ دوسری دفعہ شیر جائے گا اور بکری واپس آ جائے گی۔ تیسری دفعہ پھول جائیں گے۔ چوتھی دفعہ بکری وغیرہ وغیرہ۔

وی آنا کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے 'کیفے موزارٹ' کا بورڈ نظر آیا تو ہم چونکے۔

دِلبر کا مکمل پتہ مجد ہی نے کہیں کھو دیا اور اُسے خط کا فقط یہ فقرہ یاد تھا۔۔۔ ''کیفے موزارٹ کے آس پاس جو سب سے عجیب مکان ہو وہاں میرا پتہ پوچھ لینا۔۔۔۔''

سب سے عجیب و غریب مکان تلاش کیا۔ جس میں کئی گنبد تھے، گرجے کی وضع کی نوکدار چھت تھی اور تین چار یونانی ستون بھی تھے۔ لیکن وہاں دِلبر کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر ایک پرانی وضع کا محل نما مکان دیکھا۔ اس کے بعد ایک عظیم الشان عمارت جو آسیب زدہ معلوم ہوتی تھی اور ایک اور مکان جسے کہیں مشرقِ وسطیٰ میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔

آخر ڈاکخانے والوں سے پوچھا۔ تو دِلبر ایک سیدھے سادے فلیٹ میں سوتا ہوا ملا اور فوراً تینوں سے باری باری بغل گیر ہوا۔ ہم نے تلاش کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا۔۔۔

''جو مکان تم نے دیکھے وہ وی آنا کے لیے عجیب ہر گز نہیں ہیں۔ ہمارے لیے تو یہ سپاٹ ہونّق فلیٹ بالکل نئے ہیں اور عجیب و غریب ہیں۔۔۔''

دس بجے ناشتہ کیا جو کافی اور کلچوں پر مشتمل تھا۔ بارہ بجے تک اس نے حجامت کی،

ڈیڑھ بجے کپڑے پہن کر تیار ہوا۔ لنچ کے لیے گئے۔ کھانا اڑھائی بجے سے شروع ہو کر چار بجے ختم ہوا۔ آدھ پون گھنٹے اونگھنے میں گزرا۔ پانچ بجے ایک کیفے میں جا بیٹھے جہاں بہت سے آدمی کافی کے بہانے ہماری طرح بیٹھے انگلیاں چٹخا رہے تھے اور جمائیاں لے رہے تھے۔ شام ہو چکی تو اس نے پہلی مرتبہ گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا:

"چلو کہیں چلیں۔۔۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"آج مجد ہی اور تم سے بدلہ لینا ہے۔ یاد ہے پیرس کی وہ شام؟"

پیرس میں دِلبر، مجد ہی اور میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور رات کو ہم دونوں دِلبر کو کھینچ کر ایسے محلّے میں لے گئے جسے بوہیمین طبقے کی رہائش گاہ کہا جاتا ہے۔ جیب کترے، چور، اچکے، ایک سے ایک عجیب کیریکٹر وہاں رہتا ہے۔ وہاں جانے کا عرصے سے شوق تھا۔ دِلبر کو اُکسایا۔۔۔ "پُر رونق جگہوں اور سجے ہوئے چہروں کو تو سب دیکھتے ہیں، زندگی کا یہ پہلو بھی دیکھنا چاہیے۔"

"میں فلموں میں دیکھ چکا ہوں، مجھے معاف کرو۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ لیکن ہم

زبردستی اسے لے گئے۔ پہلے ایک موسیو نے بوہیمین آداب پر مختصر لیکچر دیا اور بتایا کہ گھڑی، بٹوہ، پاسپورٹ اور نقدی ہوٹل میں رکھوا دینا۔ دو تین سو فرانک سے زیادہ ساتھ مت لے جانا۔ ٹائی کی جگہ گلے میں رنگین رومال باندھ کر سگریٹ منہ میں دبا کر اندر داخل ہونا۔ وہاں خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو کسی کی طرف مت دیکھنا۔ کوئی لڑکی تنہا بیٹھی ہو تو اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنا اور رقص شروع کر دینا۔ بیس پچیس منٹ خیریت سے گزر جائیں تو ایک طرف بیٹھ جانا۔ لیکن خبردار جو کسی سے کوئی سوال پوچھا۔

ٹیکسی والے نے ہمیں اندھیری سی گلی میں اُتار کر ایک طرف اشارہ کیا اور غائب ہو گیا۔ وہاں ایک زینہ تھا جو نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا تھا۔۔۔ دیا سلائی جلا کر سیڑھیاں اُترنے لگے۔ سازوں کی گھُٹی گھُٹی صدائیں آ رہی تھیں۔ دروازے کھٹکھٹایا، چھوٹی سی کھڑکی کھلی، ایک چہرہ جھانکنے لگا۔ مجد ہی نے فوراً سگریٹ کا لمبا کش لگا کر سارا دھواں کھڑکی پر چھوڑ دیا۔ دروازہ کھل گیا اور ایک سُرخ ہونٹوں اور لمبے بالوں والے مرد نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر جاتے ہوئے غور سے دیکھا تو یہ مرد لڑکی نکلا۔ اندر رقص ہو رہا تھا۔ مدھم سی روشنی تھی اور دھواں ہی دھواں۔ موسیقی بے حد ہیجان خیز تھی۔ مرد عورتیں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ناچ رہے تھے۔ کئی تو ایک دوسرے کا سہارا لیے تقریباً سو رہے تھے۔

نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک اونگھتی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور دِلبر کے اوپر ڈال دیا۔ دِلبر ناچنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجد ہی فوراً ہی کہیں غائب ہو گیا اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا۔ چہروں کی طرف دیکھنے کی ممانعت تھی، اس لیے نظریں نیچی کر کے پارٹنر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ رنگین لباس والی حسینہ کوئی ڈاڑھی والا آرٹسٹ نکلا۔ دُور ایک سگریٹ پیتی ہوئی لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اسے زبردستی پکڑ کر رقص شروع کیا۔ ایک جگہ سگریٹ کا دھواں ذرا کم تھا، وہاں اس کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے نے کم از کم پچاس خزائیں دیکھی ہوں گی۔ اس پر کوئی آرٹسٹ خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ مصنوعی بھوئیں، مصنوعی پلکیں، مصنوعی تل۔ اصل خدوخال ندارد تھے۔

آدھ گھنٹہ خیریت سے گزر چکا تو ہم نے حاضرین کا جائزہ لیا۔ ہر شخص کا لباس نرالا تھا۔ جن مردوں کی باقاعدہ ڈاڑھی نہیں تھی انہوں نے ہفتے سے حجامت نہیں کرائی تھی۔ شِکرے کی سی آنکھیں، کلائیوں پر پٹیاں بندھی ہوئیں، شوخ رنگ کی قمیصیں۔ عورتوں کے لباس بے حد چُست تھے، جیسے پارسل مضبوطی سے پیک کئے ہوئے ہوں۔ بکھری ہوئی زلفیں خوابیدہ نگاہیں اور تیز خوشبو کی لپٹیں۔

"اجنبی ہو؟ غالباً پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو۔۔" ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے

پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس برادری میں اجنبیوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ویسے مارکیٹ، سٹاک ایکسچینج اور دفتروں میں لوگ کاروبار کے بہانے ایک دوسرے کو لُوٹتے ہیں۔ یہ بے چارے سیدھے سادے آدمی دوسروں کی جیب کُتر لیتے ہیں یا کسی کو پکڑ کر اس کی پونجی رکھوا لیتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یہاں پہلی بار آنا بڑا خطرناک ہے۔۔۔"

"کسی نہ کسی دن تو پہل کرنا ہی پڑتی ہے۔ تم بھی تو کبھی پہلی مرتبہ آئے ہو گے۔۔۔"

"اگر انہیں پتہ چل جائے تو۔۔۔؟"

"تو ہم بھی تیار ہیں۔ چار پانچ کو تو لے لیں گے۔۔۔"

بوڑھا ہنسنے لگا "تمہیں اپنی محبوبہ سے ملاؤں۔"

اس نے اشارہ کیا۔ پختہ عمر کی ایک فربہ اندام عورت جھومتی جھومتی آئی۔ کسی

زمانے میں بڑی حسین ہو گی۔ ہمارے کندھوں پر زور سے دھپ لگا کر چلی گئی۔ میں نے دِلبر کو جھنجھوڑا کہ تم بھی بوڑھے سے کچھ کہو۔

"تمہاری بیوی خوش مزاج معلوم ہوتی ہے۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"یہ بیوی نہیں محبوبہ ہے۔ مدّتوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں، لیکن شادی نہیں کی۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" دِلبر ہدایات بھول چکا تھا۔

"اس لیے کہ ہمیں انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے چِڑ ہے۔ گرجے میں شادی، دفتر میں ملازمت، کھوکھلی مصنوعی سوسائٹی، دوستی کی آڑ میں ایک دوسرے کو دھوکا دینا، یہ سب رواج ہم جیسے انسانوں نے ہی وضع کیے ہیں۔ لیکن ان کے باوجود ایک اُچکّا دوسرے اُچکّے کو کبھی دھوکا نہیں دیتا، نہ پیٹھ پیچھے برائیاں کرتا ہے۔ یہاں زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو شادی کے جھنجھٹ میں پھنسے بغیر اپنی مرضی سے مردوں کے ساتھ رہتی ہیں اور بہت خوش ہیں۔ تم لوگ ہماری بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے اپنے ڈرائنگ روم سجا کر اپنے آپ کو آرٹ کا عاشق ظاہر کرتے ہو لیکن دل ہی دل میں ہم سے نفرت کرتے ہو۔۔۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" دِلبر نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور چلنے کے

لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے اسے بٹھایا۔

دوسرے کونے میں دو مرد ایک دوسرے کو دھما دھم پیٹ رہے تھے۔ خوب لڑائی ہو رہی تھی۔

"یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟" دِلبر پھر سوال پوچھ بیٹھا۔

"لڑائی یا تو دولت، جائیداد پر ہوتی ہے یا عورت پر۔ یہاں سب قلّاش ہیں۔ اس لیے ایک حسینہ کے لیے لڑ رہے ہیں۔"

اور حسینہ بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھی، بلکہ مُسکرا رہی تھی۔ باقی لوگ اطمینان سے ناچ رہے تھے۔

"جنھیں مہذّب کہا جاتا ہے وہ لوگ عورت کے لیے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں۔ جلی کٹی باتیں، چُغلیاں، ِگری ہوئی حرکتیں۔۔۔۔ سب کچھ دُور دُور سے کرتے ہیں۔ لیکن مَردوں سے اس طرح فیصلہ کیا کرتے ہیں۔" بوڑھا بولا۔

"خدا کے لیے یہاں سے چلو۔" دِلبر نے میرے کان میں کہا۔

"تم ضرور اخبار پڑھتے ہوگے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ہاں۔" دِلبر نے جیسے اقبالِ جرم کیا۔

"تبھی تمہارے ماتھے پر سلوٹیں ہیں۔ جاپان میں کیا ہو رہا ہے، جنوبی امریکی میں کیا ہونے والا ہے، قطب شمالی میں کیا ہونا چاہیے تھا جو نہ ہو سکا۔ مجھے خبروں کی اتنی بھی پروا نہیں اور میرا چہرہ دیکھو۔"

اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ ماتھا دمک رہا تھا اور چہرے پر وہ تازگی تھی جو بچّوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

"جو پیدا ہوا ہے اُسے فقط ایک زندگی ملی ہے۔" اس نے دِلبر کی کمر میں اتنے زور سے دھپ رسید کیا کہ وہ گرتا گرتا بچا۔ "عجب لوگ ہو تم بھی۔ ناحق غم لگا رکھے ہیں تم نے۔۔۔"

بوڑھے کے قہقہے میں طوفانوں کی تُندی تھی۔

باہر نکلے تو دِلبر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

ہوٹل پہنچے۔ مجد ہی نہیں ملا۔ اگلی صبح دِلبر کو منانے کے لیے میں اس کے پسندیدہ

سگریٹ ڈھونڈنے نکلا۔ ایک گلی میں تین پراسرار شبیہیں نظر آئیں۔ بکھرے بال، کپڑوں پر سلوٹیں، حجامت بڑھی ہوئی، چہروں پر بے زاری اور افسردگی۔ قریب جا کر دیکھا تو ان میں مجد ہی بھی تھا جو نظریں بچا رہا تھا۔ پوچھا کہ حُلیے کو کیا ہوا؟ تو بہانے کرنے لگا کہ۔۔۔ ”یا حبیبی۔۔۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ کیچڑ میں پاؤں پھسل گیا تھا۔۔۔“

”مجد ہی اصل وجہ یہ ہے کہ۔۔۔ جمالِ ہم نشیں بر من اثر کرد۔۔۔۔“

”مرحبا، قربانت شویم۔“ اس نے نعرہ لگایا اور بے ساختہ جھومنے لگا۔ ”کباب شدیم، سوختہ شدیم، تمام شدیم۔۔۔۔“

”آج تمہیں ایسی جگہ پھنساؤں کہ نکل نہ سکو۔“

وی آنا کے کیفے میں بیٹھا ہوا دِلبر بدلہ لینے پر تُلا ہوا تھا۔

”چلو۔۔۔“

ہیمل ساتھ آنے لگا تو دِلبر نے منع کر دیا۔ ”یہ تینوں کا معاملہ ہے، آج تم اکیلے تھیٹر دیکھ آؤ۔“

دِلبر سیدھا ہمیں قُمار خانے میں لے گیا۔ اندر پہنچے، وہاں بالکل کمرۂ امتحان والی خاموشی طاری تھی۔ کسی کونے میں کبھی سر گوشیاں ہونے لگتیں تو سب فوراً مُڑ کر دیکھتے کہ کون نقل کر رہا ہے۔ جوئے کی مشین کی گھُومتی ہوئی سوئی رُکتی اور سناٹا چھا جاتا۔ چہرے زرد پڑ جاتے۔

اب لوگ کَن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے کہ تانک جھانک چھوڑو۔ یا جوا کھیلو، ورنہ راستہ لو۔

ایک بیرے سے سگریٹ مانگے۔ وہ امریکن سگرٹوں کا پیکٹ لے آیا۔ کہا کہ انگلش لاؤ۔ اس نے سر ہلا دیا کہ نہیں ہیں۔

”اتنے دنوں کے بعد انگریزی سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔“ ایک آواز آئی۔

ہمارے سامنے پینتالیس پچاس سال کی تندرست و توانا عورت بیٹھی مُسکرا رہی تھی۔ رنگے ہوئے بال، گلے میں ہیروں کا بیش قیمت ہار، ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس، گلابی چہرے سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔

"کھیل نہیں رہے۔" اس نے دِلبر سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔"

"کھیلو گے۔۔؟"

"ابھی نہیں۔"

"اچھا تو پھر میری طرف سے کچھ شلنگ کسی رنگ پر لگا دو۔۔۔"

دِلبر نے انکار کیا۔ وہ بڑے ملائم لہجے میں بولی

"میں وہی ہوں اور شگونوں کی معتقد ہوں، تبھی تم سے کہہ رہی ہوں۔ بس کوئی سا رنگ چُن کر یہ ٹکیاں اس پر رکھ دو۔"

اس نے گول ٹکیاں دِلبر کے ہاتھ میں تھما دیں۔

سبز آنکھیں، سیاہ بال، سُرخ ہونٹ، زرد لباس، سفید ہیرے۔ ان سب رنگوں میں سُرخی نمایاں تھی۔

"جاؤ ٹکیاں سُرخ رنگ پر لگا دو۔" میں نے دِلبر کے کان میں کہا۔

سُرخ رنگ آیااور ساڑھے تین سو شلنگ دُگنے ہو گئے۔

"ایک دفعہ اور۔۔" اس نے اصرار کیا۔ پھر سُرخ رنگ چُنااور پھر جیت ہوئی۔

دِلبر نے سب کچھ سمیٹ کر اس کے سامنے رکھااور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بس ایک دفعہ اور آخری مرتبہ، بے شک رنگ بدل لو۔"

دِلبر نے ڈھیر میں سے تین چوتھائی کے قریب ٹکیاں اٹھائیں۔ سبز رنگ پر لگا کر فوراًہار کر واپس آ گیا۔بقیہ ٹکیاں گنی گئیں۔ حساب تقریباًبرابر رہا تھا۔۔۔

"جوئے سے بہت ڈرتے ہو۔" وہ ہنسنے لگی۔ سامنے پانچ چھ خالی کیے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ راکھ دانی سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔

بیرا بل لایا۔ اس نے بیگ سے سفری چیکوں کا بنڈل نکالا اور دس پاؤنڈ کا چیک تھالی میں رکھ دیا۔

وہ واپس آ گیا۔۔ "شلنگ دیجئے، ہمیں سفری چیک لینے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے مشورہ دیا کہ ٹکیاں واپس کر کے شلنگ لے لو، لیکن وہ ضد کرنے لگی۔ بیرا مینجر کو لے آیا۔

"یہ پاؤنڈ ہیں اور یہاں کی کرنسی سے کہیں بہتر ہیں۔" وہ بولی۔

"مگر یہ چیک صرف بینک والے ہی لے سکتے ہیں۔" مینجر نے سمجھایا۔

اس نے مینجر کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مجد ہی کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ سارا ہجوم دِلبر کو اور مجھے بُری طرح گھور رہا تھا۔ جوا بند ہو گیا اور سب میز کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔

مینجر چلا رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ آخر دِلبر، مینجر کو ایک طرف لے گیا، اسے سمجھایا کہ امیر عورت ہے، بل ضرور ادا کیا جائے گا۔ اس سے ہوٹل کا نام پوچھ کر وہاں مینجر سے فون پر بات کر لو۔۔۔

اس نے فون کیا اور بل واپس لے لیا۔

"وی آنا کیسے آئے؟" اس نے دِلبر سے پوچھا۔

"میں تو یہیں رہتا ہوں۔۔۔"

"اور تم۔۔۔"

"میں سیّاح ہوں۔"

"پہلے میں سمجھی تم دونوں آرٹسٹ ہو اور یہاں کچھ سیکھنے آئے ہو۔ لیکن نہ تو تمہارے بال لمبے ہیں نہ کندھے جھکے ہوئے ہیں۔ تم آرٹسٹ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟" اس نے دِلبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"پتہ نہیں میں کون ہوں۔" دِلبر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"میں بھی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتی ہوں؟ مجھے بھی کوئی نہیں سمجھتا۔"

"اگر ہم واقعی کوشش کریں تو پھر ہمیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے عرض کیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"ڈینیوب کی سیر کریں گے۔" دِلبر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اس وقت؟ ڈینیوب کہیں بھاگ چلا ہے۔ کل دیکھ لینا۔"

"جی نہیں"

"بہت خوب، چلو میں بھی چلتی ہوں۔"

ہم باہر نکل آئے۔

"یہ کیسی عجیب سی بُو آ رہی ہے۔" اس نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"یہ تازہ ہوا ہے۔" میں نے بتایا۔

اپنے متعلق باتیں کرنے لگی کہ آسٹریلیا سے دنیا کی سیر پر نکلی ہے۔ اب تک اٹھارہ مُلک دیکھے ہیں۔ آسٹریلیا میں جائیداد ہے اور بے شمار بھیڑیں جن کی اُون دساور کو بھیجی جاتی ہے۔ خاوند امریکہ میں ہے اور ریّہ بازی کے مقابلوں کا مہتمم ہے۔

"وہ شرابی ہے، جواری ہے۔ ہالی وڈ کی ایکسٹرا لڑکیوں میں خاص دلچسپی لیتا ہے، کیونکہ مشہور فلم سٹار اسے قریب پھٹکنے نہیں دیتیں۔ مجھے اس پر ذرا بھروسہ نہیں۔ کبھی تو محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے محبت ہے اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ بڑا ہی ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں لیکن وہ مجھے بالکل نہیں سمجھتا۔ تبھی اب تک میں اس کے ساتھ چار پانچ ہفتے سے زیادہ نہیں رہی۔ دراصل شادی میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آئے دن ایسے مرد ملتے رہتے ہیں جو اپنے خاوند سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی تصویر دکھاؤں؟"

ایک قمقمے کے نیچے اس نے تصویریں دکھائیں۔

"یہ میرا خاوند ہے۔۔۔"

"اور یہ شاید آپ کے لڑکپن کی تصویر ہے۔۔۔" دوسری تصویر میں بیس بائیس برس کی حسین لڑکی مُسکرا رہی تھی۔

"یہ میری لڑکی ہے۔۔۔"

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں نہیں ہے۔" اس نے تصویر ہاتھ سے چھین لی۔

"لیکن آپ کی شادی کو تو فقط پانچ برس ہوئے ہیں۔"

"پہلے خاوند کی لڑکی ہے۔ یہ رہا پہلا خاوند۔"

"اور یہ جو لمبی مونچھوں والا آپ کے ساتھ کھڑا ہے، یہ کون ہے؟"

"یہ اس سے پہلا خاوند تھا۔۔۔" اس نے جھنجھلا کر تصویریں بٹوے میں رکھ لیں۔

"اتنے بڑے شہر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتے؟"

"نہیں۔۔۔" میں نے بتایا۔

"تم سے نہیں، یہ سوال تمہارے دوست سے پوچھا ہے۔"

"جی میں تو اسی شہر کا باشندہ ہوں۔" دِلبر بڑے عجز سے بولا۔

"کتنے عجیب ہو۔ دوسروں سے بالکل مختلف! اچھا بتاؤ اگر اتفاق سے میری انگوٹھی یا چوڑی دریا میں گر جائے تو کیا کروگے۔"

"کل صبح کسی غوطہ خور کا انتظام کرادوں گا۔" دِلبر نے جواب دیا۔

"میرا دوست بہترین تیراک ہے۔ یہ شرما رہا ہے۔ آپ پھینکئے تو سہی، ابھی کود جائے گا۔" میں نے کہا۔ اس پر دِلبر نے زور چٹکی لی اور کان میں آہستہ سے بولا۔

"خدا کے لیے تم چپ رہو۔"

"اگر میں نو عُمر ہوتی تو چوڑی وغیرہ گِرے بغیر فقط میرے کہنے پر تم فوراً کود جاتے۔ جب میں سوسائٹی میں داخل ہوئی تو تہلکہ مچ گیا تھا۔ کتنی ہی دفعہ میرے سینڈل سے شیمپین پی گئی۔" یورپ میں یہ فقرہ اکثر سُننے میں آتا ہے۔ مانا کہ جراب پہن رکھی ہو گی، سینڈل بھی صاف ہو گا لیکن اس سے شیمپین وہی پی سکتا

ہے جو ایک دو بوتلیں پہلے چڑھا چکا ہو۔

"آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے؟" دِلبر نے ٹالنے کے لیے پوچھا۔

"فقط جاز کی گتیں پسند ہیں، جن میں جان ہوتی ہے۔ جنہیں سُن کر رُواں رُواں پھڑکنے لگتا ہے لیکن کلاسیکی موسیقی سے چڑ ہے۔ یا تو کوئی بوڑھا گھنٹوں وائلن بجاتا رہتا ہے اور سُننے والے اونگھتے رہتے ہیں، یا پھر اوپرا میں لوگ دل کھول کر چنگھاڑتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص کسی عمر رسیدہ کتّے کی طرح بُری طرح روتا ہے، کبھی عورتیں اس طرح گاتی ہیں جیسے مرغیاں چلّا رہی ہوں۔ کان بہرے ہو جاتے ہیں۔۔۔۔"

کلاسیکی موسیقی کی ایسی لاجواب تفسیر سُن کر دِلبر نے مٹّن والڈ کے پچھتّر سالہ بوڑھے جوہان کا ذکر شروع کیا جسے یورپ بھر میں وائلن سازی کا اُستاد تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اُستاد کے کہنے کے مطابق بڑھیا وائلن بنانے میں یوں تو مجموعی طور پر چار سو گھنٹے صرف ہوتے ہیں، لیکن پندرہ بیس برس انتظار کرنا پڑتا ہے اور سُر ٹھیک کرانے کے لیے کسی بڑے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھے وائلن ہزار سے لے کر دس ہزار ڈالر تک بکتے ہیں۔

"وائلن سے تو مجھے خاص چِڑ ہے۔ اس کے گز میں گھوڑے کی دُم کے بال ہوتے ہیں اور تار بلّی کے پوست سے بنتے ہیں۔ عجب تماشا ہے۔ گھوڑے کے بال، بلّی کے پوست سے رگڑے جائیں تو اچھے بھلے انسانوں پر غشی کا عالم طاری ہو جائے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے۔۔۔"

اس نے پھر گھڑی دیکھ کر آہ بھری اور پوچھا۔

"تم کس چیز کی تلاش میں ہو۔۔۔"

"مجھے تو کسی کی تلاش نہیں۔" دِلبر نے جواب دیا۔

"میں صداقت کی تلاش میں نکلی ہوں۔"

"یعنی۔"

"صداقت یعنی سچائی ڈھونڈنے نکلی ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"معمولی سی بات ہو تو سمجھاؤں بھی۔ مثلاً یہی کہ دُنیا کبھی سیدھی بھی ہو گی۔ اگر ہوئی تو کیونکر ہو گی۔"

"ہزاروں سال سے دنیا اسی طرح رہی ہے۔ بڑے بڑے مفکّر، پیغمبر اور مصلح آئے، لیکن دُنیا سیدھی نہیں ہوئی۔"

"ہائے یہی تو صداقت ہے۔ وی آنا کے شہزادے تم میرے ساتھ کل اٹلی چلو۔"

لیکن سہما ہوا دِلبر بڑے ادب سے جھک کر گھر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"تم نے میری شام خراب کر دی۔ دراصل تم جوئے سے ڈرتے ہو۔" اس نے دِلبر کی کمر میں اچھا خاصا مکّہ رسید کیا اور خفا ہو کر چلی گئی۔

"پیرس ہو یا وی آنا، ہمیشہ میرے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔۔۔" وہ مُنہ بنا کر
"دِلبر، پروانہ کرو۔ موہاکس میں حالات اس سے کہیں زیادہ خراب تھے۔۔۔" ایک بلقانی فقرے سے دلجوئی کی۔

وہ مُسکرانے لگا۔۔۔

"اچھا تو تم یہ فقرہ سُن چکے ہو۔ اس کا پس منظر وہ جنگ تھی جو سولہویں صدی میں موہاکس کے مقام پر لڑی گئی۔ ترکوں نے ہنگری والوں کو ایسی شکست دی کہ اٹھائیس ہزار میں سے صرف چار ہزار سپاہی بھاگ کر بچ سکے۔ چنانچہ مصیبت یا نقصان پر کندھے ہلا کر یہ فقرہ کہا جاتا ہے۔ تم کندھے ہلانا بھول گئے"

اس نے کندھے ہلانے کا صحیح طریقہ بتایا۔

واپس آئے تو دودھ والے اور اخبار فروش اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سچ مچ صبح ہو چکی تھی۔ دِلبر کو چھوڑ کر ہوٹل پہنچا تو چوکیدار نے بڑی معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ صبح بخیر کہا۔ شاید سوچ رہا ہو گا کہ اگر شام کا بھولا صبح واپس آ جائے تو اسے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔

ہیمل قُمار خانے کے واقعے پر خوش ہوا۔ خصوصاً شہزادۂ وی آنا کے خطاب پر۔ اور دِلبر کو چھیڑنے لگا۔

"ہز ہیوی نس His Heaviness دی پرنس آف وی آنا کی خدمت میں التماس ہے کہ عُمر کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے رات کو دیر تک جاگا کریں ورنہ دن بھر جمائیاں آتی ہیں اور یور ہیوی نس! اب وہ سٹیج آگئی ہے کہ بہتر ہو گا کہ آپ فرسٹ کلاس کرکٹ سے ریٹائر ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیں۔"

دِلبر جمائی لے کر بولا۔۔۔ "انگریز ہر وقت کرکٹ کرتے رہتے ہیں۔ محبت

ہو جانے پر عاشق BOWLED بولڈ ہو جاتا ہے۔ کوئی محبوب سے جھوٹ بولے تو کہا جاتا ہے کہ یہ کرکٹ نہیں ہے۔ شادی ہونے پر بیوی اسے اسٹمپ کر دیتی ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوتے وقت اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ شکر ہے اننگز اچھی خاصی رہیں لیکن یہ باتیں کبھی کبھی کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچوں کی ہیں۔ گاؤں میں جو کرکٹ کھیلی جاتی ہے اس کا قصّہ مجھے انگلینڈ میں ایک انگریز نے سنایا تھا کہ مقامی ٹیم نے ٹاس جیتا۔ اس سِکّے کی مدد سے جس کے دونوں طرف چہرے تھے۔ پھر مقامی بیٹسمین نے ہٹ لگا کر گیند کو اس چھوٹے مگر گہرے تالاب میں پہنچا دیا جو باؤنڈری لائن کے اندر تھا۔ فیلڈر ڈوبی ہوئی گیند کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور دونوں بیٹسمین رنز بنا رہے تھے۔ پہلے بھاگتے رہے، پھر اطمینان سے پیدل چلنے لگے۔ مخالف ٹیم کے کپتان نے اعتراض کیا تو اسے کرکٹ کے قوانین کی کتاب دکھائی گئی جس میں لکھا تھا کہ جب تک گیند باؤنڈری تک نہ پہنچے، کیچ نہ ہو جائے، وکٹ کیپر یا بولر کے ہاتھ میں نہ آ جائے، بیٹسمین رنز بنا سکتے ہیں۔۔ڈوبی ہوئی گیند نہ مل سکی اور مقامی ٹیم نے دو سو ایک رنز پر اننگز ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مخالف بیٹسمین کھیلنے آئے۔ مقامی فاسٹ بولر نے لمبا سٹارٹ لیا۔ بھاگتا ہوا آیا۔ ابھی وکٹوں سے کچھ دور تھا کہ بائیں طرف مُڑ گیا اور میدان کے پانچ چھ چکر لگائے۔ پھر وکٹوں کی طرف آیا، لیکن اس مرتبہ دہنی طرف مُڑ کر میدان

کے چکر لگانے لگا۔ مخالف ٹیم کے کپتان کے احتجاج پر کرکٹ کے قوانین کی کتاب دوبارہ اس کے سامنے رکھ دی گئی۔۔۔ لکھا تھا کہ بولر جتنا لمبا سٹارٹ لینا چاہے لے سکتا ہے۔ چنانچہ بولر جو لمبی دوڑوں میں انعام حاصل کر چکا تھا اور در حقیقت کرکٹ کا کھلاڑی نہیں تھا، تقریباً دو گھنٹے تک سٹارٹ لینے میں مصروف رہا، حتیٰ کہ شام ہو گئی اور کرکٹ کے قانون کے مطابق روشن کم ہو جانے پر کھیل ختم کر دیا گیا۔ لیکن سب بہت خوش تھے کہ میچ DRAW ہو گیا۔ فرسٹ کلاس کا تو پتہ نہیں، لیکن اگر عوامی کرکٹ یہی ہے تو اس سے یہ خاکسار بچپن سے ریٹائر ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ اور آج شہر سے باہر ایک کُنج میں خاص پروگرام ہے۔ اٹھو۔۔"

ہم کیفے سے باہر نکلے اور مضافات کا رُخ کیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے اُبھری ہوئی بُرجیوں اور میناروں پر سنہری جلا پھیل گئی۔ شفق پھولی، بادل جگمگا اُٹھے اور سب کچھ گلابی ہو گیا۔ دریا کی سطح آئینے کی طرح چمکنے لگی۔

"دوسرے ملکوں میں طرح طرح کے دریا ہیں، لیکن ساری دنیا میں ڈینیوب فقط ایک ہی ہے۔" دِلبر نے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو دو ہیں۔ ایک اس طرف بھی تو ہے۔" میں بولا۔

”اصلی دریا وہی ہے، یہ ڈینیوب کی نہر ہے۔“

ہم ایسے خطّے سے گزر رہے تھے جہاں چاروں طرف انگور کی بیلیں تھیں، باغات تھے اور چھوٹے چھوٹے صاف سُتھرے مکان۔ ایک جگہ بڑی چہل پہل تھی، رنگ برنگے قمقمے روشن تھے، جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔

”یہی ہے وہ جگہ۔۔۔“ دِلبر نے بتایا۔

باغوں اور کھیتوں میں گھِری ہوئی یہ جگہ تھیٹر بھی تھی، رقص گاہ بھی اور مے خانہ بھی۔ یہاں آس پاس کے کھیتوں سے اکٹھے کیے ہوئے انگوروں کی شراب فروخت ہوتی تھی اور زندہ ناچ گانے کا انتظام بھی تھا۔

ہم اندر گئے جس طرف نگاہ جاتی تھی لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے لباس بڑے دلچسپ تھے۔ نیلی پتلونیں، لمبے فراک، چھوٹی نیکریں۔ کسی کی دو چوٹیاں تھیں تو کسی کے بال چھوٹے تھے جیسے کوئی مرد ابھی حجامت کرا کر آیا ہو۔ کسی نے بالوں کا مور چھل بنا کر دُم سی لٹکا رکھی تھی اور کسی نے بالوں کا اتنا بڑا گنبد پہن رکھا تھا کہ چہرہ بالکل چھوٹا سا محسوس ہوتا، جیسے کوئی پرندہ گھونسلے سے جھانک رہا ہو۔

"انتظار کس چیز کا ہے۔" ہیمل نے آدھ گھنٹے کے بعد پوچھا۔

"بڑا اچھا سوال ہے۔ تم تینوں کو کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں ایک بُت طنّاز کا منتظر ہوں۔" دِلبر نے جواب دیا۔

ایک لڑکی پیانو بجانے لگی۔ اس کے گلے میں چمکیلا لاکٹ جھوم رہا تھا۔ سنہری زلفیں نیلے رومال میں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک پہلوان نما آدمی وائلن بجانے لگا اور لوگ ناچنے لگے۔

"مجد ہی تم ناچتے کیوں نہیں؟"

"خاک ناچوں۔ پتہ نہیں کس قسم کا رقص ہے اور کس طرح کی موسیقی ہے؟"

"ہماری موسیقی نہیں سُنی؟ ٹھیٹھ مغربی دُھنیں بھی ہیں، بلقان کی بھی، بحیرۂ روم اور ایشیا کی تانیں بھی سُنائی دیتی ہیں۔ اور یہ جو ناچ رہی ہیں یہ کیسی ہیں۔۔۔؟"

"پتہ نہیں۔ کچھ عجیب سا ہجوم ہے۔ کسی کے بال سیاہ ہیں، کسی کے سُرخ، کسی کے سنہری۔ اسی طرح آنکھیں بھُوری ہیں، نیلی، سبز اور سیاہ ہیں۔ نہ خدوخال ملتے ہیں نہ قد۔ دو لڑکیاں ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔ ایک شہر ایک ملک کو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔۔۔"

"تمہارے سامنے ڈینیوب کی تاریخ کھلی ہوئی ہے۔ جتنی قومیں یہاں مخلوط ہوئی ہیں شاید ہی دنیا کے کسی اور حصّے میں ہوئی ہوں۔" دِلبر نے انگور کی شراب کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پیپا رکھا ہوا تھا۔ لڑکے لڑکیاں تسلے کے تسلے چڑھا رہے تھے۔ آخر انتظار ختم ہوا اور جوہانا آئی۔ چھوٹے قد کی موٹی تازی خاتون، بڑی تیز طرار۔ اسے دیکھتے ہی دِلبر نے بھاگ کر اس کا ہاتھ چوما اور ہم سے تعارف کرایا۔

"اسے انگریزی نہیں آتی، ترجمہ کرنا پڑے گا۔ تم سب جلدی سے اس کا ہاتھ چوم لو۔۔۔"

"مجھے تو ہاتھ چومنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔" ہیمل بولا۔

"اچھا، ہونٹوں تک مت لے جانا۔ یونہی ٹھوڑی سے چھو لینا۔۔۔"

"بہتر ہو گا کہ یہ اپنا ہاتھ چوم لے اور میں اپنا ہاتھ۔۔۔۔"

"ضد مت کرو، یہ بڑی غصّیل ہے۔" دِلبر نے درخواست کی۔

ہم تینوں نے اس کی انگلیاں ٹھوڑی سے چھو کر چھوڑ دیں۔ وہ مُسکرا کر ایک طرف جا بیٹھی۔

"خاتون کا ہاتھ چومنا شولری کی رسم ہے۔ اور آج ہیمل نے جب شولری کا مظاہرہ کیا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے نائٹ ہُڈ (KNIGHTHOOD) کی پُرزور سفارش کی جائے۔ مستقبل کے سر ڈالف ہیمل! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سترہویں صدی کے شروع میں جس جس انگریز زمیندار کے پاس چالیس پاؤنڈ کی جائداد تھی، ان سب کو برطانوی حکومت نے SIR کا خطاب دے دیا تھا۔ امید ہے کہ آپ کے پاس چالیس پاؤنڈ تو ہوں گے۔"

"پاؤنڈ تو ہیں مگر طبّی نقطۂ نگاہ سے میں اس رسم کے خلاف ہوں۔ اور خصوصاً اب جب کہ عورت مرد کی مساوات پر اس قدر دھینگامشتی ہو رہی ہے، شولری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہ گئی یہ رسم تو اسی وی آنا میں ان دنوں مَرد دُور ہی سے کہہ دیتے ہیں کہ میں آپ کا ہاتھ چومتا ہوں۔ ہاتھ چھوا تک نہیں جاتا، لیکن رسم پوری ہو جاتی ہے۔ کل میں نے بس میں بھی دیکھا کہ دو مردوں نے کئی عورتوں کے ہاتھ چومے لیکن اُٹھ کر جگہ نہیں دی۔ بیٹھے رہے۔"

"دِلبر، اس سے صلح کرنے کی کوشش کی۔۔۔؟" مجدہی نے پوچھا۔

"وہ تو بہت کر چکا ہوں۔ کیا بتاؤں کہ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ عورت سائے کی طرح ہے۔ اگر اس کا تعاقب کرو گے تو آگے آگے بھاگے

گی۔ اگر دُور ہٹو گے تو پیچھے پیچھے آئے گی۔ اس پر عمل کر کے دیکھا کچھ نہ ہوا۔ تعاقب کرو یا دُور رہو، وہ ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتی رہی۔ پھر امریکن کتابیں پڑھیں جن میں محبوبہ کو خوش کرنے کی ترکیبیں لکھی تھیں بڑی تعریفیں، خوشامدیں کیں لیکن وہ بدظن ہو گئی کہ ہرجائی ہے۔ ہر ایک سے یہی کہتا ہو گا۔ پھر جرمن مشاہیر کی ہدایتوں پر عمل کیا۔ اس کے سامنے فرنیچر اور برتن توڑے، بلّیوں کتّوں کو پیٹ کر دکھایا۔ نوکروں سے لڑا۔ وہ سمجھی کہ چڑچڑا اور بدمزاج ہے۔ مشاہیر کے مشوروں نے میرا کیریر تباہ کر دیا ہے۔ سوچتا ہوں کسی اور سے شادی کر لُوں۔"

"اگر کہیں دوسری شادی کر بیٹھے تو نئے نئے جذبوں سے آشنا ہو گے۔ ایک نرالی بیزاری تمھیں گھیر لے گی۔ ایک انوکھی بے لُطفی ہر طرف چھا جائے گی۔ پھر ایک نئی افسردگی دبوچ لے گی۔" ہیمل نے مشورہ دیا۔

"دبوچ لیے جانے کا تو مجھے بے حد شوق ہے۔" دِلبر خوش ہو کر بولا۔

"سینٹ پال نے ایک وعظ میں فرمایا تھا کہ کُڑھنے اور جلنے سے بہتر ہے کہ انسان شادی کر لے۔ لیکن پھر غالباً پہلی شادی کے بارے میں کہا گیا تھا۔"

"وہ سب درست ہے۔ یوں تو شِلر نے کہا ہے کہ 'اگر عظمت کا فقدان ہو تو مصنوعی طور پر عظمت پیدا کر کے دکھاؤ۔' اسے جدا ہوئے اتنے برس ہو چکے ہیں۔ بہتیری عظمت دکھاتا ہوں لیکن اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔ بتاؤ کہ یہ اتنی موٹی کیوں ہے؟"

"ماہرین کا کہنا ہے کہ جب عورتیں غمگین ہوں تو خُوب مٹھائیاں اور کیک کھاتی ہیں۔ شاید یہ بے چاری افسردہ رہتی ہے۔"

جوہانا نے ہماری طرف گھور کر دیکھا اور اپنی زبان میں دِلبر سے کچھ پوچھا۔

"یہ تاڑ گئی ہے کہ اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ لفظ فیٹ کے متعلق پوچھتی تھی۔ میں نے ٹال دیا کہ فیٹ نہیں فرائیڈ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تمہیں علم تو ہے نا کہ فرائیڈ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اب یہ نفسیات کی اہمیت پر تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتی ہے۔"

"کہہ دو کہ نفسیات کے بغیر ایک دن بھی گزارہ نہیں ہو سکتا۔ بچّہ انگوٹھا چُوسے یا کوئی بڑا چھینکے، کھانسے یا جوتے کے تسمے کھولے۔۔۔ ہر حرکت میں نفسیات کا دخل ہے۔ وہ دن گئے جب بیشتر لوگ نارمل ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب ہر شخص

غیر معمولی ہے اور اسے ذہنی الجھنیں پیدا کرنے کا خاص شوق ہے کہ کہیں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ ماہرینِ نفسیات ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کر کے پوچھتے ہیں 'آپ تو ٹھیک معلوم ہوتے ہیں یہ بتایئے میں کیسا ہوں؟' کسی کو خواب سناتے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس نے فرائیڈ نہ پڑھ رکھا ہو۔"

ہیمل کے فقروں کا ترجمہ سُن کر وہ خفا ہونے لگی۔

"یہ ڈاکٹروں پر تنقید کر رہی ہے کہ وہ بھی تو ٹوکتے رہتے ہیں۔ یہ مت چکھو، وہ نہ پیو، یہ مت کرو، وہ مت کرو۔"

"ڈاکٹر دو قسم کے ہوتے ہیں، طِب کے اور فلاسفی کے۔۔۔ اور وی آنا طِب اور نفسیات دونوں کا سرچشمہ رہا ہے۔" ہیمل نے جواب دیا اور وی آنا کے اس ڈاکٹر کا قصّہ سُنایا جس نے انسانی جسم خصوصاً سینے کو انگلیوں سے ٹھوکنے بجانے کا طریقہ PERCUSSION پہلی مرتبہ رائج کیا۔ اب بھی یہ طبّی معائنے کا ایک اہم حصّہ ہے۔

"اس ڈاکٹر نے کسی مے خانے کے مالک کو شراب کا پیپا ٹھوکتے دیکھ کر وجہ پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ اس طرح پیپا کھولے بغیر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں شراب کتنی

ہے اور ہوا کتنی ہے۔ اس پر ڈاکٹر نے طبّی تشخیص میں نئے طریقے کا اضافہ کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا خیال اسے شراب خانے میں آیا تھا۔"

"یہ پوچھتی ہے کہ ابھی ہیمل نے کیا کہا ہے؟"

"کہہ دو کہ آئن سٹائن کا ذکر کیا ہے جو ڈینیوب کے کنارے پیدا ہوا تھا۔" میں نے ٹالنے کو کہا۔ "پوچھتی ہے تمہیں آئن سٹائن کی تھیوری آتی ہے؟"

"ہاں آتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"کہتی ہے کہ بیان کرو۔"

"تھیوری بہت آسان ہے۔ شدید جاڑے میں سڑک پر آدھ گھنٹے تک محبوب کا انتظار کیا جائے۔ پھر وہی آدھ گھنٹہ اس کی رفاقت میں گزارا جائے۔ پہلے تیس منٹ بے حد طویل معلوم ہوں گے لیکن رفاقت میں وہی تیس منٹ چند منٹوں میں گزر جائیں گے۔"

وہ مُسکرانے لگی۔

"یہ آج کئی مہینوں کے بعد مُسکرائی ہے۔ پوچھتی ہے کہ تمہارے ہاں محبوب کتنا

انتظار کراتے ہیں؟"

"کہہ دو کہ وہ انتظار ختم ہونے میں نہیں آتا۔ آئن سٹائن کی تھیوری وہاں بالکل بے کار ہے۔"

"کہتی ہے کہ اپنے ہاں کی کچھ اور باتیں بتاؤ۔"

"بتا دو کہ وطن سب کو عزیز ہے۔ جیسے کہ تمہیں اپنے وطن سے محبت ہے۔ ہمارے ایک عظیم فلاسفر کا قول ہے کہ

جو مزا اچھجو دے چوبارے

اوہ نہ بلخ نہ بخارے"

اس مرتبہ نہ جانے دِلبر نے کس قسم کا ترجمہ کیا۔ جوہانا کی بات سُن کر بولا۔

"کہتی ہے تمہاری معلومات میں اضافہ ہونا چاہیے۔ بلخ اور بخارا کے مقابلے میں وی آنا اور سالزبرگ کہیں زیادہ حسین ہیں۔"

دِلبر دو جگ بھر لایا۔ ایک جوہانا کو دیا، دوسرا غٹ غٹ خود چڑھا گیا۔ شاید یہ اس کا آٹھواں جگ تھا۔ ہیمل نے ٹوکا۔

"تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ اگر دوسروں کا تماشا دیکھنا ہو تو خود مت پیا کرو۔"

لیکن دِلبر تقریباً تقریباً آؤٹ ہو چکا تھا، کیونکہ ساز خاموش تھے اور وہ اکیلا والز ناچ رہا تھا۔

"والز کے متعلق کیا خیال ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"فرائیڈ نے تو ذہن کو چکر دیئے ہوں گے۔ ستر اس نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ والز کے بہانے سالم انسان کو گھما گھما کر رکھ دیا۔ میرے خیال میں فی والز ایک شخص کم از کم اسّی نوّے مرتبہ گھومتا ہے۔"

"میرے پیارے وطن کی موسیقی۔ یہ البیلی، موہنی دُھنیں ہر جگہ مقبول ہیں۔ لیکن لوگ ہنستے ہیں کہ جس طرح ڈینیوب میں پیچ ہیں اسی طرح بلقان کی سیاست پیچیدہ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈینیوب نیلا نہیں گدلا ہے۔"

مجدہی نے اس کے ہاتھ سے نیا جگ لے کر ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگا: "تم بھی ان پر ہنسا کرو کہ بحر الکاہل کاہل نہیں ہے، بڑا تند و تیز سمندر ہے۔ اطالوی سنگ تراشوں کے بنائے بُت چھ چھ فُٹ اونچے ہیں حالانکہ ان کی نسل ہمیشہ سے پستہ قد رہی ہے۔ کرکٹ انگلستان میں شروع ہوا جہاں موسم کا یہ حال ہے کہ ایک میچ

بھی اچھی طرح نہیں کھیلا جاتا۔ یہ ہنسنے کی بھی ایک رہی۔ سکاٹ لینڈ والوں کی کنجوسی کے لطیفے خود سکاٹ مزے لے لے کر سُناتے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں کہ دوسرے ہم پر ہنستے ہیں۔"

"انگریزوں میں خود اپنے اوپر ہنسنے کی صلاحیت ہے۔ ہم بُرا مان جاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر یہاں کے سیاست دان، وکیل اور ڈاکٹر ڈوئل لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ڈینیوب اب ہمارا کہاں رہا ہے۔ ذرا دُور سرحد پر آہنی پردہ پڑ چکا ہے۔ یہ شاندار ماضی بھی بڑی فضول چیز ہے۔ کسی قوم کا ماضی زیادہ شاندار نہیں ہونا چاہیے ورنہ حال اور مستقبل کو ہی لے بیٹھتا ہے۔"

دِلبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہم نے فوراً موضوع بدلا۔۔۔۔۔

"والز ناچ ناچ کر تو آسٹریا والوں کو خُوب چُست اور پھُرتیلا ہونا چاہیے۔"

"لیکن والز کے بعد خوب بھوک لگتی ہے۔ انسان زیادہ کھا جاتا ہے۔ پھر والز ناچتا ہے اور پھر بھوک لگ جاتی ہے۔ آخر موٹاپے میں کیا خرابی ہے؟ موٹے آدمی تو صلح پسند ہوتے ہیں۔ نہ اچھی طرح لڑ سکتے ہیں اور نہ تیزی سے بھاگ سکتے ہیں۔"

"مشہور مؤرّخ گبن اس قدر موٹا تھا کہ جب محبوبہ سے شادی کی درخواست کرنے کے لیے گھٹنوں کے بَل جھکا، تو اپنے بوجھ سے وہیں رہ گیا۔ آکر محبوبہ نے بڑی مشکلوں سے کھینچ کر اسے اُٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شادی نہ ہو سکی۔"

"جوہانا کہاں گئی؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

وہ کبھی کی جا چکی تھی۔

"آج اس نے کئی مرتبہ گستاخی کی اور میں خاموش رہا۔ مجھے ڈانٹا چاہیے تھا۔"

دِلبر آؤٹ ہو چکا تھا۔ اب وہ اسی بات پر کڑھ رہا تھا کہ ڈانٹا کیوں نہیں۔

مجد ہی نے تسلّی دی۔ اب کُڑھنا بے سود ہے۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ وہ مکّہ جو لڑائی کے بعد یاد آئے، خود اپنے مُنہ پر مارنا چاہیے۔"

دِلبر اپنے مُنہ پر مکّہ مارنا چاہتا تھا۔

باہر نکلتے وقت وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پوچھا:

"کیا کر رہے ہو؟"

"پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ چہرہ کس کا ہے۔"

"تمہارا ہی ہے۔۔۔ چلو۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ بسورنا کس قدر آسان ہے اور مُسکرانا کتنا مشکل؟ شاید اس لیے کہ مُسکراتے وقت چہروں کے پٹھّوں پر زور پڑتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وی آنا کے تین تحفے ہیں۔ ڈینیوب، ہالس برگوں کا کُنبہ اور والز۔ یہ شہر کسی زمانے میں یورپ کی بڑی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔

رومنوں نے حسبِ معمول یہاں چھاؤنی قائم کی۔ رومن ہر اچھی جگہ خود بخود پہنچ جاتے تھے۔ جب یہاں ان کے بادشاہ MARCUS AURELIUS کا انتقال ہوا تو رومن کچھ بد ظن سے ہو گئے اور بادشاہوں نے بار بار دَوروں پر آنا چھوڑ دیا۔

پھر ان کے دوست HUNS آئے جنہوں نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ یورپ میں جہاں جہاں رومن گئے ہیں ہم بھی جائیں گے اور ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر کر لوٹیں گے۔ بعد میں شارلمین نے، جس کی دور اندیشی اور عقل مندی کی کہانیاں مشہور ہیں، اپنی فوج کے ذریعے عیسائیت بھیجی۔ شارلمین کے عہد میں چوّن جنگیں ہوئیں۔ تصویروں اور مجسّموں میں شارلمین کے ہاتھوں میں ہمیشہ لمبی اور وزنی تلواریں ہوتی ہیں، لیکن اس نے خود ایک لڑائی میں بھی حصّہ نہیں لیا۔ دور اندیشی اور عقل مندی کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟

صلیبی جنگوں میں وی آنا کو بڑی آمدنی ہوئی۔ یورپ کی سب فوجیں ڈینیوب کے راستے سے لڑائی پر جاتی تھیں۔ لیکن یہ نرِی آمدورفت ندارد تھی۔ بقول ایک مؤرّخ، اگر دس سپاہی صلیبی جنگ پر یورپ سے گئے، تو فقط ایک زندہ لوٹا۔ بعد میں رش کم ہو گیا تو لوگوں نے رچرڈ شیر دل کو پکڑ لیا، جو صلاح الدّین ایوبی سے صلح کر کے واپس انگلستان جا رہا تھا۔ رچرڈ بھیس بدلے وی آنا کے قریب ڈینیوب کے ایک گاؤں میں تھا اور شراب خانے میں غم غلط کر رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔ غالباً پبلک خفا تھی کہ صلح کیوں کر لی، اب آمدنی ختم ہو جائے گی۔ پہلے تو یہ بہانہ رہا کہ بھیس بدل رکھا تھا، ہمیں کیا پتہ کہ کون تھا۔ جب غلط فہمی کا اچھی طرح ازالہ ہو چکا تو کہا گیا کہ کیس اُوپر گیا ہے، احکامات آئیں گے تو کچھ ہو گا۔ اسی طرح سال گزر

گیا۔ آخر انگلستان کے باشندوں نے چندہ اکٹھا کر کے آسٹریا بھجوایا تب رچرڈ کو چھوڑا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر نہ کبھی رچرڈ نے بھیس بدلا اور نہ صلیبی جنگ لڑی۔ غالباً تائب بھی ہو گیا ہو گا۔

ہالس برگ کُنبے کا جیسے وی آنا کو مدّتوں سے انتظار تھا۔ یہ لوگ آتے ہی ایسے جمے کہ تقریباً سات سو سال تک رہے (سب سے پہلا ہالس برگ ہسپانیہ میں تھا) زمانے کے دستور کے مطابق کچھ حضرات تو انہیں بے حد ذہین، قابل اور دلیر بادشاہ قرار دیتے ہیں اور کچھ اس کے بالکل برعکس کہتے ہیں۔ ویسے ان کی تعداد چوبیس تھی۔ حساب لگایا جائے تو عہدِ حکومت فی ہالس برگ چوبیس برس سے اوپر نکلتا ہے۔

فرڈی ننڈ نے ایسی پالیسی کی بنیاد ڈالی جس پر لوگ اب تک عمل کرتے ہیں۔ بھرے دربار میں اس نے کہا کہ حضرات لڑائیوں سے مُلک فتح کرنے میں کافی قباحت ہوتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ شادی ایسی جگہ کیجئے جہاں سے ملک اور دولت دونوں ملیں۔ پہل اس نے خود کی اور ایسی بیوی لایا جو بوہیمیا اور ہنگری جہیز میں لائی۔ شادیوں کے بہانے پولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور اٹلی بھی لے لیے گئے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ہالس برگ یورپ پر چھا گئے لیکن کسی کی ترقی اور

خوشحالی دنیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لوگ ناحق رشک اور حسد کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اغیار یونہی پیچھے پڑ گئے اور آسٹریا کی عظیم سلطنت کو زِک پہنچانے کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ جب وی آنا میں میریا تھیریسا تخت پر بیٹھی تو پڑوسی فریڈرک اعظم خواہ مخواہ خفا ہو گیا کہ ڈاڑھی مونچھوں والے بادشاہوں کی جگہ اب ایک چھوکری حکومت کرے گی، چنانچہ خفا ہوتے ہی اس نے سلیشیا کا علاقہ ہتھیا لیا۔ دوسرے پڑوسی بھی دیکھا دیکھی پیچھے لگ گئے اور چھینا چھپٹی شروع ہو گئی۔ رہی سہی کسر نپولین نے پوری کر دی۔ پہلے آسٹریا والوں کو شکست دی، پھر ان ہی کی شہزادی کے لیے پیغام بھجوا دیا۔ یہ پرانا شاہی خاندان سوچ میں پڑ گیا کہ اللہ تیری شان، نپولین جیسے نوادر کی یہ مجال۔ ویسے نپولین کی سراسر زیادتی تھی۔ شہزادیوں سے شادی کر کے شہزادہ بننا بہت مشکل ہے۔ ہالس برگ رضامند تو ہو گئے لیکن نہایت لطیف انداز سے بدلہ بھی لے لیا۔ شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے جو بوہیمین وفد بھیجا گیا اس کے لیے چھَنٹے ہوئے لوفر، چور اور شرارتی اکٹھے کیے گئے۔ پیرس پہنچ کر ان حضرات نے جی بھر کر افراتفری مچائی اور ڈکشنری کو بوہیمین کے نئے معنی عطا کیے۔

جب نپولین کو جلاوطن کر کے البا بھیجا گیا تو داماد کی اس دُرگت پر بجائے افسوس کرنے کے بغلیں بجائی گئیں۔ فوراً وی آنا میں کانگریس منعقد کی گئی کہ نپولین نے

جو کچھ فتح کیا ہے وہ متعلقین کو واپس دیا جائے۔ حقدار تو الاٹمنٹ کے سلسلے میں جھگڑ ہی رہے تھے، لیکن کئی فرضی دعویدار بھی آ گئے۔ خوب ہڑبونگ مچی اور کانگریس نے اتنی طوالت پکڑی کہ نپولین کو مجبوراً البا سے فرار ہو کر فرانس پہنچنا پڑا۔ کانگریس ختم ہو گئی۔ سارے بادشاہ سرپٹ اپنے اپنے ملکوں کو بھاگے۔

واٹرلو میں نپولین کی اصلی شکست ہوئی، تو عہد نامہ وی آنا کے مطابق ستائے ہوئے ہالس برگوں کو کافی سارا علاقہ لوٹا دیا گیا۔

اب بسمارک آیا۔ اس نے اپیل کی کہ جرمن بھائیو تم سب ہمارے تحت متحد ہو جاؤ۔ یعنی کسی طرح آسٹریا کی قوّت توڑ دو۔ ہالس برگوں سے بھی لوگ اُکتاتے جا رہے تھے کہ کیسا خاندان ہے، ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جب دیکھو ایک نیا ہالس برگ حکومت کر رہا ہوتا ہے۔ ویسے بھی پبلک تنوّع چاہتی ہے۔ ایک دن بسمارک فوج لے کر آیا آسٹریا کو شکست ہوئی اور اسے جرمن برادری سے خارج کر کے حقّہ پانی بند کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی آسٹریا کا عہدِ عسکریت ختم ہوا۔ عظمت جا چکی تھی، لیکن عظیم ماضی کا نشہ ہنوز باقی تھا۔ تھیٹر، اوپرا اور رقص کا سنہرا زمانہ شروع ہوا۔ جھلملاتی روشنیوں میں رات بھر رقص ہوتے۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر ساری رات جاگتے،

دن بھر سوتے اور پبلک خوش ہو گئی۔

جنگِ عظیم شروع ہوئی تو سب چونکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہت کچھ چھِن چکا تھا۔ یہاں تک کہ ملک کی ایک بندر گاہ تک نہیں رہی تھی۔ بعد میں جب ہٹلر آیا تو لوگ ایک دوسرے سے اتنے بد گمان تھے کہ لڑے ضرور۔۔۔ حملہ آوروں سے نہیں بلکہ آپس میں۔ کچھ پارٹیوں نے تو ہٹلر کے سپاہیوں کو خوش آمدید کہا اور انہیں ہار پہنائے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ملک کچھ عرصے کے لیے چار حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور جب چار سپاہی (روسی، انگریز، امریکی اور فرانسیسی) ایک جیپ میں بیٹھ کر گشت پر نکلتے تو وی آنا کے بچّے انہیں بڑی حیرت سے دیکھتے۔

اس کے بعد آسٹریا آزاد ہو کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اور باشندے اپنے پرانے مقولے کو دہرانے لگے کہ۔۔۔ ”جھُک جاؤ، مگر گر و مت۔“

(کئی ملکوں میں ”گِر جاؤ مگر جھکو مت“ پر بڑی سر گرمی سے عمل کیا جاتا ہے)

وی آنا بھی یورپ کا قلب تھا۔ پیرس کی طرح اس میں بھی نسوانیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں۔ بلگراڈ کا بھی یہی دعویٰ ہے۔ اُدھر بحیرۂ روم کے اکثر شہر اسی پر خوش ہیں۔ یوں تو اہلِ مشرق مغرب سے بیزار ہیں اور وہ ان سے، لیکن جہاں دونوں مل رہے ہوں وہاں متعلقین پھولے نہیں سماتے۔ ایسے وی آنا میں کچھ کچھ مشرقیت پائی جاتی ہے۔ ٹرینیں اکثر لیٹ ہوتی ہیں۔ دکانوں کے کھلنے، بند ہونے کے کوئی خاص اوقات نہیں۔ سال بھر تعطیلات کی بھرمار رہتی ہے۔ بس میں چڑھتے اترتے وقت جسمانی قوّت اور پھرتی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کیونکہ قطار باندھنے کو مغرب کی بیکار رسموں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ بار بار کافی پینا اور گپیں ہانکنا محبوب مشغلوں میں شامل ہے۔ لوگ تیتر اور ہرن کے شوقین ہیں۔ لہسن اور انگوری سرکے کو بھی پسند کیا جاتا ہے۔ بات چیت ہمیشہ مؤدبانہ انداز سے ہوتی ہے۔ ہر داڑھی والے کو ادب سے پروفیسر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور موٹے اور گنجے شخص کو ڈائریکٹر (ایسے آدمی یہاں کافی تعداد میں ملتے ہیں)۔ خوش پوشاک اور خلیق انسان کو عموماً EXCELLENCY کا خطاب مل جاتا ہے اور جس کے بارے میں قطعی رائے قائم نہ کی جائے اسے ڈاکٹر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جب تک کوئی گنجا نہ ہو جائے یا سارا سر سفید نہ ہو جائے، اسے ناتجربہ کار سمجھا جاتا ہے۔

کیفے بے شمار ہیں اور مشرق کے کافی ہاؤس اور قہوہ خانوں سے ملتے ہیں، یعنی ہر وقت فارغ آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ شور بھی اتنا ہی مچتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کافی ختم کر کے بیٹھے رہو تو کوئی بُرا نہیں مانتا یعنی بیرے خفگی سے نہیں گھورتے۔ اخبار، رسالے بھی مُفت پڑھے جا سکتے ہیں۔ گھنٹوں شطرنج کھیلو، ٹیلی فون استعمال کرو، کچھ نہیں دینا پڑتا۔

پُرانی روایات کا احترام کیا جاتا ہے۔ ہوٹل کے مینجر سے پوچھو کہ کمرے میں قُفل لگانے کی ضرورت ہے یا نہیں، تو وہ بڑی ملائمت سے جواب دیتا ہے ”یہ یہاں کی رسم ہے کہ کوئی چوری نہیں کرتا۔ اگر وی آنا والے کچھ چُراتے ہیں فقط دل چُراتے ہیں۔“

ہم نے ایک کیفے میں کھانے کا آرڈر دیا۔ بیرا بڑے اہتمام سے برتن، رومال، چھری کانٹے لایا۔ پھر پھول سجائے۔ اس کے بعد ایک موسیقار خاص ہمارے لیے میز سے لگ کر گٹار سے نغمہ سُنایا۔ ہم کھانے کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک اور بیرا آیا جس نے پہلے جھک کر سلام کیا اور پھر کمال سے برتن اُٹھائے، پھر چھُری کانٹے، رومال اور آخر میں پھول لے گیا۔

دِلبر نے بتایا کہ یہ کیفے اتنا مقبول ہے کہ یہاں آنے سے پہلے بُکنگ کرانی پڑتی ہے

جس کا ہمیں علم نہ تھا۔ لہٰذا یہ بات ہمیں اشاروں میں بتائی گئی ہے تا کہ کسی کو آزردگی نہ ہو۔ کبھی کبھی سیّاح مشرقی قنوطیت سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ علیک سلیک کے بعد "سُنایئے کیا حال ہے؟" پوچھنے پر بعض اوقات اس قسم کا جواب بھی ملتا ہے۔

"الحمدِللہ! کافی خستہ حالت ہے۔"

ایک پرانے زمین دوز کیفے کی بڑی شہرت ہے اس لیے کہ اسے ۱۵۰۰ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور پھر وہاں WAGNER اور مارک ٹوین بھی آیا کرتے تھے۔

پرانے شہر میں تنگ اور پیچیدہ گلیاں اب تک ہیں۔ یہ فلمسازوں کی گلیاں ہیں۔ جب بھی باہر سے کوئی فلم ساز آیا ہے تو اس حصّے کو چنا ہے۔ غالباً لوگ سیدھی اور سپاٹ سڑکوں سے غیر شعوری طور پر تنگ آ چکے ہیں اور دوبارہ بَل کھاتے ہوئے راستوں پر ٹہلنا چاہتے ہیں۔

جو فصیل پرانے شہر کو محیط کرتی تھی اس نے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدّتوں قابو میں رکھا۔ آخر جواب دے گئی۔ پبلک کے پُرزور اصرار پر مشہور و معروف سال ۱۸۵۷ء میں پرانی فصیل ڈھائی گئی، تو سب یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ

فصیل کی جگہ سرکلر روڈ خود بخود بن گئی ہے۔ عُمدہ سرکلر روڈ بنانے کا یہ طریقہ پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس سڑک پر شہر کی ساری مشہور عمارتیں ہیں۔ پارلیمان اور اس کے سامنے ٹاؤن ہال ہے۔ ایک طرف یونیورسٹی ہے۔ پھر اوپرا ہاؤس، اکادمی اور ہالس برگوں کا مشہور محل ہوف برگ۔

شروع شروع میں یا تو وی آنا جانے والوں سے غلطی ہوئی یا لوگ دریا کے سیلاب سے ڈر گئے۔ چنانچہ ڈینیوب شہر سے ذرا ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ بعد میں لوگوں نے شکایت کی کہ دریا اتنی دُور ہے کہ ہم اس سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔ حکومت عوام کی ہمدردی کا ذرا خیال نہیں رکھتی۔ اسے چاہیے کہ یا تو شہر دریا کے قریب لے جائے یا دریا کو اس طرف بہائے۔ ان دونوں خوشحالی کا دَور تھا۔۔۔ لہٰذا نہر کاٹ کر شہر میں سے گزاری گئی اور واپس دریا سے ملا دی گئی۔ پبلک نے پھر احتجاج کیا ہوگا کہ یہ تو مصنوعی دریا ہے۔ ہمیں تو اصلی ڈینیوب چاہیے حالانکہ اس نہر کے ذریعے شہریوں کو ٹھنڈا پانی مہیا کرنے کے لیے بہت بڑا زمین دوز حوض بھی بنا دیا گیا تھا۔ نہر اور دریا کے درمیان ایک خوشنما قطعہ تھا، اس میں فوراً ایک وسیع پارک بنایا گیا کہ کہیں لوگ کوئی سوسائٹی بنا کر قرضے پر مکان نہ بنانے شروع کر دیں۔ دو ہزار ایکڑ زمین یعنی اسّی مربعوں کے اس پارک کا نام پراتر ہے۔ کبھی یہاں بادشاہوں کے ہرن رہتے تھے اب انسان چوکڑیاں بھرتے ہیں۔

دِلبر ہمیں وی آنا کا مشہور جنگل دی آنز والڈ دکھانے لے گیا۔ جہاں شہر ختم ہوتا ہے وہاں سے یہ ہرا بھرا حسین جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑیوں، وادیوں کو ڈھانپتا ہوا مغرب کی طرف الپس ALPS سے جا ملتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، یہاں کے باشندوں کو اپنے گھروں سے زیادہ جنگل عزیز ہے۔ ان کا بیشتر وقت یہیں گزرتا ہے۔ گرمیوں میں جب گلیوں میں خاک اُڑتی ہے تو یہاں سبزے کے فرش پر پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اور سردیوں میں لوگ برف پر پھسلتے ہیں اور چوٹیں کھاتے ہیں۔

خوشگوار دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گھاس، پودے، درخت، سب چمک رہے تھے اور مجد ہی کو اس زمانے کی باتیں یاد آ رہی تھیں جب وہ پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔

”کیسا سہانا دن ہے اور کتنا دلکش منظر۔ جی چاہتا ہے بھی یہیں گھومتا رہوں۔“

مجد ہی باقاعدہ جنگل کی پیمائش کرنے لگا جس کے چپّے چپّے سے حسین یادیں وابستہ

تھیں۔

ہیمل کاغذ پنسل لیے واپسی کے اخراجات، باقی ماندہ نقدی، ہوٹل کے بل وغیرہ کا حساب لگا رہا تھا۔

دِلبر بولا: ”جوہانا نے مدّتوں بعد کل فون کیا۔ کہتی تھی کہ ہیمل ضرورت سے زیادہ چوکنّا ہے اور ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس کا تجزیۂ نفسی ہونا چاہیے۔“

”اگر سوچوں نہ تو کام کیونکر ہوں؟ تفکّرات سے یا تو وہ آزاد ہیں جو بالکل لاپرواہیں اور جن کے کام سدا ادھورے ہوتے ہیں یا وہ خوش قسمت جن کیلئے دوسرے فکر کرتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ رہ گیا تجزیۂ نفسی۔۔ سو اس سے فقط یہ حاصل ہو گا کہ مُشکل الفاظ۔۔۔ اَنا، ردِّ عمل Super Ego اور کئی COMPLEXES کی لمبی فہرست تیار کر لی جائے گی۔ اور پھر کون جانتا ہے کہ میں سچی باتیں بتاؤں گا بھی یا نہیں۔ جیسے سوانح عُمری لکھتے وقت کچھ واقعات دانستہ طور پر چھوڑے جاتے ہیں اور عموماً صرف اچھی باتیں لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح بتانے والا سب کچھ نہیں بتاتا، نہ سارے خواب سُناتا ہے۔“

”مگر میں تو سارے خواب سُنا دیتا ہوں۔ اگرچہ بعد میں کافی خِفّت ہوتی ہے۔“

مجد ہی بولا۔

"خِفّت کیوں ہوتی ہے؟" دِلبر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ بیشتر خواب بالکل اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ ان کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ اور جو خواب جتنا زیادہ مہمل ہو اتنی ہی بار دکھائی دیتا ہے۔"

"لیکن کئی خواب بڑے فرحت انگیز ہوتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے مشہور V.I.P. بن جانا۔۔ محبوب کو قدموں میں جھکانا۔۔ یا محبوب کے ساتھ بھاگ جانا وغیرہ۔ یہ اور ایسی بہت سی مسرّتیں صرف خوابوں ہی میں میسّر ہو سکتی ہیں۔" دِلبر نے بتایا۔

"ہوتی ہوں گی۔ پتہ نہیں، یا شاید مجھے خواب دیکھنا نہیں آتا۔ مثال کے طور پر وہ خواب سناتا ہوں جو ایڈنبرا میں مجھے تقریباً ہر ماہ نظر آیا کرتے۔ پہلے حسین و جمیل پروانے دکھائی دیتے۔ سہیلیاں اسے دلہن بنانے آئی ہیں۔ میک اَپ کا سامان، زیورات، قیمتی کپڑے لئے منتظر ہیں مگر پروانے خاموش بیٹھی ہے۔ اس کی والدہ سے شکایت کی جاتی ہے جو اسے فوراً تیار ہونے کا حکم دیتی ہے۔ اس پر پروانے جھلّا کر نعرہ لگاتی ہے۔۔ تیار تو تب ہوں اگر کوئی میرے SHAVE کے لیے گرم پانی

لا کر دے۔ اس کے بعد فیڈ آؤٹ۔۔۔ اور پھر جیسے میں خواب میں سویا ہوا ہوں اور میرے ہونے والے خُسر مجھے جگا کر کہتے ہیں کہ فوراً اُٹھو! بے بی کی تقریر میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ وہ لوگ کار میں مجھے اپنے ساتھ بٹھانا چاہتے ہیں، لیکن میں ضد کر کے سامان رکھنے کی ڈِکّی میں بیٹھتا ہوں اور ڈِکّی میں قفل لگواتا ہوں۔ جلسہ گاہ میں اپنے پنگھوڑے سے بے بی نہایت فصیح و بلیغ تقریر کرتا ہے اور بعد میں حاضرین کو سوال پوچھنے کی دعوت دیتا ہے۔ ایک بزرگ پوچھتے ہیں کہ کیا معزّز مقرر بتا سکیں گے کہ گیارہویں بارہویں صدی کا مالی نظام جو ختم ہو چکا ہے بہتر تھا یا زمانۂ حاضرہ کا فنانشل سسٹم؟ اس پر بے بی مُنہ سے انگوٹھا نکال کر جواب دیتا ہے کہ میں یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر گاؤ آمد و خر رفت۔۔۔ اس جواب پر اتنے زور سے تالیاں بجتی ہیں کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اب بتاؤ کہ اس قسم کے خوابوں کی کیا افادیت ہے؟ ان کے کیا معنی ہیں؟"

دِلبر فوراً بولا۔۔۔۔

"یہی کہ نفسیات کی رُو سے تُم پروانے کی نمایاں شخصیت سے مغلوب ہو چکے ہو اور لاشعوری طور پر اس سے ڈرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ بے بی کا مستقبل نہایت

شاندار ہے۔"

"بھلا پروانے سے میں کیوں ڈروں جبکہ وہ میرے بھتیجے کی منگیتر ہے۔ رہ گیا بے بی جو خواب میں چھوٹا سا نظر آتا تھا، ساڑھے پانچ فٹ لمبا ہے۔ وہ میری بہن کا سب سے نالائق بچّہ ہے جس سے سارے اُستاد نالاں ہیں۔ اور ہیمل خوابوں کے معاملے میں پیچھے رہ گیا ہے۔۔۔"

"تم نے یاد دلایا تو سُن کر مجھے بھی ایک خواب نظر آیا کرتا ہے۔" ہیمل نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "کہ جیسے مجھے ایک لڑکی بہت پسند ہے۔ اتّفاق سے خواب میں میری عمر چالیس برس ہے اور وہ دس سال کی ہے۔ عُمروں میں ایک اور چار کا تناسب ہے۔ لہٰذا شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پانچ سال کے بعد وہ پندرہ کی ہو جاتی ہے اور میں پینتالیس کا۔ متناسب گھٹ کر ایک اور تین کا رہ جاتا ہے لیکن کچھ بات نہیں بنتی۔ پندرہ سال مزید انتظار کرنے پر بھی تناسب صحیح نہیں ہوتا، کیونکہ اب اس کی عُمر مجھ سے نصف ہے۔ بس اسی طرح حساب لگاتا رہتا ہوں کہ کتنا اور انتظار کیا جائے کہ عُمروں کا تناسب درست ہو سکے۔ اتنے میں آنکھ کھُل جاتی ہے۔۔۔"

"نِرے ریاضی کے خواب فقد انگریز ہی دیکھ سکتے ہیں۔" دِلبر نے کہا۔ "اور اس

شام جوہانا نے ڈاکٹروں کے بار بار ٹوکنے کا ذکر کیا تھا۔ وہ درست کہتی تھی۔ اور پھر طبّی مشوروں میں اکثر اختلاف ہوتا ہے۔ کبھی صلاح دی جاتی ہے کہ غم و غصّے کو خاموشی سے برداشت کرو۔ دل میں جو ہو سو ہو، مُسکرانے کی کوشش کرو۔ پھر کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی دل کا غبار نکال لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ عورتوں کی مثال دی جاتی ہے جو لڑ جھگڑ اور رو دھو کر ساری بھڑاس نکال لیتی ہیں۔ ان کی عمریں مردوں کے مقابلے میں طویل ہوتی ہیں اور انہیں دل کی بیماریاں بھی نہیں ہوتیں۔ انسان سوچنے بیٹھ جاتا ہے کہ کس پر عمل کرے؟“

”سوچ بچار اور رائے میں اختلاف ہونا تو اچھّی بات ہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔“ ہیمل نے جواب دیا۔

مجد ہی کہنے لگا۔ ”طبّی مشوروں کے متعلق ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ ایک خاتون کو بے خوابی کی شکایت تھی۔ معالج نے بتایا کہ رات کا کھانا خوب اچھی طرح کھایا کرو۔ نیند ضرور آئے گی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد وہ پھر اسی کے پاس گئی اور نیند کی کمی کی شکایت کی۔ اتّفاق سے وہ مریضہ کو بھول چکا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ رات کا کھانا بالکل ہلکا پھلکا ہونا چاہیے۔ پھر آپ مزے سے سوئیں گی۔ خاتون نے یاد دلایا کہ ڈیڑھ ماہ پہلے تو آپ نے بالکل اُلٹ بتایا تھا۔ اس پر معالج نے فوراً جواب

دیا۔۔۔۔“

”خاتون، آپ نہیں جانتیں کہ اس ڈیڑھ مہینے میں میڈیکل سائنس نے کتنی حیرت انگیز ترقّی کی ہے۔“

دِلبر نے قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھا۔۔”اس پر بھی تو کچھ کہو۔“

”عرصہ ہوا ہمارے ہاں ایک بزرگ نے نفسیات پر بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ فرمایا تھا دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو۔“

پورے شعر کا ترجمہ کیا، تو مجد ہی اُچھل پڑا۔۔۔”خیلی خوب است۔ قربانت شویم۔ قربانت شویم۔ پوری نظم سُناؤ۔ واللہ!“

ہیمل نے پوچھا۔”ان بزرگ کے پاس نفسیات کی ایم-اے یا پی-ایچ-ڈی وغیرہ کی ڈگری تو نہیں تھی۔“

”نہیں۔“

”تبھی اتنی عمدہ باتیں کہی ہیں۔“

دِلبر نے کیفے کا رُخ کیا جس کی کھڑکیوں سے ڈینیوب نظر آ رہا تھا۔ مجد ہی بہت

خوش تھا۔ قدرت نے پہاڑ، میدان، صحرا اور سمندر بھی بناتے ہیں۔۔۔۔ لیکن یہ دریا ہی ہیں جو زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ جو ہر دم رواں دواں ہیں۔ جنہیں جمود سے نفرت ہے۔ جو انسان کو فیض پہنچاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی شرارتاً اسے تنگ ہی کرتے ہیں۔ اور پھر ہر دریا کی ایک مخصوص خوشبو ہوتی ہے۔ یہ ہلکی ہلکی مہک سُونگھی؟ جس میں یورپ کی تاریخ اور کلچر رَچا ہوا ہے۔

"اَوروں کا بھی اس سے واسطہ رہ چکا ہے۔" میں نے علامہ اقبال کا شعر سُنایا۔

اُس کی زمیں بے حدود، اُس کا اُفق بے شُعور

اُس کے سمندر کی موج، دجلہ وڈینیوب و نیل

اس پر مجد ہی کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔۔۔ "واللہ یا حبیبی۔۔۔ تباہ شدیم۔۔۔۔ برباد شدیم۔۔۔ تمام شدیم۔۔۔ ہلاک شدیم۔" وہ جھومنے لگا۔

بیرا مشروب کی فہرست لایا۔ مجد ہی بولا۔ "جو مرضی ہو لے آؤ، فہرست اتنی مختصر ہے کہ چُننا نہ چُننا برابر ہے۔ جرمنی کا شہر بریمن سیّاحوں کو پانچ سو مختلف مشروبات پیش کرتا ہے۔"

"لیکن وی آنا ڈینیوب پیش کرتا ہے جسے دیکھ کر سادے پانی کے گلاس سے بھی

سرور پیدا ہوتا ہے۔" بیرا بولا۔

بعد میں جب بیرا بل لایا تو مجد ہی نے پوچھا: "ہم کل بھی یہاں آئے تھے لیکن آج قیمتیں کچھ زیادہ ہیں۔"

"کل یہاں ہجوم تھا اور آپ کو اس کونے میں جگہ ملی تھی۔ دریا کی طرف آپ کی پُشت تھی۔ آج دریا آپ کے سامنے ہے۔ تبھی بِل میں ذرا سا فرق ہے۔"

دِلبر مُسکرانے لگا: "دوستو مُجھے شبہہ ہونے لگا ہے، یہ مجھ سے ملنے نہیں آئے، بلکہ ڈینیوب کی کشش تمہیں کھینچ لائی ہے۔"

ہم روانگی کا پروگرام بنانے لگے تو دِلبر کہنے لگا کہ اکٹھے مت جاؤ ورنہ مجھے بہت محسوس ہوگا؛ چنانچہ پہلے ہیمل انگلستان گیا، پھر مجد ہی نے جنوب کا رُخ کیا۔ دِلبر نے مجھے ایک دن اور ٹھہرالیا کہ ابھی سٹیمر کی سیر باقی ہے۔ ہم ۵۳۵ سیڑھیاں چڑھ کر آٹھ سو برس پُرانے سینٹ سٹیفن گرجے کی چوٹی سے شہر کو دیکھ رہے تھے۔ دِلبر نے اشارہ کیا۔

"دراصل دریا کا وہ حصّہ زیادہ خوشنما ہے، لیکن اُدھر سرحد ہے اور اجازت لینی پڑتی ہے۔ لٰہذا آج ہم اس طرف جائیں گے۔ وہ سامنے میوزیم ہے جہاں ہارون الرشید اور شارلمین دونوں ہم عصروں کی تلواریں رکھی ہیں۔ وہاں سے چیکوسلوواکیہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہنگری کی سرحد ہے۔ دونوں مُلک کبھی ہمارے تھے، لیکن اب ان پر آہنی پردہ پڑ گیا ہے۔"

"ذرا دوربین دینا۔۔۔"

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟"

"پردہ تو نظر نہیں آتا۔۔۔"

"ایسے پردے نظر نہیں آیا کرتے۔ اُس طرف دُور برشنگنڈن ہے، جہاں بادلوں میں سے اُبھرا ہوا پہاڑ، کی چوٹی پر "عقاب کا گھونسلا" تھا۔ اس میں عقاب کی جگہ ہٹلر رہتا تھا۔ نازیوں نے اسی گھونسلے میں دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے باندھے۔ اس چوٹی سے ہمارا ہم وطن ہوٹل آسٹریا کو دیکھ کر دانت پیستا، کیونکہ اس کے اپنے ملک نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور یہاں اسے لگاتار ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ یہاں سے جرمنی گیا تو انہوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ شاید اس لیے کہ

وہ لیڈر کی تلاش میں تھے۔ اُس کونے میں موزارٹ کا مکان ہے۔ وہ موزارٹ جس نے چھ برس کی عُمر میں بادشاہوں کے سامنے پیانو بجایا۔ اس طرف موزارٹ کے شاگرد بیتھوؤن کا گھر ہے۔ اور وہ شاہی محل ہے جس میں وی آنا کے مشہور رقص ہوتے تھے۔ میرے خیال میں سب سے اچھا رقص نقاب پوشوں کا رقص تھا جو دراصل شادی شدہ لوگوں کا مارچ تھا۔ میاں بیوی بور ہو جاتے تو اس رقص میں حصّہ لیتے۔ رقص گاہ میں داخل ہوتے وقت سیاہ نقاب سے چہرہ چھپا لیا جاتا۔ رات بھر نہ کوئی کسی کو پہچان سکتا نہ پہچاننے کی کوشش کرتا۔"

"ایسے رقص کا فائدہ؟"

"فائدہ یہ تھا کہ سکینڈل نہیں اُڑتے تھے۔ جو کچھ ہوتا اسے نامعلوم نقاب پوش کرتے۔ نہ ڈیوک فلاں کو ذمّہ دار ٹھہرایا جاتا۔ نہ کاؤنٹس فلاں کو۔ بڑی اچھی رسم تھی۔ لیکن اب تو متعلقہ خواتین و حضرات خود یہ چاہتے ہیں کہ اخباروں رسالوں میں ان کی غلط لوگوں کے ساتھ تصویریں چھپیں تاکہ افواہیں اُڑیں اور پبلسٹی ہو۔ افسوس کہ پُرانی رسمیں مفقود ہوتی جارہی ہیں۔"

"پھر بھی غنیمت ہے کہ کچھ رسمیں ابھی تک باقی ہیں۔ اُن میں سے دو کا ذکر ہمارے پروفیسر نے کیا تھا کہ رومن اپنے قیدیوں کو آزاد کرتے وقت ان کے سر

پر ایک خاص قسم کی سبز بیل کا تاج پہنا کر شہر میں پھراتے تھے تا کہ سب دیکھ لیں۔ اس بیل کا نام بیچلرس تھا۔ اور اسی سے لفظ بیچلر نکلا ہے۔ اب تک بیچلر باہر نکلتے ہیں تو سب انہیں آزاد سمجھتے ہیں۔ اور قدیم ٹیوٹن لوگوں کا دستور تھا کہ شادی کے بعد قمری مہینے کے انیتس یا تیس دنوں تک شہد کی شراب HONEY WINE خُوب پی جاتی تھی۔ لفظ ہنی مون اسی سے نکلا ہے۔ ویسے اس رسم سے ایک حادثہ بھی ہو چکا ہے۔ HUNS کے سردار ATILLA نے ایک نئ شادی کی اور دیکھا دیکھی ہنی مون کے سلسلے میں اتنی شراب پی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔" میں نے بتایا۔

"پہلے یہ شہر معمولی سا تھا۔ لیکن جب تُرکوں نے دوبارہ محاصرہ کیا، تو وی آنا نے دونوں دفعہ یورپ سے اپیل کی کہ بھائیو ہمیں بچاؤ۔ سب نے خوب مدد کی اور یہ شہر بال بال بچا۔ اس کے بعد تعمیری کام شروع ہوا۔ عالیشان عمارتیں، تھیٹر، محل، پُل۔ یہاں تک کہ گرجے تک تعمیر کیے گئے۔ شاید پہلی دفعہ لوگوں کو اپنے شہر کی اہمیت کا احساس ہوا کہ تُرک اتنی دُور سے آتے ہیں تو ہمارے شہر میں ضرور کوئی خصوصیت ہو گی۔ تُرکوں کے محاصرے کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔۔۔۔

کہا جاتا ہے یلغار سے پہلے ترکوں کے کمانڈر نے کہلا بھیجا کہ کل دوپہر کا کھانا میں

وی آنا میں کھاؤں گا۔ چوبیس گھنٹے کی لڑائی کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو وی آنا کے کمانڈر نے پیغام بھیجا کہ آپ کا لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"مہم ناکام رہے تو یار لوگ ایسے لطیفے اکثر اُڑا دیتے ہیں۔ تُرک جیت جاتے تو یہ لطیفہ وہ سُناتے۔ جیسے NAZIS مفتوحین پر فقرے کسا کرتے تھے۔"

"نازیوں نے تو ہمارے گرجے تک جلا دیئے۔ جس گرجے کی چوٹی پر ہم کھڑے ہیں، پسپا ہوتے وقت اسے پٹرول سے بھگو کر گولے مار مار کر آگ لگا دی۔ پہلے زمانے میں کم از کم عبادت گاہوں کا تو احترام کرتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں ایک شہر کا محاصرہ اتنا طویل ہوا کہ محصورین بالکل مایوس ہو گئے۔ آخر حاکم کو گرجے کا خیال آیا۔ شہر کی سب عورتوں اور بچّوں کو گرجے میں جمع کیا گیا۔ آدھی رات ہوئی تو ان سے کہا کہ زور زور سے روؤ۔ محاصرین نے جو ایسے وقت گرجے سے چیخیں سُنیں تو ڈر گئے کہ آسمانی قہر نازل ہونے والا ہے۔ فوراً واپس چلے گئے؟"

دِلبر نے گھڑی دیکھی۔ "پَون گھنٹے میں سٹیمر روانہ ہو گا۔"

ہم سیڑھیاں اُترنے لگے۔ دِلبر آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔

"بلندی تک پہنچنا کافی مشکل ہوتا ہے لیکن بلندی سے نیچے آنا اس سے زیادہ مشکل

ہے۔ پانچ سو پینتیس سیڑھیاں گِنتا ہوا دِلبر ایک منجھا ہوا تجربہ کار فلسفی معلوم ہو رہا تھا۔

دُشمن تو پھر دُشمن ہے، اپنوں کو گرجوں کی پروا نہیں۔ مُلک کے صحیح حالات کا اندازہ لگانا ہو تو گرجے چلے جاؤ۔ اگر گِنے گِنائے آدمی نظر آئیں تو سمجھ لو کہ خیریت ہے۔ اگر ہجوم دکھائی دے تو پھر یا تو جنگ قریب ہے، سیلاب یا قحط آنے والا ہے یا وبا پھیلی ہوئی ہو گی۔ عام طور ہر جو پہلے وہاں پہنچتا ہے وہ پچھلی سیٹ چُنتا ہے تاکہ وعظ میں اونگھ آ سکے۔ دیر سے آنے والوں کو آگے بیٹھ کر سب کچھ سُننا پڑتا ہے۔ شاید اس لئے کہ نِت نئی دریافتوں، ایجادوں نے ہمیں مذہب سے دُور کر دیا۔ یا اس لیے کہ مذہبی پیشوا ہمیشہ مفکّروں اور فلاسفروں کی مخالفت کرتے آئے ہیں۔"

"لیکن مفکّر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے یاد ہے گلیلیو کا قصّہ۔ جب اُس نے اعلان کیا کہ زمین گھُومتی ہے تو مذہبی پیشوا پیچھے پڑ گئے اور گرفتار کرا دیا۔ گلیلیو کو مجبور کیا گیا کہ سب کے سامنے توبہ کرے، تب جان بخشی ہو سکتی ہے، بھرے مجمع میں گلیلیو نے توبہ کی اور کہا: 'مجھ سے بڑا قصور ہوا۔ مَیں اپنی غلط بیانی پر شرمندہ ہوں اور دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین گھومتی ہے'۔"

سٹیمر کا سفر نہایت خوشگوار تھا۔ دِلبر لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا اور مَیں پریوں کی کہانیوں والے قلعوں کو، جن کے نوکدار منارے درختوں سے اُبھر کر بادلوں میں چھُپے ہوئے تھے۔ نیا موڑ آتا تو ایک نئی وادی دکھائی دیتی۔۔۔ انگوروں کی بیلیں، سرسبز پہاڑوں پر درختوں کے حاشیے اور کوئی خوبصورت سا محل۔

لاؤڈ سپیکر سے متواتر والز سُنائی دے رہے تھے۔

”یہ بتاؤ کہ جن دِنوں ستراس والز پر والز تخلیق کر رہا تھا۔ اس کے ہم عصر براہمز اور بُرکنر حمد و ثنا میں کیوں مشغول تھے؟ انہوں نے قدرت اور قدرتی نظاروں پر نغمے کیوں لکھے؟ انہیں شوخی اور چنچل پن پسند نہ تھا؟“

”ستراس وی آنا میں رہتا تھا اور یہ دونوں گاؤں کے باشندے تھے اور دیہاتیوں کی طرح قدرتی نظاروں کے مدّاح تھے۔ وی آنا کے حُسن وجمال اور رنگینیوں کا اندازہ بس ستراس کی موسیقی سے کیا جا سکتا ہے۔“ دِلبر بولا۔

اب سٹیمر واپس آرہا تھا اور دِلبر بار بار اپنے بالوں والی حسینہ کو شام کے کھانے پر مدعو کر رہا تھا۔ ہر دفعہ وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ میں نے ٹوکا کہ رہنے دو ضد کیوں کرتے ہو۔

"تم نہیں جانتے، شاید یہ ہنگری کی ہو۔ وہاں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں سر ہلایا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے ہاں۔ اور یونانی زبان میں لفظ NAI سے مراد ہے جی ہاں۔"

سٹیمر رُکا تو دِلبر نے ایک ایک لڑکی کی انگلیاں چومیں۔ انہیں جھک کر سلام کیا۔

وی آنا پہنچے تو اس نے بتایا۔۔۔ "ان لڑکیوں کو کیزانووا بار میں مدعو کیا ہے۔"

یورپ میں جہاں کہیں اوٹ پٹانگ حرکتیں ہونے کا امکان ہو۔۔ مثلاً قُمار خانے، مَے خانے، وہ ناچ گھر جہاں ترقّی پسند رقص ہوتے ہیں۔۔۔ الغرض جہاں بھی خرمستیاں ہو سکتی ہوں، اس جگہ کو غریب کیزانووا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بَد اچھّا بدنام بُرا۔

گیارہ بجے ہوں گے کہ کیزانووا میں دِلبر آؤٹ ہو گیا۔ اسے ٹیکسی میں سوار کر کے

مَیں باہر نکلا۔ شہر میں رونق تھی، لیکن مضافات میں سڑکیں سُنسان تھیں۔ کبھی کوئی موٹر گزر جاتی یا اِکّادُکّا آدمی مل جاتا، ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ پہاڑیوں پر دُھند اُتر رہی تھی۔ ایک بادل سا نیچے آتا اور آسمان کے تارے دُھندلے ہو جاتے۔ پھر سب کچھ صاف ہو جاتا۔

آہستہ آہستہ دُھند گہری ہو کر اپنے درختوں کی چوٹیوں پر رُک گئی۔ پگڈنڈی بَل کھاتی ہوئی اُوپر جا رہی تھی۔ اُوپر پہنچ کر ایک جگہ میدان آیا۔ مَیں نے نیچے دیکھا تو وہاں ڈینیوب بہہ رہا تھا۔ اور شہر کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ یورپ کے شہروں پر رات کو جب ہلکی سی دُھند چھا جاتی ہے تو زمین کی بے شمار روشنیوں سے آسمان پر اُجلا سا گنبد بن جاتا ہے۔

ایک بوند گِری، پھر دوسری، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ جنگل میں جھینگر بولنے لگے۔ بارش کی آمد پر جھاڑیوں اور درختوں کی مخلوق جاگ اُٹھی۔ اُن کا مدھم سا شور، بوندوں کی دھیمی دھیمی صدا، پتّوں اور ٹہنیوں سے گُزرتی ہوئی ہوا کی آواز۔ جیسے سمفنی شروع کرنے سے پہلے آرکسٹرا کے ساز ہم آہنگ کیے جا رہے ہوں۔ اور پھر وی آنا کے عظیم نغمہ نگاروں کی دُھنیں کانوں میں گونجنے لگیں۔

بجلی چمکی اور لمحے بھر کے لیے شہر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ رات کی تاریکی اور

مدھم روشنیوں میں لپٹا ہوا یہ شہر دنیا اس شہر کی ممنون ہے۔ موسیقار یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں۔ ان کے لیے اور موسیقی کے مدّاحوں کے لیے وی آنا اور قرب وجوار کا چپّہ چپّہ مقدس ہے جہاں ان عظیم فنکاروں کے قدم چھوئے تھے۔ انہی پہاڑیوں میں، اسی دریا کے کنارے، اسی ماحول میں انہوں نے ایسے نغمے تخلیق کیے جو تب تک زندہ رہیں گے جب تک انسان زندہ ہے۔

اور انہیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ ان کی تخلیقات اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے تھیں۔ وہ کون سا جذبہ تھا؟ ماحول کی ظلمت سے وہ کون سی کرن پھُوٹی جس نے روح کے نہاں خانے کو نور سے بھر دیا؟ ان دُھنوں کو عالی شان تھیٹروں میں سُنا جائے یا جھونپڑیوں اور ویرانوں میں، انسان کچھ دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ وہ ان کروڑوں مجبور اور غمگین ہستیوں میں سے ایک ہے جنہیں کرۂ ارض پر زندگی کے پچاس ساٹھ سال گزارنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ نغمے سُن کر وہ گہرا احساسِ غم چلا جاتا ہے اور دِل نوزائیدہ اُمیدوں اُمنگوں سے معمور ہو جاتا ہے۔ دِل سے نکلا ہوا پیغام ہمیشہ دل میں اُترتا ہے۔ یہ موسیقی مُلکوں اور قوموں کی قید سے آزاد ہے۔ ان چند فن کاروں نے کتنے انسانوں کو مسرّتیں بخشی ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر جب تک جیئے گمنام رہے۔ دنیا میں بے شمار ہستیوں نے فوری شہرت حاصل کی۔۔۔ ہلاکو نے انسانی سَروں کے مینار بنا کر۔

سیز ربور جیا نے اپنی ضیافتوں میں ہزاروں بے گناہوں کو زہر دے کر۔ ایک شخص ارسطریوٹس نے دنیا کا عجوبہ آرٹیمس کا مشہور مندر جلا دیا۔ اُس سے وجہ پوچھی گئی تو بولا: ”میں شہرت کا طالب تھا۔ اب تک مجھے کوئی نہیں جانتا تھا، لیکن اس واقعے کے بعد رہتی دنیا تک میرا تذکرہ ہو گا۔“

ان میں سے بیشتر نغمہ نگاروں نے غُربت میں دن کاٹے۔ براہمز، ہیدن اور شوبرٹ جسے صرف اکیس سالہ زندگی ملی۔ موزارٹ جو پینتیسویں برس میں مر گیا اور مخزن وملول بیتھوؤن جو آخری دنوں میں مکمل بہرے پن کی وجہ سے دُنیا میں بالکل تنہا رہ گیا، لیکن دکھ درد کے باوجود نغمے لکھتا رہا۔

شہر کی روشنیاں چھُپ چکی تھیں۔ بجلی چمکتی تو حدّ اُفق پر لمحے بھر کے لیے شہر کوند جاتا، پھر تاریکی چھا جاتی۔

اور نیچے ڈینیوب بہہ رہا تھا۔ نیلا ڈینیوب۔

مغربی موسیقی کی سب سے پہلی دُھن ڈینیوب تھی جو مَیں نے برسوں پہلے ایک تپتے ہوئے ریگستان میں سُنی۔ دیکھتے دیکھتے یہ نغمہ زمین سے آسمان تک پھیل گیا۔ ویرانے میں جیسے بہار آ گئی۔ نیلگوں لہریں اُبھرنے لگیں اور کناروں پر سبزہ

لہلہانے لگا۔ غنچے چٹکے، پھول مہکے، کہیں سے تتلیاں آ گئیں اور سب کچھ رنگین ہو گیا۔

اور اب یہ بلیو ڈینیوب میرے سامنے بہہ رہا تھا اور اتنا ہی پُر فسوں اور دلآویز معلوم ہو رہا تھا جتنا برسوں پہلے نغمہ سُن کر محسوس کیا تھا۔

میں نے اسے جرمنی میں ایک پتلی سی ندی کے روپ میں دیکھا تھا۔ پھر بلگراڈ میں جہاں سفید پہاڑ کے اُجلے سے محل کے سامنے اس نے نیلے رنگ کی جھیل بنا رکھی تھی۔ پھر اسے بلقان کے دوسرے خطوں میں دیکھا۔ چٹانوں میں، کُنجوں میں، جنگلوں میں، آبادیوں کے ساتھ ساتھ۔۔۔ کہیں دائرہ بناتا ہوا، کہیں قوس کی صورت میں، کہیں لہریے کی شکل اور اس وقت یہ اپنے عزیز شہر وی آنا کو چھُو رہا تھا۔

علی الصبح دِلبر مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا۔

عمارتیں، وادیاں، جنگل سب دُھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا پر دُھند

چھائی ہوئی تھی۔

دِلبر خاموش تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ڈینیوب کے کناروں پر کیا کچھ نہیں ہے۔ حسین نظارے، گزشتہ عظمت کی شان دار یادگاریاں، حُسن، خوشبوئیں، موسیقی اور بے فکری۔۔۔۔ لیکن ان سب کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی چیز کا انتظار ہو۔ صبح شام دریا سے جو دُھند پھیلتی ہے، سارے علاقے جیسے اس میں ملفوف رہتے ہیں۔ اور یہ کہ یہاں شاید زمانۂ حاضرہ کی نئی نئی ایجادوں کا اتنا چرچا نہیں، نہ وہ مستعدی اور گہما گہمی ہے جو مغرب کا حصّہ ہے۔

”یہ دُھندلاہٹ کب چھٹے گی؟“ اس نے بے خبری میں پوچھا۔

ٹرین میں سامان رکھواتے وقت وہ کہنے لگا۔

”یہ تمہارا صندوق ہے۔ یہ کیمرہ، برسائی، دوربین اور اس پیکٹ کو دوپہر کو کھولنا، اس میں تمہارا لنچ ہے۔“

”وی آنا کا لنچ ہے، ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

وہ ہنسنے لگا۔

"اچھا اب کہاں ملو گے؟"

"کسی دریا یا سمندر کے کنارے یا کسی شاہراہ پر ملاقات ہو گی۔"

"دوست، تم یاد آؤ گئے۔" اس نے میرا بازو دبایا۔

ٹرین چل دی اور آہستہ آہستہ دِلبر کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔

دجلہ

ایک ویرانے میں ٹامیوں نے بورڈ لگا رکھا تھا۔۔۔۔

”بغداد کا راستہ۔۔۔۔ سو سوا سو میل شمال مغربی سمت میں جا کر پھر ڈیڑھ دو سو میل مغرب کی طرف نکل جاؤ۔ اس کے آگے پچاس ساٹھ میل تک دائیں بائیں جھانکتے جاؤ۔ جہاں آبادی نظر آئے۔۔۔۔ یہی بغداد ہو گا۔“

بغداد جاتے وقت سفر بالکل اسی قسم کا تھا۔

مجھے بغداد سے زیادہ دجلے کو دیکھنے کا شوق تھا جیسے۔۔۔۔

؎ اس کے سمندر کی موج دجلہ وڈینیوب و نیل

والا دجلہ عام دریاؤں جیسا ہر گز نہیں ہو گا۔ بڑی ممتاز شخصیت کا مالک ہو گا۔

کافی انتظار کے بعد ایک بھوری سی ندی نظر آئی۔ روز (ROSE) بولا۔۔۔ ”آہا

دجلہ آگیا۔"

لاری ٹھہرا کر اسے قریب سے دیکھا۔ اُوپر مٹیالا آسمان تھا، نیچے سوکھے ہوئے کناروں کے بیچ میں گاراسا بہہ رہا تھا۔ اور دریاؤں کے قریب پہنچے تو پہلے ہریالی آتی ہے، پھر درختوں کے جھُنڈ آتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو نرسل یا گھاس ہی دکھائی دیتا ہے، لیکن یہاں کناروں پر بھی کچھ نہیں تھا۔ کنارے بھی پانی کی سطح سے کافی اُونچے تھے۔ اگر اندھیرا ہو تو انسان چلتا چلتا سیدھا دجلے میں دھم سے گرے۔ سعدی کا شعر

اگر باراں بہ کوہستاں نہ بارد

بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یاد آگیا۔ میرا اور یونٹ کا ساتھ عراق تک تھا، پھر مجھے واپس آنا تھا۔ کئی دِنوں کے سفر کے بعد ریت میں اَٹے ہوئے منزل پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کیمپ کمانڈانٹ کی تقریر ہونے والی ہے۔ مجمع میں انگریز، عراقی، ہندوستانی، کُرد، آرمینی، سب موجود تھے۔ اچھا خاصا بین الاقوامی ہجوم تھا۔

سُرخ رنگ کا ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا۔ پچپن ساٹھ کا ہو گا۔ تیر کی طرح سُتا

ہوا، بے تحاشا گھنی بھنویں اور بڑی بڑی بَل کھاتی ہوئی مونچھیں جو سفید ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے پتہ چلانا مُشکل تھا کہ مونچھیں بڑی ہیں یا بھوئیں۔ جسم کی ہر جنبش کے ساتھ مونچھیں ہلتیں یا بھوئیں۔۔۔ یا دونوں۔

"میرا نام برٹن ہے اور میں آج صبح آیا ہوں، بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ غیر ملکیوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں، اور اس نکتے پر میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ میرے لیے اجنبی ہوں تو ہوں لیکن یہ علاقہ اجنبی نہیں ہے۔ چھبیس ستائیں سال پہلے جب آپ میں سے بیشتر حضرات چھوٹے چھوٹے بچّے تھے میں یہاں جنگ لڑنے آیا تھا اور کئی برس رہا۔۔۔"

ایک وجیہہ شخص نے ان فقروں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

"تب سے میں مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں رہا ہوں اور ان ملکوں کے چپّے چپّے سے واقف ہوں لہٰذا میرے لیے یہ علاقہ پُراسرار ہرگز نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بصرے میں نسیمِ سحری چلتی ہے تو کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔ گرد اُڑتی ہے۔ بغداد کی بَل کھاتی ہوئی سحر انگیز گلیوں میں کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ شور و غل مچتا ہے اور مکھّیاں بھنبھناتی ہیں۔ موصل کی چاندنی راتوں کے طلسم سے بھی شناسا ہوں۔۔۔۔ گیارہ بجے تک گپیں ہانکی جاتی ہیں اور اس کے بعد کتّے چاند کی طرف

مُنہ کر کے روتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ملک کے شہروں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ جب مانچسٹر میں صبح ہوتی ہے تو دھوئیں اور کُہرے کے مارے ہوئے پرندے چہچہانے کی بجائے کھانسنا شروع کر دیتے ہیں اور لندن میں صبح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انگلستان میں سال بھر کے انتظار کے بعد ایک بُدھ بہار آتی ہے اور پورے تین ہفتوں کے بعد بُدھ ہی کے روز موسم، بہار ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے دوسرے اجنبیوں جیسا نہ سمجھیں، کیونکہ آپ کے محبوب جانور اُونٹ سے میری پرانی شناسائی ہے۔ برسوں تک اُونٹوں نے میرے قریب اور میں نے ان سے دُور رہنے کی کوشش کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے پیار سے اُونٹ کے بے شمار نام رکھے ہوئے ہیں۔ تیس چالیس تو مجھے بھی یاد ہیں، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ سائنٹیفک نکتۂ نگاہ سے اُونٹ کا ڈیزائن تسلّی بخش نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کسی کمیٹی کی سفارشات پر بنایا گیا ہو۔ ساتھ ہی مجھے برطانیہ کے چہیتے جانور شیر کے بارے میں بھی زیادہ خوش فہمی نہیں۔ حکومتِ برطانیہ کی سرکاری مُہر پر شیر ہے ---- لندن کی عمارتوں کا دبدبہ پتھّر کے بڑے بڑے شیروں سے ہے۔ میری ٹوپی پر سنہرا شیر بنا ہوا ہے۔ حالانکہ ہمارے چھوٹے سے جزیرے میں شیر تو ایک طرف رہا، چیتا یا معقول سائز کا بھیڑیا تک نہیں پایا جاتا۔ اور میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں یہاں محض کچھ عرصے کے لیے ہوں۔ پھر

یہاں کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں کو چھوڑ کر دوسرے ملک کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں میں زندگی گزارنے چلا جاؤں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کر سکتے ہیں۔۔۔"

عربی میں ترجمہ ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی "واللہ یا ابُو شوارب!"

"یہ کون تھا؟" برٹن نے پوچھا۔

مشکی رنگ کا ایک بدّو کھڑا ہو گیا۔ "متشکّر یا ابُو ملاحت!" برٹن نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔

واللہ اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہجوم ہنسنے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جہاں بدّو نے برٹن کو مونچھوں کا باوا کہا تھا وہاں اس نے بدّو کو نمکینی کے ابّا کہہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ یہاں کے رواج سے واقف ہے کہ انسان کی سب سے نمایاں خصوصیت کے ساتھ ابو لگا کر نام رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ لیفٹیننٹ کے کندھے پر سٹار دیکھ کر اسے ابُو نجوم اور میجر کے کراؤن CROWN پر اُسے ابُو تاج کا لقب مل جاتا تھا۔ اس دن سے برٹن کا نام ابُو شوارب پڑ گیا۔

جو شخص ترجمہ کر رہا تھا وہ مقامی باشندوں سے بالکل مختلف تھا۔ ماتھے پر تیوری

چڑھائے یوں بیٹھا تھا جیسے ماحول سے قطعاً بیگانہ ہو۔ بار بار نوکدار مونچھوں کو تاؤ دیتا اور عقاب کی سی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھتا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لاپروا مغرور شخص ابھی کسی سے لڑ پڑے گا۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ یہ کُردستان کا ہے۔ اس کا نام طویل تھا۔۔۔ تین چار اِبن کچھ ابُو اور چند اَل آتے تھے تب جا کر مکمل ہوتا تھا لیکن سب اُسے منصُور کہتے تھے۔

شام کو دریا کے کنارے کِرمچ کی کرسیاں بچھائی گئیں۔ آفتاب غروب ہوا تو برٹن آیا اور بوتلیں پہنچ گئیں۔ پہلے نوواردوں کا تعارف کرایا گیا۔ پھر برٹن نے سب کی خیریت پوچھی اور بولا: ”حضرات MESS میں ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے سوائے خواتین، مذہب اور سیاست کے۔ عورتوں کا ذکر جہاں روایتاً ممنوع ہے وہاں ایسے کیمپ میں تو بالکل بیکار ہے۔ یہاں کوئی خاتون ہے ہی نہیں۔ چنانچہ ویرانے میں بیٹھ کر عورتوں کے متعلق باتیں کرنا بالکل ایسا ہے جیسے ہوا میں تلوار

چلانا۔ مذہب کا یہ ہے کہ سارے مذاہب اگرچہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کے پیرو ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرتے رہتے ہیں اور ہر مبلّغ پبلک کو فقط اپنے مذہب کے ذریعے زبردستی اپنے بہشت میں پہنچانا چاہتا ہے۔ رہ گئی سیاست تو، سپاہی کو اس کی پیچیدگیوں کی سمجھ ہی نہیں۔ اور پھر سیاست میں یہ عجیب بات ہے کہ لوگ لیڈر کی آہستہ آہستہ پیروی کرتے کرتے دفعتاً رفتار تیز کر کے اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے اِن دونوں صُورتوں میں لیڈر ہمیشہ آگے ہوتا ہے اور پبلک پیچھے پیچھے۔۔۔" گلاس سامنے رکھے گئے۔ میرے انکار پر روز بولا کہ "اسے کھیل کود کا بہت شوق ہے اور اس چیز سے STAMINA پر بُرا اثر پڑتا ہے۔۔۔۔"

"بالکل نوعُمروں والی بات کی ہے۔ اس عُمر میں طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں۔" برٹن ہنسنے لگا: "اعتدال ہو تو توانائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بڑے اچھے اچھے اسپورٹس مین پیتے ہیں۔ بہرحال میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔" کھیلوں کا ذکر شروع ہو گیا۔ برٹن کہنے لگا "مجھے کرکٹ بالکل پسند نہیں۔ ایک مرتبہ بلّا غلط گھما دو تو آؤٹ۔ اگر کوئی اچھے بھلے سٹروک نہایت ہی عمدہ کیچ کر لے تو آؤٹ۔ اپنا ساتھی بیٹسمین ذرا سستی دکھائے، تو خواہ مخواہ رَن آؤٹ! ہاکی، فٹ بال وغیرہ میں غلطیاں کرنے کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ کھیلنے دیتے ہیں اور پہلی ہی کوتاہی پر

میدان سے باہر نکلنا نہیں پڑتا۔۔۔"

پھر پولو پر پہنچا۔۔۔ "میں رسالے میں تھا۔ اب تک گھوڑے یاد آتے ہیں۔ گھوڑوں کی خوشبو یا بدبُو ٹینکوں کے پیٹرول کی بُو سے کہیں بہتر تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ گھوڑے ڈانٹنے چمکارنے سے مان جاتے تھے۔ مشینوں کو جتنا گھماؤ مروڑو، اتنی ہی بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ ویسے اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ ہارس پاور تب تک ٹھیک تھی جب تک وہ گھوڑے میں رہی۔۔۔۔"

پولو کے بعد نیزہ بازی، گھڑ دوڑ، لومڑی کا شکار، شہسواری کے کرتب سے ہوتے ہوئے معاملہ مچھلیوں کے شکار پر اٹک گیا۔

جب سب کے سب جمائیاں لے رہے تھے تو وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ سامن اور ٹراؤٹ کی عادات و خصلات میں کیا فرق ہے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان سے کب چھٹکارا ملے گا۔ اگر پرسوں نجات مل جائے تو اگلے سنیچر کی رات کو اس وقت سٹیمر میں ہوں گا۔ چاندنی ہوگی اور سمندر کی لہریں۔۔۔۔

اگلے روز برٹن نے مجھے بلا کر کہا کہ تمہاری کل شام کی گفتگو مجھے پسند آئی۔ میں نے

بغداد ٹیلیفون کر دیا ہے کہ تمہیں کچھ عرصے کے لیے یہاں رہنے دیا جائے۔

اس کے بعد بتایا کہ رات کو اس کے خیمے میں چوری ہو گئی اور کوئی سارے سگار وہسکی کی بوتلیں اور کافی کے ٹین لے گیا۔

”باقی چیزیں تو بچ گئیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے علاوہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔۔۔“

گورے سارجنٹ میجر نے آکر سلیوٹ کیا اور مخصوص انداز میں رپورٹ دی۔

”سَر آج صبح جب میں چاء پی رہا تھا تو مجھے سَر سارجنٹ ڈیوس نے بتایا کہ چوری سَر ہو گئی۔ میں نے ملٹری سَر پولیس کے کارپورل اور کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کو سَر رپورٹ کی۔ ہم سب اس سَر نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چور کوئی سَر مقامی باشندہ ہے۔۔۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔“ صبح برٹن نے اسے واپس بھیج دیا۔

رات کو کیمپ میں بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا۔ پھر بھی چور نالی میں سے سرکتا سرکتا آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ صبح کو نالی خطوط سے بھری ہوئی تھی جنہیں چور بیکار

سمجھ کر پھینک گیا تھا۔

"کوئی پڑھا لکھا چور ہو گا۔ وہ خط میرے بھتیجوں کے تھے اور ان میں حسبِ معمول پاؤنڈوں کی فرمائش کی گئی تھی۔ لیکن فقط میری ہی چیزیں کیوں چورائی گئیں؟ آس پاس بھی خیمے ہیں۔۔۔"

"شاید آپ کی کل والی تقریر کو چیلنج سمجھا گیا ہو گا۔۔۔"

"تمہارا قیاس صحیح ہے۔ پچھلی جنگ میں جب میں یہاں آیا تھا تب بھی مَیں نے مقامی باشندوں کے سامنے ایسی ہی تقریر کی تھی۔"

"تب کیا ہوا تھا۔۔؟"

"تب بھی چوری ہوئی تھی۔۔۔اسی رات کو۔۔۔۔"

اگلے روز کسی نے شکایت کی کہ قریب کے ڈاکخانے سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ پوسٹ ماسٹر سے پوچھا تو اس نے سر پیٹ کر بتایا کہ ٹکٹوں اور نقدی والا مقفّل صندوق وزنی زنجیر سمیت غائب ہے۔

پھر اتنی چوریاں ہوئیں کہ ہم نے افسوس کرنا چھوڑ دیا۔

خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا کہ درجۂ حرارت سائے میں ایک سو تیس تک پہنچ جاتا ہے لیکن سایہ ندارد تھا۔ علی الصبح پانچ بجے اُٹھ کر نو دس بجے تک کام کرتے اور پھر سہ پہر کے بعد باقی وقت خیموں میں چھپے رہتے۔

برٹن بڑا محنتی اور سخت جان تھا۔ جس تندہی سے خود کام کرتا اسی کی توقع دوسروں سے رکھتا۔ کام کے اوقات میں وہ ہم پر کڑی نظر رکھتا۔ نہ کسی کو پہچانتا، نہ کوئی فالتو بات کرتا۔ لیکن جہاں شام ہوئی، ایسا بدل جاتا کہ حیرت ہوتی کہ یہ وہی تلخ و جابر برٹن ہے؟ کام کے اوقات کے بعد بالکل دوستوں کی طرح ملتا۔ مشورے دیتا۔ قہقہے لگاتا۔

لیکن دن بھر آندھی آئے، لُو چلے، جب دیکھو پسینے میں شرابور، سینہ نکالے، کُہنیاں پھیلائے چکر لگا رہا ہے۔ اسے قیلولے سے سخت چڑِ تھی۔ کسی پر شُبہ ہو جاتا کہ یہ لنچ کے بعد سوتا ہے تو اسے بڑی نفاست سے تنگ کرتا۔

سہ پہر کو اردلی آتا۔۔۔ ”برٹن صاحب نے سلام بھیجا ہے۔۔۔“

وہ اُونگھتا ہوا غریب چھلانگ مار کر اُٹھتا اور وردی پہن کر پہنچتا۔

”افوہ تمہیں نہیں مِلر کو بلایا تھا۔“ برٹن کہتا۔ اور اگر مِلر ہوتا تو۔ ”افوہ تمہیں نہیں رچرڈ کو بُلایا تھا۔ اردلی سے غلطی ہوئی۔“

ایک روز کسی کو پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اس نے خیمے کا پلّو اُٹھا کر سلیوٹ کیا اور گُڈ آفٹر نون کہا۔ برٹن نے پہلے گھڑی دیکھی پھر خیمے سے باہر نکل کر سورج کی پوزیشن کا معائنہ کیا اور حقارت سے جواب دیا۔ ”گُڈ ایوننگ۔“ آہستہ آہستہ سب نے قیلولہ بند کر دیا۔

ٹیلیفون پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے چیئرز CHEERS ضرور کہتا، خواہ کیسا ہی موقعہ ہو۔ اس کے دفتر سے اکثر آواز آتی۔۔۔

”رابرٹ! تم سا سُست اور نکمّا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی وقت واپس کیمپ پہنچو۔ تمہاری خبر لوں گا۔۔۔ چیئرز!“ یا ”اسمتھ ابھی ابھی کرکُوک سے اطلاع آئی ہے کہ تمہارا سارا سامان چوری ہو گیا ہے اور لندن سے خبر ملی ہے کہ تمہارے مکان پر بم پڑا ہے۔۔۔۔ چیئرز!“ اور۔۔۔ ”جو حکم ملا ہے اسے فوراً بجا

لاؤ۔ بکو مَت۔ خاموش رہو۔۔۔ چیئرز!“

میں وطن سے پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا۔ ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا۔ ہر بات کو توجّہ سے سُنتا۔ برٹن کہا کرتا۔۔ ”لڑکو! جہان گردی اور قسمت آزمائی کے یہی دن ہیں۔ جگہ جگہ جاؤ، دنیا دیکھو، لوگوں سے ملو، تجربہ حاصل کرو۔ تجربے کا کوئی بدل نہیں ہے۔ غلطیاں کرو اور ان سے سبق سیکھو۔ یہ کتابیں نصیحتیں اور لیکچر سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کم ہو جائے گی اور ایک مرتبہ نظریے پختہ ہو گئے تو پھر سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ کبھی سمجھاتا کہ جس طرح مقابلوں کے لیے کھلاڑی ٹریننگ لیتے ہیں، مشقّت کرتے ہیں اسی طرح آفتوں، حادثوں اور غیر متوقع واقعات کے لیے ذہن کی ٹریننگ ہونی چاہیے۔ ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے ذہنی طور پر اُن سے مقابلے کے لیے تیّار رہو۔ مصیبتوں کا مزہ چکھّے بغیر لڑکا مرد نہیں بنتا۔“

اس کے دفتر میں حکیم بقراط کا مشہور مقولہ آویزاں تھا۔۔۔

”زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں۔ تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل۔“

"اس میں ضرور صداقت ہو گی۔۔۔" وہ کہا کرتا۔ "ورنہ اتنی صدیوں تک یہ مقولہ زندہ نہ رہتا۔"

اس کی میز پر جدید مغربی شعرا کا مجموعۂ کلام پڑا رہتا۔ لیکن ہم نے کبھی اسے ورق گردانی کرتے نہیں دیکھا۔ کسی نے پوچھا تو بولا۔۔۔ "لٹریچر کو میز پر یا الماری میں رکھنا اور نہ پڑھنا فیشن میں شامل ہے۔ تبھی یہ کتاب یہاں رکھی ہے۔ پتہ نہیں لوگ شعر کس طرح کہہ لیتے ہیں؟ کیونکہ اس کے لیے اَن دیکھی اَن جانی عجیب عجیب باتیں سوچنی پڑتی ہوں گی۔ بار بار فرضی باتیں سوچو تو ان پر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ ویسے موجودہ شاعری میں رونے پیٹنے اور زندگی کی تلخیوں اور بے ثباتی کا لگاتا ذکر ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان فانی ہے، زندگی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور دنیا بُری جگہ ہے۔۔۔ لیکن ساتھ ہی ایسی باتوں کے بارے میں بار بار ریمائنڈرز REMINDERS ہر گز نہیں پڑھنا چاہتا۔"

دجلہ کے کنارے شام کو محفلیں جمتیں تو میں ان میں بطور طالبِ علم شریک ہوتا۔

روز اور نمبالکر میرے ساتھ آئے تھے۔ کیمپ میں برٹن سے واقفیت ہوئی۔ پھر منصُور اور جرجیس سے۔

آخر وہ گھڑی آئی جس کا اتنی دیر سے انتظار کیا تھا۔۔۔ ہم بغداد جارہے تھے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب لندن اور پیرس چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے تب خلافت کا یہ مرکز دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

اُس زمانے کا بغداد۔۔۔ پھر الف لیلیٰ کا بغداد۔۔۔ اِس کے بعد ہلاکو کا بغداد، پتہ نہیں اب کیسا ہو گا۔

کھجوروں کے جھُنڈ آئے تہمد پوش حضرات گدھوں پر سوار تھے۔ عورتیں مٹّی کے برتن لیے دجلے کی طرف آرہی تھیں۔ دجلے کا پانی اور بھی گدلا ہوتا گیا۔۔۔ اب بغداد قریب تھا۔

لیکن جب بغداد آیا تو کچھ نہیں ہوا۔ عمارتیں، سبزہ، درخت۔۔۔ ہر جگہ ریت کی

ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اور بغداد کا دجلہ ایسا تھا جیسے چاء بہہ رہی ہو۔

شارع رشید دیکھ کر ہم رسوائے عالم شاعر ابو نواس کی سڑک پر پھرے۔ سند باد ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ بے شمار بغدادیوں کے چہروں یا بازوؤں پر بغدادی ناسور دیکھے اور پھر دجلے کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔

"یہ دریا تو بس ہو نہی سا ہے۔" روز نے بیزاری سے کہا۔

"دن میں اس دریا کو جانچنے کی کوشش کرو گے تو مایوسی ہو گی۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ یہ اس مغرور مگر غمگین بوڑھے کی طرح ہے جس نے کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں اور جو اب گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہو۔ تھوڑا سا انتظار کرو رات ہو لے۔ پھر دیکھنا۔۔۔" جرجیس نے دجلہ کی طرفداری کی۔

"رات کو کیا ہوتا ہے۔" روز نے پوچھا۔

"رات کو بوڑھا خوشبو لگا کر رنگین عبا پہنتا ہے، جو روشنیوں میں جگمگ جگمگ کرتی ہے۔"

دجلے میں طرح طرح کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ گول، لمبوتری، مستطیل نما، نوکدار۔ چند دُخانی کشتیاں اور سٹیمر بھی نظر آ رہے تھے۔

آخر اس سست اور بھورے سے دریا میں ایسی کیا خوبی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ تپتے ہوئے صحرا میں بہتا ہے۔

بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آ گئی۔ صحرا کا دائمی پیاسا اور کھارے پانی کا عادی ایک بدّو بغداد آیا۔ طباخی سے پہلی روٹی لی۔ روٹی کے ٹکڑے کو دجلے کے پانی میں ڈبو کر چکھا۔ ایک روٹی کھائی۔ دریا میں ڈبو ڈبو کر دوسری کھائی۔ پھر تیسری۔ جب آٹھویں پر پہنچا تو دکاندار نے جھنجھلا کر پوچھا۔۔۔ ”آخر کب تک کھاتے رہو گے؟“

”جب تک دجلہ بہتا رہے گا۔“ بدّو نے جواب دیا۔

سائے لمبے ہو گئے۔ سورج چھپ گیا اور بغداد چمکنے لگا۔

دجلے کے کنارے روشن ہو گئے۔ ان کی سطح پر نور کی بارش پڑی تو جیسے آگ سی لگ گئی۔ موسیقی کی دلکش تانیں فضا میں مرتعش ہوئیں۔

قہقہے تھے، گہما گہمی تھی اور متعدد حسین چہرے۔۔۔ راگ رنگ کا طوفان آ گیا۔ دجلے کی سطح پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

جرجیس کی حالت مخدوش تھی۔۔۔ ابھی ساتھ ہے ابھی غائب ہو گیا۔ پھر آ ملا۔

اِدھر جھانک رہاہے، اُدھر تاڑ رہاہے۔

"وہ دیکھو۔۔۔" اس نے اشارہ کیا۔ ہم نے دریچے سے دیکھا۔ اندر رقص ہو رہا تھا۔ ایک طرف منصُور بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک شعلۂ جوالہ جو مچل رہی تھی، شرمارہی تھی، مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔

"منصُور کتنا خوش نصیب ہے۔" روز نے نہایت لمبی آہ بھری۔

"منصُور یہاں رہ چکاہے اور لوگوں کو جانتاہے۔ اگلی مرتبہ میں بھی کسی کے ساتھ ہوں گا اور تم لوگ دُور سے دیکھ دیکھ کر رشک کروگے۔۔۔" جرجیس نے بھی اچھی خاصی طویل آہ بھری۔

کچھ دیر کے بعد ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے کیبرے CABARET دیکھ رہے تھے۔

"ہائے یہ دُھن کیسی اُداس کُن ہے۔" نمبالکر نے بھی آہ بھری۔ جسے دیکھو آہیں بھر رہا تھا۔

"پتہ نہیں اِن ناچنے والیوں کے قدم غلط کیوں پڑ رہے ہیں؟" روز بھی غمگین ہو گیا۔

"مجھے برٹن یاد آرہا ہے۔ اُسے ناحق کیمپ میں چھوڑ آئے۔" جرجیس بڑبڑایا۔

مَیں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔ "لینکی LANKY چپ کیوں ہو؟ تم بھی تو کچھ کہو۔"

"ناحق رنگ میں بھنگ مت ڈالو۔ یہاں سب مُسکرا رہے ہیں اور تم مُنہ لٹکائے بیٹھے ہو۔ نہ موسیقی میں خرابی ہے اور نہ ناچنے والیوں میں۔ اور برٹن کا یہاں نہ ہونا، ہونا، بے معنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔؟"

"جانتے نہیں؟ یہ احساسِ تنہائی ہے۔" جرجیس بولا۔

"لیکن ہم تنہا تو نہیں ہیں۔۔۔ اکٹھے ہیں۔" روز نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ پھر ہم چُپ ہو گئے۔

صبح کو دیکھا تو وہی مٹیالا سا دجلہ تھا اور وہی گرد و غبار میں آٹا ہوا بغداد۔

وہ سارا حسن و جمال کہاں گیا۔ وہ لطافتیں، خوشبوئیں کیا ہوئیں۔ موسیقی کی دِلرُبا تانیں کہاں کھو گئیں؟ رات ہر شے سحر زدہ تھی۔

شاید الف لیلیٰ کے وقتوں کا طلسم اب تک باقی ہے۔

بغداد سے واپسی پر وہ کہہ رہا تھا۔۔ ”بڑے بڑے شہر تو میں نے بھی کئی ملکوں کے دیکھے ہیں لیکن دن اور رات کے سماں میں اتنا نمایاں تضاد کہیں محسوس نہیں کیا جتنا کہ بغداد میں۔۔۔۔

میں ورزش کرتا تو وہ پوچھتے کہ دن بھر کے کام کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بتاتا کہ معمولی روٹین کام سے تھکاوٹ ہوتی ہے لیکن ورزش سے چُستی آتی ہے۔

جرجیس کی طبیعت اچھی نہ ہوتی اور مجھ سے دوائی مانگتا تو میں ورزش تجویز کرتا۔ بیزاری کا علاج ایک ڈیڑھ میل کی دوڑ۔ جس کے بعد بھوک لگے گی۔ نیند آئے گی اور بیزاری یاد تک نہ رہے گی۔ مُوڈ خراب ہو تو ایک سو بیٹھکیں اور ایک میل کی دوڑ۔ جی نہ لگتا ہو تو سو ڈنٹر اور سو بیٹھکیں۔ عشق ہو جائے تو بار بار دوڑ، ڈنٹر اور

بیٹھکیں۔ جب تک کہ افاقہ نہیں ہوتا۔

"بس بس بد مذاقی کی انتہا ہو گی۔ مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں۔۔۔" وہ ناراض ہو کر کہتا۔

جب کبھی کیمپ سے باہر جانے کی ڈیوٹی نکلتی تو میں خاص طور پر میری سفارش کرتا کہ اسے بھیج دو۔ یہ بھاگا دوڑی میں خوش رہتا ہے۔

برٹن اسے سمجھاتا۔۔۔ "جر جیس، خدوخال اور قد تو قدرت تراشتی ہے لیکن جسم انسان خود تراشتا ہے۔ بھدّے جسم کے لیے کوئی قدرت کو ذمّہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ لینکی کو دیکھو، دن بھر کا تھکاہارا شام کو اورنج سکواش پی کر ایسا سوتا ہے کہ صبح کو بگل کی آواز بھی نہیں سُنتا۔"

ایک دن علی الصبح دوڑ لگائی تو منصُور کے ماتحت نے پکڑ لیا۔ مجھے پہچانا تو معافی مانگی اور تنبیہ کی۔۔۔۔ "واللہ یا ابو ریاضت، یہ کیا حرکت ہے؟ اتنے سویرے یا مغرب کے وقت اندھیرے میں اس قسم کی ورزش یہاں مت کیا کریں، ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہو گا کہ کوئی بدّوُ کیمپ میں چوری کرکے سرپٹ بھاگا جارہا ہے۔۔۔"

چوریوں کا ذکر اکثر ہوا کرتا۔ طرح طرح کے قصّے بیان کیے جاتے۔ لوگ

آپ بیتیاں سُناتے "مثلاً انہیں سفید چادروں کا بہت شوق ہے۔ کوئی سو رہا ہو تو چور صبح چار بجے کے لگ بھگ چپکے سے آتا ہے کیونکہ اس وقت نیند گہری ہوتی ہے۔ بستر کا جو حصّہ خالی ہو اس طرف سے چادر آہستہ آہستہ تہہ کی جاتی ہے۔ پھر پَر یا کسی ملائم چیز سے سونے والے کے گُدگُدی کی جاتی ہے۔ جونہی وہ اپنی طرف سے مچھر اُڑا کر کروٹ بدلتا ہے، بقیہ چادر تہہ کر کے اس کے نیچے سے نکال لی جاتی ہے۔ اگلے دن وہ اُٹھ کر ملازم کو ڈانتا ہے کہ رات چادر کیوں نہیں بچھائی تھی۔ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ لیٹے ہوئے انسان کے نیچے سے چادر نکل گئی۔"

کوئی اور بتایا۔۔۔ "پچھلی جنگ میں جب میں یہاں تھا تو عجب تماشہ ہُوا۔ ہر تیسری چوتھی شام کو ایک خچر غائب ہو جاتی۔ پہرہ سخت کر دیا گیا۔ سنتریوں کی تعداد بڑھا دی گئی لیکن پھر چند دنوں کے بعد یہی خوشخبری ملتی کہ ایک خچر کم ہے۔ آخر یہاں کے مخبروں سے رجوع کیا اور انہوں نے چور پکڑوایا۔ معلوم ہوا کہ جب جانور شام کو پانی پی کر واپس آتے تو چور کتّے کی کھال اوڑھ کر ان کے ساتھ ساتھ آ جاتا۔ اندھیرا بڑھنے پر ذرا ذرا سی دیر کے بعد خچروں کو چھیڑتا۔ وہ ہنہنائیں، دولتیاں جھاڑتیں۔ فوراً سپاہی آتا۔ لیکن خچروں کو محفوظ بندھے دیکھ کر واپس چلا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد شور مچتا۔ سنتری پھر بھاگ کر پہنچتا اور خچروں کو صحیح سلامت پا کر لوٹ جاتا۔ یہ عمل اتنی مرتبہ دہرایا جاتا کہ سنتری خچروں کے بلاوجہ شور و

غل سے بالکل بیزار ہو جاتے۔ حتیٰ کہ جب چور سچ مچ ایک خچر کو لے بھاگتا تو سنتری نہ کسی کے ہنہنانے کی پرواہ کرتے۔ ان کی دولتیوں کی۔۔۔ کچھ عرصے کے بعد اس قسم کا واقعہ کسی اور یونٹ میں ہوتا اور کسی اور میں۔۔۔"

پھر ایک طرف سے آواز آتی "ایک مقامی باشندے کو آملیٹ بہت پسند آیا۔ اس نے پکانے کی ترکیب پوچھی تو مَیں نے بتایا کہ پہلے چار انڈے اور تھوڑا سا مکھّن اور نمک مصالحہ چڑاؤ اور پھر انڈوں کو خوب پھینٹ کر چُرائے ہوئے چولھے پر۔۔۔۔"

اور سب ہنسنے لگے۔

برٹن پُرانا جنگجو تھا۔ اس کے آٹھ تمغوں میں چار ایسے تھے جو فقط میدانِ جنگ میں بہادری کے کارناموں پر دیئے جاتے تھے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ آپ نے کیا کیا تھا؟

"کچھ بھی تو نہیں۔ یہ تمغے ان معرکوں کی یادگار ہیں جن میں میرے رفیقوں کو جو مجھ سے کہیں دلیر اور فرض شناس تھے کچھ نہیں ملا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ حقدار تھے۔"

ہمارے دو ساتھی تبادلے پر بھیج دیئے گئے لیکن ان کی جگہ کوئی نہ آیا۔ برٹن سے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے تو کہنے لگا "تعداد زیادہ ہونے سے کارکردگی نہیں بڑھتی۔" کسی بچّے سے پوچھا گیا تھا کہ اگر دو آدمی ایک کام کو دو دن میں کر سکتے ہیں تو چار آدمی اسی کام کو کتنے دنوں میں کریں گے؟" بچّے نے جواب دیا تھا۔۔۔ چار دِنوں میں میرے خیال میں یہ جواب بالکل صحیح ہے۔ جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی زیادہ وقت ضائع کریں گے۔۔۔"

کیمپ کی بے کیف زندگی سے تنگ آ جاتے تو مشورہ دیتا۔۔۔ "اسی ماحول میں خوشیاں تلاش کرو۔ مسرت بھرے لمحے کسی پروگرام کے تحت نہیں ملتے۔ یہ تو اِدھر اُدھر سے چُرانے پڑتے ہیں۔ خوشخبریاں باہر سے نہیں منگوائی جاتیں۔ نہ کبھی خود بخود آتی ہیں۔ یہ تو ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ جمود اور بے کیفی کے تالاب سے کھینچ کر نکالنی پڑتی ہیں۔ جس طرح لڑائی میں اپنی پسند کا میدانِ جنگ، موزوں موسم، مطلوبہ نفری اور سازوسامان ملنے مشکل ہیں۔ اسی طرح مناسب وقت، صحیح

موقع اور ساز گار حالات بھی اکٹھے نہیں ملتے۔ کچھ کرنا چاہو تو مَردوں کی طرح اُٹھو اور مستعدی سے جُٹ جاؤ۔ یہی ایک طریقہ ہے جو کام آسکتا ہے۔۔۔"

پھر کوئی پوچھ بیٹھا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟

"شادی کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ جوانی جہان گردی اور فیلڈ سروس کی نذر ہو گی۔ ادھیڑ عمر کا ہُوا تو پھر خیال چھوڑ دیا۔ دراصل محبت فقط لوگوں کے لیے ہے۔ اس عُمر میں ہر چیز خواہ مخواہ رنگین معلوم ہوتی ہے۔ ہر جذبے میں بے ساختگی ہوتی ہے اور بلا کا خلوص۔ محبوب ایک دفعہ مُسکرا دے تو ہفتے مہینے خوشی خوشی گزر جاتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ امتحان میں ضرور کامیابی ہو گی، مالی حالت بہتر ہو جائے گی، دوست دشمن سب مہربان ہو جائیں گے۔ اور محبوب کی بے رُخی سے سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا۔ آئرلینڈ کی وہ جھلمل جھلمل کرتی ندیاں، وہ لہلہاتے کھیت شاداب کنج، گھنے جنگل مجھے اب تک یاد ہیں۔ اگرچہ اُن لڑکیوں کے نام اور چہرے یاد نہیں جو ان دنوں میرے ساتھ ہوا کرتیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب بادل آئے تھے اور کب بوندیں تھم گئیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد اتنی جلدی چاند کیسے نکل آیا۔۔۔ ذرا دیر پہلے گھپ اندھیرا تھا، دفعتاً یہ روشنی کہاں سے آ گئی۔۔۔ وہ جگمگاتی صبحیں۔۔۔ وہ رنگین شامیں۔۔۔ وہ مستی کے شب و روز۔۔۔

محبّت کی اصلی عُمر وہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بس دکھاوا ہے۔ اگرچہ میں شادی کے قضیے سے بالکل مُبرّا ہوں اور تم لڑکوں کو بھی مشورہ دوں گا کہ اپنی کمر پر زین مت کسوانا لیکن اگر خدانخواستہ کبھی پھنسنے لگو تو جذبات کے دھارے میں مت بہہ جانا۔ ایسا چہرہ چُننا جس کی کشش اور دِلبرُبائی دیرپا ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ گزرتے ہوئے ایّام چہروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور محض دس پندرہ سال کا وقفہ چہروں میں کیسی کیسی تبدیلیاں لا سکتا ہے۔"

ہم نے روز کو اشارہ کیا کہ یہی موقع ہے پوچھ لو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بغداد کا ذکر کیا۔ برٹن ترنگ میں تھا۔ کہنے لگا۔۔ "میں ڈیوٹی کے سلسلے میں سختی برتتا ہوں، لیکن تفریح کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ کیونکہ تفریح بھی اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ کام۔ سنیچر کی شام کو جو لڑکا بغداد جانا چاہے بخوشی جا سکتا ہے، لیکن محتاط رہنا۔ ان شہروں میں آئے دن فساد ہوتے رہتے ہیں۔ میں جنگ سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ دنگے فساد سے۔ لڑائی میں دشمن کی تمیز کی جا سکتی ہے لیکن جب کوئی ہجوم مُشتعل ہو جائے تو دوست دُشمن کا پتہ نہیں چلتا۔ اور کچھ اس قسم کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں۔۔۔ 'جنوبی ملایا میں فساد، چار تماشائی جو اطالوی تھے ہلاک ہو گئے۔ جنوبی افریقہ میں ہنگامے، تین فرانسیسی راہگیروں کی حالت نازک ہے؛ اور یہ حقیقت ہے کہ میکسیکو میں دو سیاست دان ڈوئل لڑے۔ دونوں کو خراش تک نہ

آئی مگر آٹھ تماشائیوں کا مکمل انتقال ہو گیا۔ بطور تماشائی مرنا بے حد ہو نّق موت ہے۔"

ہم بغداد جانے لگے۔ سنیچر کی شام کو بغداد پہنچ کر خوش ہوتے اور اتوار کی شام کو دل میں کیمپ آ کر بھی اتنی ہی خوشی ہوتی کیونکہ شہر میں دکاندار اور چور ہماری جیبیں خالی کر دیتے۔ برٹن اپنے رشتہ داروں کے ذکر سے ہمیشہ گریز کرتا۔ اُدھر جرجیس کا محبوب موضوع ہی یہی تھا۔۔۔ دوسروں کے تائیوں، چچوں، داداوں، بھائی، بھتیجوں کے متعلق پوچھتا اور اپنے عزیزوں کے بارے میں بتاتا۔ اسے سمجھایا بھی کہ انگریز ایسی باتوں میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ پھر بھی برٹن سے پُوچھ بیٹھا۔۔۔ "آپ کے کتنے بھائی ہیں؟"

"ایک ہے۔۔۔ لیزلی! بڑا شیطان ہے۔ ہم دونوں گہرے دوست بھی ہیں۔ ۳۳ء میں وہ لندن میں تھا۔ پھر آوارہ گرد ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا رہتا ہے۔"

"تو گویا آپ اور وہ دس سال نہیں ملے؟" جرجیس نے پوچھا۔

"دراصل ہم ۲۲ء میں ملے تھے۔ پھر گیارہ برس کے بعد میں ایشیا کے علاقوں میں سروس کر کے چھُٹی پر گیا۔ لندن میں کسی نے بتایا کہ لیزلی بھی وہیں ہے۔ بڑی

مشکل سے اس کے کلب کی معرفت کھوج نکال کر اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ آواز دی 'لیزلی! لیزلی!۔۔۔'۔ 'کون ہے؟' وہ اندر سے چلّایا۔۔۔ 'میں ہوں ایرک۔' میں نے جواب دیا'ہیلو ایرک۔ دنیا کا کیا حال ہے؟''اچھا ہے! کوئی تازہ خبر سُناؤ۔"

"یوس ٹیس کا انتقال ہو گیا ایرک۔۔۔"

"کیسے ہوا لیزلی؟"

"بس ایک دن سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ دھڑام سے گرا اور مر گیا۔ تمہیں تعجّب ہوا ایرک؟"

"بالکل نہیں! اس کے حجم اور وزن میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جب وہ اسکندریہ میں ملا تو میں نے بتا دیا تھا کہ اولڈ بوائے تم ڈھیلے ہوتے جا رہے ہو۔ تمہارا وقت اب دُور نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے دوست نے یہ چار سال کیونکر نکال لیے۔ اور لیزلی تم باہر نکلو نا۔"

"ایرک مجھے کچھ دیر لگے گی۔ باتھ روم میں حجامت کر رہا ہوں۔ انتظار کرو۔"

"میں انتظار نہیں کر سکتا۔ آدھ گھنٹے میں مجھے پکاڈلی سرکس پہنچنا ہے۔۔۔۔"

"تو پھر ایرک تم فوراً سولہ نمبر بس پکڑ لو ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔ پھر کبھی ملیں گے۔"

"گڈ بائی، چیئرز لیزلی۔"

اگلے روز اسے فون کیا تو وہ کہیں باہر جا رہا تھا۔ جب اُس نے جواباً فون کیا تو میں ہوٹل میں نہیں تھا۔ پھر میں نے فون کیا تو اس نے پوچھا "گھڑ دوڑ پر جا رہا ہوں۔ چلو گے؟" میں چند ہفتے پہلے گھوڑوں پر سات سو پونڈ ہار چکا تھا اس لیے گھڑ دوڑ سے کتراتا تھا۔ اس کا فون آیا تو میں نے اسے چڑیا گھر کی سیر کے لیے مدعو کیا لیکن اسے جانور اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ وہ نہ آیا۔ اگلے ہفتے وہ سمندر کے ساحل پر چلا گیا۔ میں بھی مصروف رہا۔ اتنے میں چھٹّی ختم ہو گئی اور واپس آ گیا۔ لیزلی سے ملاقات ہو جاتی تو اسے آئرلینڈ چلنے کے لیے مجبور کرتا۔ دونوں گھر ہو آتے اور یہ بھی دیکھ آتے کہ اولڈ بوائے کا موڈ کیسا ہے۔ "اولڈ بوائے بھی اب نوّے پچانوے کا ہو گا۔ اس سے پہلی جنگ کے خاتمے پر ۱۹ء میں اتفاق سے ملاقات ہو گئی تھی۔"

"اور پوچھو انگریزوں سے ایسے سوالات۔۔۔" منصُور نے سرگوشیوں میں جرجیس کو ڈانٹا۔

مومن نمبا لکر مرہٹا تھا۔ سانولا رنگ، پستہ قد، گٹھا ہوا جسم۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔ دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔ اس کا خیمہ بالکل قریب تھا۔ علی الصبح اس کا گانا سنائی دیتا۔

ہولے ہولے۔۔۔ "تم جاگو موہن پیارے" والا گیت گاتا۔ جیسے اپنے آپ کو جگا رہا ہو۔ پھر اُٹھ کر دجلے کے کنارے سے طلوعِ آفتاب دیکھتا۔

صبح کے وقت اکثر اس کے خیمے سے جوگیا، بھیرویں اور آساوری کی تانیں سُنائی دیتیں۔ کبھی اُداس لَے میں۔۔۔ "کر لے اُس دن کی تدبیر جب ترا آوے گا پروانہ"۔۔۔ گاتا تو کبھی لہک لہک کر۔۔۔

جامِ گدائی ہاتھ میں لے نِت سانجھ سویرے پھرتے ہیں

شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حُسن کے تیرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئی پر

دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

اور آخر میں۔۔۔ جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک اِن زلفوں کی

گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

میں ورزش ختم کرتا تو دریا کے کنارے ملاقات ہوتی۔

"خان صاحب کیسی سُہانی صبح ہے۔ دریا میں جیسے سونا بہہ رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مغربی کنارے پر ہیں، ورنہ طلوعِ آفتاب کا یہ نظارہ نہ دیکھ سکتے۔"

اُدھر برٹن روز وغیرہ سب غروبِ آفتاب پر فدا تھے جس کے لیے ریت کے ٹیلوں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔

"سورج کا ڈوبنا اُداس کُن نظارہ ہے۔" وہ بتاتا "لیکن طلوعِ تخلیق کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اگر انسان صُبح صُبح مسرور ہو تو سارا دن اچھی طرح گزرتا ہے۔ میں نے آج تک کبھی شام کا انتظار نہیں کیا۔"

محنت مشقت کے علاوہ اسے فقط دو چیزوں کا شوق تھا۔ موسیقی اور کبھی کبھی ذراسی وہسکی۔

"جوگیا نری عبادت ہے خان صاحب۔ انسان پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی تہہ ماپ سکتا ہے مگر راگ درباری کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جس شام کو وہسکی نہ ملے ایمن سے نشہ پورا ہو جاتا ہے۔ دوسری ملہاروں اور میاں کی ملہار میں آپ نے فرق محسوس کیا؟ اُستاد تان سین نے ذراسی ترمیم و اضافے سے کیا سماں باندھ دیا۔ اسے سُنتے وقت بارش کی پھواروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بھیگے بھیگے خُنک جھونکوں کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ اور انسان کتنا ہی اداس ہو، آساوری کی اُمّید افزا تانیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں۔ میں نے زندگی کے پہلے اٹھائیس برسوں میں نہ کبھی غم لگایا نہ کوئی نشہ کیا۔ پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ شمشان میں انہیں جلانے کے فرائض بطور بڑے بیٹے کے مجھ کو سر انجام دینے پڑے۔ اس دن جو کچھ مجھ پر بیتی بیان نہیں کر سکتا۔ شام کو میں نے پہلی مرتبہ پی۔ اس واقعے کو دس سال گزر چکے ہیں لیکن اس دن اور اس کریہہ منظر کا ایک ایک منٹ مجھے یاد ہے۔ خان صاحب میں نے عجیب عجیب محفلوں میں پی ہے۔ لُچّوں، شُہدوں، لفنگوں کے ساتھ، جہاں گلاسوں کی جگہ بوتلوں سے حساب ہوتا تھا۔ بات بات پر چاقو نکل آتے تھے (اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا سا نشان تھا)۔ یہ زخم

ان خرمستیاں کی یادگار ہے۔ پھر جب مہاراجے کی ملازمت میں تھا تو بارہا پری جمالوں کے جھُرمٹ میں راجہ اِندر کی طرح پی۔ ایک ایک حسین ایسی تھی کہ اس کے لیے عُمر گنوادی جائے اور ذرا افسوس نہ ہو۔ کچھ شراب کا نشہ بھی، کچھ ان متوالی آنکھوں کا خمار۔ کیا کیا کیفیّتیں طاری ہوتی تھیں۔ اب یوں لگتا ہے جیسے بس ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ پھر کبھی کبھی ایسے منحوس مطلب پرستوں، خبیثوں کا بھی ساتھ دینا پڑا۔ گھنٹوں کی بادہ نوشی کے بعد بجائے سرور کے افسردگی ملی اور توبہ کرنے کو جی چاہا۔۔ شدید صدمے کو برداشت کرنے کے لیے پی اور ہمیشہ صدمے کو شدید تر محسوس کیا۔۔ شرط لگا کر پی۔ بلانوشوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے فائدے بہت کم ہیں اور نقصان کہیں زیادہ۔۔۔"

اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ بیوی ہمیشہ لکھ پتی باپ کے پاس رہی۔ کبھی کبھار اس سے ملتی تو غربت کے طعنے دیتی۔ لڑنے کے بہانے تلاش کرتی۔ سُسرال والے حقارت آمیز سلوک کرتے۔

یہ کہانی اور اپنی زندگی کے دوسرے المناک واقعات دوہرا کر وہ پوچھتا۔ "دنیا میں کسی چیز کو بھی تو ثبات نہیں۔ دوست بنانے میں کتنی لگتی ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر پرانی دوستی یوں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بتایئے کیا ہمیشہ ڈر ڈر کیوں رہنا پڑتا

ہے؟ کوئی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو آج رفیق بنا ہوا ہے، اس کے دل میں کل بھی اتنی ہی محبّت ہو گئی۔۔۔ ذرا سی جدائی، معمولی سی غلطی تخیّل کی غلط پرواز، شب و روز کی یکسانیت، کسی تیسرے کی آمد۔۔۔ بعض اوقات تو کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی اور آناًفاناً سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کیا تماشا ہے؟

میں خاموش رہتا۔ پھر وہ پوچھتا۔۔۔ "اور یہ بتایئے کہ مجھ سا جذباتی اور حسّاس ہر وقت فکر مند کیوں رہتا ہے؟ وسوسے آتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہتیرا سمجھتا ہوں کہ بعض شبہات ہیں، غلط ہوں گے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سوچ سوچ کر بُرا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے خوش فکروں پر رشک آتا ہے جو کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں۔۔۔۔"

مَیں تسلّی دیتا کہ اگر انسان فکر نہ کرے تو زندگی کے کام کیونکر ہوں؟ موجود اور آئندہ مسائل سے کس طرح نمٹا جائے؟

لیکن وہ سر ہلا کر کہتا۔۔۔ "مگر بے فکروں کے کام کس طرح ٹھیک ہو جاتے ہیں؟ نہیں۔ غالباً یہ طفل تسلّیاں ہیں۔ فرضی اور اصلی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے مَیں نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ قدیم ہندی مفکّروں کا سہارا لینے کی کوشش بھی کی۔ جن کی تلقین تھی کہ انسان کی روح کا مقام بہت اُونچا ہے اور دنیاوی

خرافات بالکل نیچے ہیں اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ یہ بار بار دوہرا کر اپنے آپ کو حوصلہ دلانے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار نتیجہ یہی نکلا کہ روح بالکل نیچے دنیاوی خرافات ہمیشہ بلند تھے۔۔۔"

پھر کسی دن کہتا۔۔۔ "زلزلوں، دریاؤں اور جنگوں سے انسان کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ چالبازوں، جھوٹوں اور مکّاروں سے۔ اور اس قسم کے لوگ دُنیا میں اتنے کامیاب رہتے ہیں۔ ہر فریب، ہر جُرم، ہر منافقت ان کے لیے جائز ہے۔ نہ ان کا ضمیر ہے۔ نہ ان پر جزا و سزا کا اطلاق ہے۔ دنیا میں نہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔۔۔۔"

"اگلی دنیا بھی تو ہے۔۔۔۔" میں ٹوکتا۔

"خان صاحب کیا پتہ کہ یہ لوگ وہاں بھی اِدھر اُدھر مِل ملا کر اپنا اُلّو سیدھا نہیں کر لیں گے۔۔۔۔۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ جبکہ بارش نیک اور بد دونوں پر پڑتی ہے اور سورج کی شعاعیں بھی دونوں کے لیے ہیں۔ اسی طرح قدرت کی نعمتیں اور حادثے سب

کے لیے یکساں ہیں۔"

میں خاموش ہو جاتا۔

وہ شکایت کرتا۔۔۔"آپ جان بوجھ کر ٹال جاتے ہیں۔"

اس کا رنگ سانولا تھا لیکن جب انگریزوں اور کالوں پر بحث ہوتی تو وہ غیر جانبدار رہتا اور کہتا کہ "انسانوں کے یہ دونوں رنگ ہارمونیم اور پیانو کے سفید اور سیاہ پردوں کی طرح ہیں۔ جب تک دونوں میں ہم آہنگی نہ ہو، نغمہ پیدا نہیں ہوتا۔۔۔"

برٹن اس سے ہندوستانی موسیقی کا ذکر اکثر کیا کرتا۔ دیوتاؤں کے سامنے رقص موسیقی اور پھولوں کی پیش کش سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا دونوں پارٹیوں کے لیے کافی خوشگوار ہوتا ہو گا۔۔۔"یعنی عقیدت مندوں کے لیے بھی۔ اور اگر دیوتا واقعی کہیں ہیں تو وہ بھی اس راگ رنگ سے محظوظ ہوں گے۔۔۔" کیمپ میں ایک لٹکتی ہوئی مونچھوں اور فرنچ کٹ داڑھی والا ہیبت ناک شخص بھی تھا جو جزیرہ مالٹا کا باشندہ تھا اور جس کے بے سُرے گانوں سے سب نالاں تھے لیکن موہن اسے بھی ناپسند نہیں کرتا تھا۔

"یہ بُرا آدمی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے گانے کا شوق ہے۔"

حالانکہ وہ مغرب سے رات کے گیارہ بارہ بجے تک بڑی بھیانک آواز میں ایسے کرخت اور ہونّق نغمے بلند کرتا کہ صورِ اسرافیل کا گمان بلکہ یقین ہو جاتا۔

آخر تنگ آ کر منصُور نے MESS میں سب کے سامنے اسے بتایا کہ "حکیم رازی کو اوائل عمر میں بانسری بجانے اور گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب پختگی آئی تو گانا بجانا یک لخت ترک کر دیا اور فرمایا کہ جو نغمہ داڑھی اور مونچھوں کے درمیان سے نکلے اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہتی۔"

منصُور کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی اور اس شخص کی اَلل ٹپ نغمہ سرائی کم ہوتی گئی۔

جرجیس کا عیسائی نام جارجز تھا اور وطن آرمینیا۔ موٹا تازہ آرام طب نوجوان تھا۔ پتہ نہیں نوکری کیوں کر رہا تھا کیونکہ کام سے اسے بے حد نفرت تھی اور قواعد و ضوابط سے سخت چِڑ۔ پیدل چلنے سے خاص طور پر گریز کرتا۔ کہیں چلنا پھرنا پڑ جاتا

تو۔۔۔ ”میں فوجی نہیں ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہو“ کہہ کر بیماری کے بہانے خیمے میں لیٹ جاتا۔

وہ ہر روز تقریباً دس بجے نہا دھو کر تیار ہوتا اور نعرہ لگاتا۔۔۔ ”اب جرجیس ہر چیز کے لیے تیار ہے۔ سوائے کام کے۔۔۔“ چونکہ ہم اس وقت کام سے فارغ ہو کر واپس خیموں کی طرف آ رہے ہوتے، لہٰذا وہ ہمارے ساتھ لوٹ آتا۔ لیکن دائمی کاہلی کے باوجود جرجیس نہایت شدید قسم کا عاشق تھا اور تقریباً ڈھائی یا پونے تین عاشقوں کے برابر تھا۔ کسی لڑکی کو مغموم دیکھ کر اس سے رہا نہیں جاتا تھا۔ دراصل جو لڑکی مغموم نہ بھی ہو اسے دیکھ کر بھی بے قابو ہو جاتا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ دنیا کی حسین ترین لڑکی پر عاشق رہتا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی لڑکی کا نام امالیا ہوتا، کبھی الزبتھ، تو کبھی لوریتا۔

ساتھ ساتھ یہ گلہ بھی رہتا کہ اسے اتنی توجّہ نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے۔

”آج ڈونا روزا نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہنریٹا نے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ باتیں تو ہوئیں لیکن پھیکی پھیکی سی۔ حالانکہ اسی لڑکی نے پچھلے مہینے میرا دل اور کیمرا اچُرا لیا تھا۔ اور تو اور وہ بے وقوف ڈورو تھی بھی خواہ مخواہ رُوٹھی ہوئی ہے۔ ہائے ہمیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا۔۔۔“

”اور تم نے زندگی کو کیا دیا ہے؟“ روز پوچھتا۔۔۔

”دراصل تم ان لوگوں میں سے ہو جو ہر ایک سے ہر وقت ہر قسم کی توجّہ کے طالب رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خوفناک وبا بچ جانے پر جنہیں خوشی کی جگہ افسوس ہوتا ہے کہ وبا نے پوری توجّہ نہیں دی بلکہ جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔۔۔۔“

ویسے روز اور جرجیس میں اکثر ٹھنی رہتی۔ جرجیس جانتے ہو کہ ”کائنات میں تقریباً دس کروڑ جھرمٹ ہیں۔ ہر جھرمٹ میں دس لاکھ کے قریب نظامِ شمسی ہیں۔ ہر نظامِ شمسی میں کئی کئی سیّارے ہیں جن میں سے کچھ آباد بھی ہوں گے۔ اِدھر تم ہو کہ سورج والے نظام ہی کے ایک چھوٹے سے سیّارے کے ننّھے سے مُلک میں بالکل ذرا ذرا سی باتوں میں غلطاں رہتے ہو۔۔۔۔“

”جو چیزیں دوربینوں سے بھی دکھائی نہ دیتی ہوں ان پر میرا اعتقاد نہیں۔ دنیا کا جو چھوٹا سا حصّہ نظر آتا ہے اسی پر قانع ہوں۔ خصوصاً بغداد پر۔۔۔یہودنوں والے پُل پر۔۔۔اور یہودنوں کے جھُرمٹ پر۔۔۔“

یہ دونوں یہودنوں والا پُل بڑی پُرکشش جگہ تھی۔ شام ہونے سے پہلے ہی گہما گہمی

شروع ہو جاتی۔ دریا کے دونوں کناروں سے ساری رونق سمٹ کر اس پل پر آ جاتی۔

چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے معطّر رنگین رومال گرا دیا کہ کون اُٹھا کر واپس کرے تو تعارف ہو اور آیندہ ملاقات کا بہانہ ملے۔ کلائی پر گھڑی باندھ رکھی ہے پھر بھی پوچھ رہی ہے کہ کیا بجا ہے۔ سُرخ ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر ماچس مانگنا۔ ”اوئی!“ کہہ کر کسی فرضی کیڑے مکوڑے سے ڈر جانا تا کہ کوئی ڈرنے کی وجہ دریافت کرے۔۔۔۔ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں حربے۔ سیاہ زلفیں، زیتونی رنگ، بھرے بھرے لال ہونٹ، چُست لباس اور بڑی بڑی آنکھیں، جرجیس بار بار کہتا۔۔ ”یہ یہودی تو کچھ بھی نہیں۔۔ مگر یہودنیں (چُٹکی بجا کر) واللہ!“ اس کے باوجود یہ یہودنیں جرجیس کے لیے سرکس کے جانوروں کی طرح تھیں۔ وہ انہیں بڑے انہماک سے دیکھتا اور بار بار ملنا چاہتا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

روز جرجیس سے پوچھتا۔ ”تم شادی سے کیوں بھاگتے ہو؟“

”میرے خیال میں شادی فقط شادی شدہ لوگوں کے لیے مفید ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

”یعنی تم عورت کی مستقل رفاقت سے ڈرتے ہو؟“

”عورت کی رفاقت میں تو کوئی ہرج نہیں لیکن شادی کے بعد جو باقی ماندہ اتنی ساری عورتوں سے مجبوراً دُور رہنا پڑتا ہے، یہ بہت مُشکل ہے۔ یہ کیمپ تو اتنا بُرا نہیں۔ اس سے پہلے میں جہاں تھا وہاں اتنی تنہائی تھی کہ شادی کرتے کرتے بال بال بچا۔۔۔۔“

اس کا عقیدہ تھا کہ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرا دو کہ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے بعد وہ تمہارے بقیہ جھوٹ بھی سچ مان لے گی۔

لیکن ہم اسے اکثر ٹوکتے کہ وہ لڑکیوں سے ملتے ہی انہیں خفا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی تکنیک میں ضرور کوئی خرابی ہو گی۔

”یہ تو دل کے معاملے ہیں۔ جو سوجھتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ قوانین وضوابط سے مجھے سدا کی چِڑ ہے۔“ وہ کہتا۔ جرجیس کی تکنیک (اگر اسے تکنیک کہا جا سکتا تھا) کچھ اس طرح کی تھی۔۔۔

کوئی لڑکی کہتی۔ ”آج میری سالگرہ ہے۔“

”مبارک ہو! یہ بھی سچ سچ بتایئے کہ آج آپ کتنے سال کی نہیں ہوئیں۔“

وہ چِڑ جاتی۔

اس پر جرجیس سرگوشیوں میں پوچھتا۔ ”جانتی ہو دنیا کی سب سے حسین لڑکی کون ہے؟“

”کون ہے؟“ وہ خوش ہو جاتی۔

”گریٹا گاربو۔“

لڑکی پھر خفا ہو جاتی۔

جرجیس پھر ہانکنے لگتا۔ ”کل سوزی تمہارے مُٹاپے پر فقرے کس رہی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ تم موٹی بالکل نہیں۔ فقط تمہارا وزن تمہارے قد سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بھلا اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟“ اسی پر وہ آگ بگولا ہو جاتی۔ ”بڑے بدتمیز ہو۔ تمہارے متعلّق میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم اوّل نمبر کے جھوٹے، لفنگے اور ہرجائی ہو۔“

”اچھی طرح سوچ لو! اب تم مجھے ترغیب دے رہی ہو۔“

ظاہر ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا۔ لیکن جرجیس کا

جوش و خروش کبھی کم نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو وہ ایک پختہ عُمر کی خاتون کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے فوراً دھمکایا۔۔۔ "جانتے ہو مَیں تمہارے دوست کی چچی ہوں؟"

"لیکن چچی جان آپ کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے۔ اور آپ کی چال خوب ہے۔"

"تمہیں میرا تعاقب کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

"اپنے دوستوں کے ہمراہ بابل، طاقِ کسریٰ اور دیگر آثارِ قدیمہ دیکھنے یہاں آیا تھا۔ سوچا کہ آپ کا دیدار بھی کرلوں۔"

"خبردار! آئندہ مجھ سے دور رہنا۔ تمہارے اور میرے خیالات بالکل مختلف ہیں۔"

"واقعی مختلف ہیں۔۔۔ آپ کو شاید لڑکوں میں دلچسپی نہ ہو لیکن اس خاکسار کو لڑکیاں بہت پسند ہیں۔۔۔"

جرجیس کی جیب اکثر خالی رہتی۔ ایک شام کو دیکھا کہ شارعِ رشید کے ایک مہنگے سے ریستوران میں وہ اور ایک لڑکی ڈنر کھانے کے لیے تیّار بیٹھے ہیں۔ اس پر ہمیں

حیرت ہوئی کیونکہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ تماشہ دیکھنے کے لیے ہم ایک ستون کی آڑ لے کر قریب ہی جا بیٹھے۔

جر جیس کہہ رہا تھا۔۔۔۔ ”اب جبکہ مجھے یقین ہو گیا ہے تم مجھے پسند کرتی ہو میں یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ تم خاصی حسین ہو۔ اپنی زندگی کی داستان سناؤ۔ اور ضرور سناؤ۔ لیکن مختصراً۔ شروع شروع کے بارہ تیرہ سال اس میں بے شک شامل نہ کرنا کیونکہ تب تم بہت چھوٹی سی تھیں۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ بتا سکتی ہو۔۔۔“

اتنے میں ویٹر آ گیا۔ لڑکی نے ضرور مہنگے کھانے چُنے ہوں گے کیونکہ جر جیس کاغذ پنسل لیے حساب لگا رہا تھا اور اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ جب ویٹر نے اس کی فرمائش دریافت کی تو آہ بھر کر بولا ”خاتون کا ڈنر لے آؤ میں کچھ نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں عشق میں مبتلا ہوں۔ اور عاشق کو کبھی بھوک نہیں لگتی۔“

جب کام کے اوقات ختم ہوتے اُونگھتا ہوا جر جیس یکلخت چُست ہو جاتا۔

خیمے میں داخل ہوتا تو جیسے زلزلہ آ جاتا۔۔۔۔

”چپ کیوں ہو؟ گراموفون بجاؤ۔ ریڈیو لگاؤ۔ شور مچاؤ اور نہیں تو تاش ہی کھیلو۔

یارو کچھ تو کرو! توبہ توبہ کیسے سُست الوجود دوستوں سے واسطہ پڑا ہے۔ زندگی تباہ ہو گئی ہے۔" روز پوچھتا۔۔۔ "جرجیس! ہر ملک میں عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں لیکن آرمینیا میں کبھی کوئی ایسی ہستی وجود میں نہیں آئی؟"

"اغیار ہمیں شہرت نہیں پانے دیتے۔ ویسے بھی عظمت بڑھاپے سے پہلے نہیں ملتی اور جرجیس ابھی نو عُمر ہے۔ دیکھ لینا دوست کسی نہ کسی دن میرا نصیب ضرور جاگے گا۔ حالات خود بخود سازگار ہوتے چلے جائیں گے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہو گی۔ یکے بعد دیگرے خوشخبریاں ملیں گی۔ اور تو اور میری جیبیں بھری رہا کریں گی اور ہر شام کو بغداد جا سکوں گا۔ دوسروں سے قرض مانگنے کی بجائے انہیں خوب اُدھار دیا کروں گا۔ سب مجھ سے متاثر ہوں گے اور میری قابلیتوں کا اعتراف کیا کریں گے۔" لیکن روز اسے بتاتا۔ "تمہاری حرکتوں اور تمہارے نظریوں سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ زبوں حال رہو گے۔ اگر ہماری مالی یا ذہنی حالت سُدھر جائے تو میرا نام بدل دینا۔ اب تک جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس پر لعنت بھیجوں گا۔"

ایک شام کو برٹن نے بھی اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا تم ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہو۔ دنیا میں اور کام بھی تو ہیں۔"

”جناب لڑکیوں کا تعاقب نہ کیا جائے تو ان سے ملاقات کیسے ہو؟ اور جو ملا نہ جائے تو ان سے محبّت کیونکر ہو۔ محبّت نہ کی جائے تو ناکامی کیسے ہو؟ اور محبّت میں ناکامی کے بغیر غم غلط کرنے کے موقعے کس طرح مل سکیں؟“ جرجیس نے جام خالی کرتے ہوئے بڑے ادب سے جواب دیا۔ اسے دوستوں کی خوشنودی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اکثر کہا کرتا کہ میں دوستوں کو ہمیشہ خوشخبری سنانے کا منتظر رہتا ہوں۔ بُری خبر ہی نہیں سُناتا۔ ایسی ویسی خبر تو انہیں کسی اور سے بھی مِل جائے گی لیکن کم از کم جرجیس تو ایسی خبر کا جزو نہیں بنے گا۔ ایک مہینے کی آخری تاریخ کو (شاید مفلسی سے مجبور ہو کر) اُس نے برٹن سے کہا ”جناب آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میں نے لڑکیوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔“ برٹن خوش ہونے کی تیّاری کرنے لگا تھا کہ روز جلدی سے بولا ”اب جرجیس ہر قوت عورتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اس کی دائمی بے چینی اور تفکّرات کی فقط تین وجوہات ہیں۔۔۔ لڑکیاں، عورتیں اور حوامین۔“

روز پکا ریاضی دان تھا۔ بات بات پر سوال نکالنے بیٹھ جاتا۔

بغداد جانے سے پہلے یہ پوچھتا کہ بِل ادا کرنے کا کام کس کے سپرد کیا جائے۔ پھر سب سے برابر برابر چندہ لے کر اس کے حوالے کرتا۔

”جب وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ دیکھیں گے تو ہم سب کو امیر سمجھیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اپنی اپنی جیب کی حفاظت نہیں کرنی پڑے گی۔“

وہ بالکل گنجا تھا۔ اپنی مدافعت میں طرح طرح کی مثالیں پیش کرتا۔۔۔ ”چارلس دوئم گنجا تھا۔ موسمِ گرما میں سر کے مصنوعی بال اُتار کر ٹہل رہا تھا کہ اتفاق سے ملکہ نے دیکھ لیا۔ اسے اس حالت میں پہلی مرتبہ دیکھ کر ملکہ نے چیخ ماری۔ بادشاہ بڑے پیار سے بولا۔ ’جانِ من آج گرمی اتنی زیادہ ہے کہ مجبوراً بال اتارنے پڑے۔‘ فرانس کے لوئی چہارزدہم نے عمر بھر اپنے گنجے پن کو کامیابی سے چھپائے رکھا۔ ملکہ الزبتھ گنجی ہوئی تو محل اور دربار کے سارے آئینے تڑوا دیئے۔ سکاٹ لینڈ کی حسین ملکہ میری اور فرانس کی مشہور میری انتوئنے قطعاً گنجی تھیں۔ لیکن یہ راز ان کی موت کے بعد افشا ہوا۔۔۔ میں تو ایک معمولی سا سپاہی ہوں۔ بادشاہوں والی حرکتیں تو کر نہیں سکتا۔ گنجا ہوں تو بس گنجا ہوں۔ چھُپاتا تو نہیں۔۔۔“

اس کی سالگرہ کی پارٹیاں مشہور تھیں۔ کوئی لڑکی کلب سے جلد گھر جانا چاہتی تو روز فوراً اعلان کر دیتا کہ آج تو اس کی سالگرہ ہے۔ اس لیے کسی کے جلد گھر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بار بار بلانے پڑ بھی نہ آتی تو پیغام بھیجتا۔۔ ”آج انگلستان میں عزیز و اقارب میری سالگرہ منا رہے ہوں گے۔ میں یہاں بے یارومددگار ہوں۔ کم از کم آج تو مایوس نہ کیجیے۔“

غرضیکہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہ مبارک دن آجاتا۔

لڑکیوں کو مدعو کرتے ہوئے بھی وہ ریاضی کے فارمولے استعمال کرتا۔۔۔

”پیر کو میرے سات چاء پیجئے۔۔۔“

”نہیں، میں پیر کو نہیں آسکتی۔ اُس دن میری دادی جان آرہی ہیں۔“

اگلے روز ٹیلیفون کرتا ”اچھا تو پھر بدھ کی شام کو رقص کے لیے چلیں؟“

”نہیں! بدھ کو نانا جان آرہے ہیں۔“

”تو پھر جمعرات کوئی ٹِل پر انتظار کروں؟“

آخر تین چار مرتبہ انکار کر کے وہ سنیچر یا اتوار کے لیے مان جاتی۔

روز بڑی سنجیدگی سے ہمیں سمجھاتا کہ ”لڑکی کے چند انکار ہر مرتبہ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اسے مجبوراً یا لحاضاً ہاں کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی سنیچر اتوار کے پروگرام کے موافق آتے ہیں اس لیے پیر کے دن سے پوچھنا شروع کر دیتا ہوں۔“

وہ حساب لگا کر بتاتا کہ ”دجلہ جن پہاڑوں سے نکلتا ہے ان کی بلندی فرات والے پہاڑوں سے کم ہے۔ لہٰذا ان کی برف پہلے پگھلتی ہے۔ تبھی پہلے دجلے میں سیلاب آتا ہے، پھر فرات ہیں۔ اور یہ کہ فرات کی سطح مقابلتاً اُونچی ہے۔ اس لیے فرات سے نہریں دجلے میں گرتی ہیں اور راستے میں آب پاشی کرتے ہیں۔ اور یہ کہ دونوں دریا سال میں پینتالیس لاکھ ٹن مٹی بہا کر لاتے ہیں۔“

”اور جو پینتالیس لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک ٹن یا چوالیس لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے ٹن مٹی لاتے ہوں۔ پھر؟“ جر جیس ٹوکتا۔

کوئی کسی ناخوشگوار واقعے سے افسردہ ہو جاتا یا غم لگا لیتا تو روز اپنے فارمولے کے حوالے سے سمجھاتا۔

”ایسا واقعہ چار پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن تک بھُلا دینا چاہیے۔ رہ گیا یہ فکر

کہ لوگ کیا کہیں گے؟ سو لوگوں کو ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس معاملے میں پبلک کا حافظہ بیحد کمزور ہے۔ لہٰذا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے آپ سے سیدھا سا سوال پوچھنا چاہیے کہ آیا آج سے چھ مہینوں کے بعد مجھے یہ واقعہ سچ مچ یاد رہے گا اور اگر یاد رہا بھی تو میری نظروں میں تب اس کی اہمیت کیا ہو گی؟"

منصُور سب ہیں کم گو تھا۔ بالکل الگ تھلگ رہتا۔ بغداد اکیلا جاتا اور ہر مرتبہ وہاں اس کے ساتھ کوئی نئی حسینہ ہوتی۔ لیکن محفلوں میں کبھی لڑکی کا ذکر اس کے ہونٹوں پر نہیں آیا۔

اس کی باتوں سے ہم فقط اتنا اندازہ لگا سکے کہ ایک تو اسے میدانوں کے باشندے اچھے نہیں لگتے اور اسے اپنے وطن کی پہاڑیاں نہایت عزیز ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اسے گھوڑے کی سواری اور شکار کا بہت شوق ہے۔

"سب سے دلکش اور روح پرور دہ ہوا ہے جو گھوڑے کے کانوں کے درمیان سے

گزر کر آتی ہے۔" وہ کہا کرتا۔ اسے اپنے گھوڑے سے اتنی محبت تھی کہ کیمپ کی لا تعداد موٹروں لاریوں کے باوجود اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ اس کا ذکر اسی طرح کرتا جیسے کسی دوست کی باتیں سنا رہا ہو۔ "اگر اس کے قصور پر سزا دو تو بے چارہ خاموشی سے برداشت کرلیتا ہے لیکن بلاوجہ مار دیا ڈانٹ دو تو رُوٹھ جاتا ہے اور کئی کئی دن چارہ نہیں کھاتا۔ اس کی ماں ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ اب اس سے کوئی کام نہیں لیتے اور اس کی اتنی ہی عزّت کی جاتی ہے جتنی کہ کُنبے میں بڑی بوڑھیوں کی ہوتی ہے۔"

اور مجھے اپنے وطن کے بدنصیب گھوڑے یاد آجاتے۔ ان کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا۔ آٹھ آٹھ نو نو موٹی تازی سواریاں بٹھا کر تانگے والے ہر دو منٹ کے بعد محض عادتاً گھوڑے کو چابک مارتے ہیں۔

ایک دن کسی نے مقامی زبان سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"یہاں رہتے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتے ہو گے؟" منصُور نے پوچھا۔

"فقط گنے گنائے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن گرامر بہت مشکل ہے۔"

"شہروں میں یقتل، قتلو، تقتل، قیلت، یقتلون تو بارہا سُنے ہوں گے؟" منصُور نے پوچھا۔

"ہاں سُنے ہیں۔" روز نے کہا۔

"بس یہ قتل کی گردان ہے جو شہروں میں اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے گرامر سیکھنے کی کوشش کرو۔" منصُور مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

ایک دفعہ پروگرام بنا کر موٹے ہرن کا شکار کیا جائے۔ برٹن نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بتانے لگا کہ "عرصہ ہوا مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ لیکن ہندوستان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں مہاراجے کی پارٹی کے ساتھ، جو ہاتھیوں پر سوار تھی، شیر کے شکار کے لیے گیا۔ اتفاق سے ہم ایک اور شکاری پارٹی کی زد میں آ گئے جو ہاتھیوں کا شکار کرنے آئی ہوئی تھی۔ اس روز جو غدر مچا۔ اس کے بعد میں نے شکار سے توبہ کر لی۔"

اُن دنوں امریکن فرج صحرا میں نہیں پہنچی تھی۔ لہٰذا جیپ بھی نہیں ملی تھی۔ وہاں پرانے ماڈل کی جو موٹریں تھیں ان کی زیادہ سے زیادہ رفتار سے ہرن کی دوڑ کچھ تیز تھی۔ روز نے حساب لگا کر بتایا کہ دونوں کی رفتاروں میں تقریباً پانچ چھ

میل فی گھنٹے کا فرق ہے۔ پھر بھی اس قسم کا شکار کسی کو بھی اچھّا نہیں لگا۔ منصُور بولا کہ اس سے تو بہتر ہو گا کہ ہم ہرن کو مشین گن یاGRENADEسے ہلاک کر لیں۔ اس نے بھی موٹر سے کوئی فائر نہیں کیا کیونکہ اس کا بھی خیال تھا کہ پرندے یا جانور کو بچ کر نکل جانے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔

پھر ایک اتوار کو پیدل شکار کا پروگرام بنا۔ اس روز ہمارے ساتھ اسکاٹش ہائی لینڈر رجمنٹ کا ایک تندرست و توانا افسر میک فارلین بھی تھا جو کبھی پہلوان رہ چکا تھا۔ دوپہر تک باوجود بھاگ دوڑ کے کچھ نہ مِلا۔ دفعتاً روز نے ایک مرغابی گرائی۔ اس کے بعد دوسری۔ پھر ایک وزنی سا اُوٹ پٹانگ قسم کا پرندہ۔ کچھ دُور پیدل چل کر روز نے اسکاٹس مین سے درخواست کی۔ ”میک (Mac) تم ہم سب میں مضبوط ہو، ذرا دیر کے لیے یہ پرندے تو اُٹھالو۔“ پھر کچھ اور پرندے گرائے گئے وہ بھی میک کے حوالے کیے گئے۔ اس کے بعد تین چار بھٹ تیتر اور چند معمولی تیتر تھوڑی سی دیر کے لیے میک کو پکڑا دیئے گئے۔ چنانچہ حب ہم لنچ کے لیے رُکے تو اس کے کندھے اور بازو پرندوں سے لدے ہوئے تھے۔

ہم سینڈوچز اور پھل آپس میں بانٹ رہے تھے کہ اچانک ایک نعرہ سنائی دیا۔

”میک تمہارے پیچھے ہرن کھڑا ہے۔۔۔“

واقعی ایک اُونچا سا ہرن بالکل اس ٹیلے پر کھڑا تھا جس کے ڈھلوان پر میک اپنی تھرماس سے چاء انڈیل رہا تھا۔ کئی آوازیں آئیں۔

"میک فوراً بندوق اٹھاؤ! فائر کرو!!"

"جلدی کرو! شاباش!!"

لیکن وہ یونہی اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔ کبھی بندوق تھامتا تو کبھی کارتوسوں کا تھیلا۔ ایک کارتوس بندوق میں ڈالتا۔ پھر نکال کر دوسرا کارتوس چُنتا۔ غرضیکہ اس نے اتنی دیر لگا دی کہ ہرن نے بڑے اطمینان سے ہم میں سے ایک ایک کو بغور دیکھا۔ پھر مُڑا اور زقندیں بھرتا ہوا صحرا میں غائب ہو گیا۔

سب میک کو بُرا بھلا کہنے لگے کہ بالکل سامنے کھڑا ہوا ہرن محض سستی سے جانے دیا۔

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بہانہ پیش کرتا منصُور نے کہا "حضرات! آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر یہ ہرن گرا لیا جاتا تو یہ بھی بیچارے میک ہی کو اُٹھانا پڑتا۔"

شام کو واپسی پر اسکاٹس مین نے منصُور سے ہاتھ ملایا اور چپکے سے بولا۔ "اس گروہ میں فقط مَیں اور تم ہی پہاڑ کے باشندے ہیں۔ اور فقط کوہستانی ہی ایک دوسرے

کے خیالات بھانپ سکتے ہیں۔" منصُور اور میں گھوڑوں پر شکار کیلئے نکلتے۔ وہ کُردستان کے جانوروں اور پرندوں کی باتیں سناتا۔ شکار کے قصّے سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔۔۔

"گھومتی ہوئی نیچے گرتی مرغابی۔۔۔ پتھر کی طرح دھم سے گرتا ہوا پرندہ۔۔۔ لڑکھڑاتا ہوا زخمی ہرن۔۔۔۔ کوئی اور نظارہ بھی اتنا دلکش ہو سکتا ہے؟"

ہم لمبی سیر پر نکلتے تو آبادی سے باہر پہنچتے ہی وہ لمبے لمبے سانس لے کر ہوا سونگھتا۔

"اب ویرانے کی جان پرور، فرحت بخش ہوا آئی ہے۔ اس کی تازگی تم نے بھی محسوس کی ہو گی۔ لوگ تنہائی اور ویرانی کا رونا روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ انسان کے آنے سے پہلے دنیا اُجاڑ ہی تو تھی۔ ساری گہما گہمی اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے۔ مرد جس جگہ خیمہ گاڑ دے وہیں رونق ہو جاتی ہے۔۔۔"

آداب و تکلّفات کا ذکر چھڑِتا تو وہ بتاتا۔۔۔ "شاید تمہیں میری باتیں عجیب معلوم ہوتی ہوں۔ دراصل اس وقت پڑھا لکھا منصُور نہیں بول رہا۔ ایک دیہاتی کُرد تم سے مخاطب ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تُرشی، بد کلامی، دنگے فساد سے مجھے نفرت ہے لیکن بعض اوقات زندگی کی شاہراہ پر کوئی

ایسا خبیث بھی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روک لیتا ہے جو فطرتاً بد گو، بدخُو اور بد کُن ہوتا ہے۔ ایسے موقعے پر انسانیت اور شرافت کے درس دینا اور راستہ چھوڑ دینا نری بزدلی ہے۔ اِس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے جسے وہ سمجھتا ہو اور ایسا سبق سکھانا چاہیے کہ عُمر بھر نہ بھولے۔"

میں نے اُسے کبھی غمگین نہیں دیکھا۔ اس کی وجاہت، گستاخ سی مسکراہٹ، اس کے حوصلے اور اولوالعزمی سے سب متاثر ہوئے۔ کوئی اُداس ہوتا تو کہتا۔۔۔ "مرد کو نیوٹرل گیئر میں رہنا چاہیے۔ کُڑھنا، اپنے اوپر ترس کھانا، ناکامیوں پر بہانے تراشنا بالکل بے سود ہے۔ زندگی میں بارہا شکست ہو گی کئی مرتبہ ناحق ٹُوکا جائے گا۔ بلاوجہ شُبہ کیا جائے گا۔ بغیر قصور سزا ملے گی۔ جیسے کیرم کھیلتے وقت اصلی نشانہ کسی اور رُخ میں ہوتا ہے لیکن زَد میں کوئی اور آتا ہے اور TANGENT کسی اور طرف لگتی ہے۔ اسی طرح بغیر بات کئے مرد دوسروں کی زد میں کئی مرتبہ آتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر سوچ لینا چاہیے کہ یُوں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور ہوا کرے گا۔ مرد کبھی ہراساں نہیں ہوتا اور کبھی ہار نہیں مانتا۔۔۔"

مَیں نے اُن حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا۔

"ہاں کئی ہیں۔" وہ مسکرانے لگا۔

''کوئی منتخب کی؟''

''نہیں! دیر تک کنوارا رہنے میں یہی خرابی ہے۔ جب شوخ و شنگ موسیقی سُنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے۔ پھیکی مٹیالی سی سہ پہر کو حزن کے مجسمے کیتھرین سے ملنے کو جی چاہتا ہے جو خشک و بے کیف فضا پر یوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ بزلہ سنجی میں گُل رُخ کا کوئی جواب نہیں۔ جب محض خرافات بکنی ہو تو روز لین جیسا رفیق ملنا محال ہے۔ غضب کی پھکڑّ اور واہی تباہی ہانکنے میں بے مثال ہے۔ زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ پَر لگا کر رفعت کے پاس پہنچ جاؤں۔ دلجوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ بہت سے منصوبے باندھ لیے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو زہرہ کی تمکنت اور حُسنِ بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ خود پسندی اور اَنا کا بھوت اُترتے دیر نہیں لگتی۔ اچھی چیزیں کھائے عرصہ گزر چکا ہو تو مستورہ بھُلائے نہیں بھولتی جو اتنی نفاست پسندی سے خوش خوراکی پر آمادہ کرتی ہے کہ دیکھتے دیکھتے یوں وزن بڑھ جاتا ہے۔۔ بتاؤ میں کیا کروں کہ یہ سب خوبیاں یا برائیاں جو مجھے پسند ہیں فقط ایک لڑکی میں کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں؟ اور پھر مجھے شادی کا کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے۔''

”یہ بتاؤ کہ اتنے گھمسان کے ایکشن کے باوجود اب تک کیونکر بچے ہوئے ہو؟“

”تم بخوبی جانتے ہو کہ جنگی چالوں میں حملے کا پلان بناتے وقت پسپائی کا پلان بھی بنایا جاتا ہے۔“

سنیچر کی رات تھی۔ ہم رقص گاہ میں موسیقی سُن رہے تھے۔

ایک لڑکی قریب سے گزری۔ جرجیس نے اُسے ٹھہرایا اور پوچھا۔۔ ”معاف کیجئے آپ کی میز پر ایک خوبصورت سی لڑکی ہے۔ وہ کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ جواب ملا۔

”مگر اس کے رخسار پر تو تِل تھا۔“

”سُرمے کا تِل تھا۔ رومال سے اُتر گیا ہو گا۔ فرمایئے۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ شاید ملا بھی ہوں۔“

"آپ نے پتہ نہیں کیا کیا دیکھا ہو گا۔ ویسے میں آج پہلی مرتبہ بغداد آئی ہوں۔"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ۔۔۔۔"

"اب آپ فرمائیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے۔ میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں۔ یا آپ کو مدّت سے میرا انتظار رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔" وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

جرجیس بہت خفا ہوا۔ "میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن یہ خواہ مخواہ ڈانٹ گئی۔ اب اس پر باقاعدہ عاشق ہو کر نہ دکھایا تو میرا نام نہیں۔"

وہی لڑکی پھر سامنے سے بالکل تیر کی طرح گزر گئی اور جرجیس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ کچھ دیر تلملاتا رہا۔ پھر سیدھا اُن لڑکیوں کے جھنڈ پر بیل کی طرح حملہ آور ہوا۔ لیکن فوراً واپس آ گیا۔

"رقص کے لیے کہا تھا لیکن نہیں مانی۔۔۔"

جب آرکسٹرا نئی دھن شروع کرتا۔ جرجیس تیزی سے اس طرف جاتا اور انکار

کرا کے واپس آ جاتا۔ ایک دفعہ جو گیا تو سرپٹ واپس آیا۔ ”وہ کہتی ہے کہ یہاں اتنے لڑکے موجود ہیں جو تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ بھلا تم میں ایسی کون سی خوبی ہے جس پر اِترا رہے ہو؟ لِللہ کوئی مُنہ توڑ جواب سوچئے کہ اسے خاموش کرا سکوں۔“

مَیں نے مشورہ دیا کہ ”اسی موضوع پر فارسی کا ایک شعر ہے کہ گلشن میں صُبح صُبح بُلبل نے گُلاب کے پھُول سے کہا کہ چاروں طرف کتنے پھُول کھلے ہوئے ہیں جو رنگ و روپ میں تجھ سے کہیں بہتر ہیں۔ پھر تجھے کس بات پر ناز ہے؟ گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے، مگر یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟ اپنے محبوب سے کوئی اس طرح کلام کیا کرتا ہے؟“

وہ بھاگا بھاگا گیا۔ مشورہ لینے آیا۔ پھر چلا گیا۔ اس مرتبہ جو لوٹا تو پیچھے پیچھے وہ آئی۔۔۔ ”تو آپ اسے پڑھا پڑھا کر بھیج رہے ہیں؟ خود میدان میں کیوں نہیں آتے؟“ ہم سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ فوراً اُن کی طرف چلے گئے۔

اتنے میں ایک نہایت پیاری لڑکی آئی اور گروہ میں شامل ہو گئی۔

”یہ آپ کا تِل۔۔۔“ جرجیس اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے کچھ ہانکنے لگا

تھا لیکن روز نے آپس میں تعارف شروع کرا دیا، اس لیے اسے خاموش ہونا پڑا۔

"یہاں آنے سے پہلے آپ نے عراق کا نام سُنا تھا؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"بچہ بچہ اس نام سے آشنا ہے۔" میں نے تریاق از عراق آوردہ، شود مار گزیدہ مُردہ شود، کا ترجمہ سنایا۔

"اور یہاں کے شہر؟"

"الف لیلہ کی وجہ سے بغداد دنیا بھر میں مشہور ہے اور اپنے چور کی وجہ سے بھی۔ 'بغدادی چور' نامی فلم بھی قبول ہوئی تھی۔" روز نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "جوان لمبے مارچ کرتے ہوئے ایک خاص گانا گایا کرتے ہیں جس میں بصرہ آتا ہے۔"

یہ خاص گیت۔۔۔ "چھیئی رَن گئی، بصرے نوں گئی۔"۔۔۔ تھا۔ اس کا ترجمہ سنانا پڑا جو کچھ یوں شروع ہوتا تھا کہ ایک حسینہ المعروف بہ چھیئی ہند سے بصرے کا رُخ کرتی ہے۔ متعلقہ نوجوان ایک لٹھ باز بزرگ سے درخواست کرتے ہیں کہ کسی طرح گھیر گھار کر چھیئی کو واپس موڑ دے۔

"یہ تو کچھ نہیں ہے۔" تِل والی نے منہ بنا کر کہا۔

موہن میرے کان میں بولا ''خان صاحب ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ وطن کے ایک اخبار میں DOG RACE کا ترجمہ 'کتّوں کی گھُڑدوڑ' میں نے خود پڑھا تھا۔ اسی طرح ایک اور جگہ ANIMAL CENSUS کو 'جانوروں کی مردم شماری' بنا دیا گیا تھا۔''

''آپ کے ہاں رومانی گیت بھی تو ہوں گے۔'' ایک اور لڑکی نے پوچھا۔

''پہلے ہوا کرتے تھے لیکن اب فقط فلمی گانے رہ گئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''پرانے گیتوں میں سے کوئی سنایئے۔۔۔''

''سہیلیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی ہیں۔ ایک کہتی ہے۔۔۔ اُس چھیل چھبیلے بانکے سپاہی کو دیکھا؟ اس رنگ رنگیلے جھُوٹے ہرجائی کا کیا پوچھتی ہو۔ اس جیسا زمانے میں کوئی نہیں ہے۔۔۔''

''ہائے اللہ، تمہارے ہاں جھوٹے محبوب کو بھی پسند کیا جاتا ہے؟''

''مَن موہنا اور دلچسپ محبوب جھوٹا بھی ہو تو اُس محبوب سے کہیں بہتر ہے جو سچ بولتا ہو مگر ہونّق اور ٹھُس ہو۔ اور پھر محبوب سے الفت محض اس کی خوبیوں کی بنا پر تھوڑا ہی کی جاتی ہے۔ محبت تو اس کی برائیوں کے باوجود بھی ہو جاتی ہے۔ یہ

چھوئی موئی چالیں ذرا سا جھُوٹ، تھوڑی سی ہیرا پھیری۔ ایک دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے پھر بھرپور حملہ۔ اور جیتنے پر ساری شرطیں منوانا۔۔ محبت اور جنگ دونوں میں جائز ہیں۔"

"ہوتی ہوں گی۔۔۔ لیکن نہ ہمیں جنگ پسند ہے اور نہ سپاہی۔ سپاہیوں سے اس لیے بھی کترانا چاہیے کہ وہ بغیر بتائے کسی دن دُور چلے جاتے ہیں۔"

"اگر وہ چلتے پھرتے نہ رہیں تو ان سے ملاقات کیونکر ہو؟"

"لیکن ایک مشرقی لڑکی کسی ہرجائی کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟"

"یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے؟ مشرقی، ایشیائی، جنوبی، مغربی وغیرہ کی اضافت محض دُم چھلّا ہے۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے۔ ہرجائی ہو یا کچھ اور۔۔" منصُور نے جواب دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر تِل والی کے نازک ہونٹ ہلے۔۔۔ "ہمیں اپنے وطن کا کوئی اچھا سا گیت سُنایئے، فرید کی کافی۔۔۔" "ڈیہنہ سہاگ دے آوندے ہن" کا بالکل آزاد ترجمہ سُنایا۔

"ایک حسینہ سوچ رہی ہے کہ۔۔۔۔

یہ اچانک زیور کیوں بھانے لگے ہیں؟

کہیں سہاگ کے دن تو نہیں آ رہے ؟

صحرا میں تتلیاں کہاں سے آ گئیں ؟

ویرانوں میں شادابی کون لے آیا؟

ایسی سُہانی رُت تو کبھی نہیں آئی

میرے اللہ کیا ہونے والا ہے ؟"

"ہائے یہ تو بے حد لطیف ہے۔۔۔" اس کے رخسار سُرخ ہو گئے۔ تِل اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اس کا نام سعدہ تھا۔

موسیقی شروع ہوئی تو منصُور اُسے رقص کے لیے لے گیا۔

جرجیس کو ڈانٹنے والی لڑکی لوئی زا تھی جس کے ہاتھ یُوں سُرخ سے تھے جیسے مہندی لگا رکھی ہو۔ وہ ایک مرتبہ پھر اُسے رقص کے لیے کہنا چاہتا تھا۔ ہم سے مشورہ لینے آیا تو اس کی زبانی اس شعر کا ترجمہ لوئی زا کو سنوایا گیا۔۔۔

مَل کے مہندی کبھی دریا میں نہایا نہ کرو

آگ پانی میں مِری جان لگایا نہ کرو

(آگ پانی میں۔ کی جگہ۔۔۔ آگ دجلے میں۔۔۔۔ استعمال کیا گیا)

"ایسی ماڈرن لڑکیاں تو ہر شہر میں مِل جاتی ہیں۔" روز بولا۔ "یہاں کی اصلی لڑکیوں سے بھی کبھی ملنا چاہیے۔" ہم نے اسے بتایا کہ یہاں کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ ملاقات کا وقت تک مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ دن تو آسان ہیں۔ اتوار یوم الاحد ہے، اس سے آگے انگلیوں پر گِن سکتے ہیں۔ یہ بھی پتہ ہے کہ ایک بجے الساعتہ واحدہ ہوتی ہے۔ الساعتہ خمس پر پانچ بجتے ہیں۔ لیکن جب کوئی الساعتہ واحدہ و نصفِ الّا خمس دقائق کہہ کر چل دے تو فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بج کر پچیس منٹ کا وقت دیا ہے۔

"لیکن زبان تو سیکھنی پڑے گی۔"

میں نے منصور سے کہا کہ مقامی باشندوں سے ملنا چاہیے۔ اس طرح زبان سیکھنے میں آسانی رہے گی۔

"اب تم سے کئی ملیں گے" اور وہ مُسکرا کر بولا۔

چنانچہ سلیم خود ملنے آیا۔ چھوٹے قد کا پَلا ہوا اٹھنکا ہوا چِکنا چپڑا سا نوجوان۔

اُبھری ہوئی موٹی ناک۔ بازوؤں، گردن اور کانوں پر بال ہی بال تھے مگر سر پر کچھ بھی نہیں تھا۔

"بزنس کے علاوہ اس سے کسی بھی موضوع پر گفتگو کرو۔" منصُور نے سرگوشی کی۔

"مسعودی نے لکھا ہے کہ بغداد میں۔"

"مسعودی کون تھی؟" سلیم نے فوراً پوچھا۔

"مسعودی کون تھا۔۔۔ اپنے زمانے کا مشہور عالم۔"

"عالم تھا؟۔۔۔ اچھا!"

"جب ابنِ بطوطہ بغداد آیا تو اسے یہ شہر پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"اور اس کے سفرنامے میں پڑھیے۔"

"ابنِ بطوطہ کون تھا؟"

"سیاح تھا"

"سیّاح تھا۔۔۔اچھا!"

اسی طرح بار بار 'کون تھا' اور 'اچھا' دہرائے گئے۔

جب وہ چلا گیا تو منصُور نے بتایا کہ یہ بغداد میں رہتا ہے۔ "میں نے کہا جو تھا کہ شہریوں سے ملنا بیکار ہے۔"

"مگر یہ آیا کس سلسلے میں تھا؟"

"سعدہ کا عاشق ہے۔ تم سے ملنے آیا تھا۔"

"کہیں خفا تو نہیں ہو گیا۔"

"نہیں۔ پھر آئے گا"۔

اگلی دفعہ آیا تو اپنے ساتھ ایک موٹا تازہ چِکنا گنجا نوجوان لایا جو اسکول میں تاریخ پڑھاتا تھا۔ منصُور نے فوراً چوٹ کی۔۔۔ "یہ بتایئے کہ ہمارے بڑے بڑے عالم البیرونی، الاصفہانی، المصری، البلخی، الہندی، الخوارزمی کیوں تھے؟ کوئی العراقی، البصری یا الموصلی بھی گزرا ہے؟"

”الکُردی بھی کوئی نہیں تھا۔“ سلیم کا دوست بولا۔

”پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے۔“

”عربی ادب کی جامع فہرست کیا البغدادی نے مرتب نہیں کی تھی؟“

”لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بزرگ بغداد کے تھے یا یہاں کچھ عرصے کے لیے مقیم رہے تھے۔ کیونکہ یہ کتاب قسطنطنیہ میں مرتّب ہوئی تھی۔“

”اگر مان لیا جائے کہ بغدادیوں نے کچھ نہیں کیا تو کُردوں نے کون سے تیر مارے تھے؟“

”کُردوں نے چنگیز خان کی فاتح فوج کو پہلی شکست کا مزہ چکھایا اور اس کے طولی خاں کو خوار کیا۔ اگر کُرد اسے نہ روکتے تو اُسی ریلے میں منگول شمالی افریقہ تک جا پہنچتے۔ پھر کُردوں نے چنگیز کے پوتے ہلاکو خاں کو بغداد جانے والی شاہراہ سے نہیں گزرنے دیا۔ مجبوراً اسے ایران سے ہو کر بغداد آنا پڑا۔ بغداد کو تباہ کر کے جب اس کی فوجیں ہماری پہاڑیوں کی طرف آئیں تم ہم نے مار مار کر بھرکس نکال دیا۔“

”یہ تو آپ ساری قوم کا ذکر کر رہے ہیں۔۔۔ کسی ایک کُرد کا نام لیجیے۔“

"غازی صلاح الدّین ایّوبی جیسا عظیم انسان آج تک کسی اور ملک نے پیدا کیا ہے؟"

سلیم کا دوست خاموش ہو گیا لیکن سلیم نے گلا صاف کرتے ہوئے شکایت کی۔ "جب جانتے ہو کہ مجھے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر اس قسم کے سوال کیوں پوچھتے ہو؟ اگر مَیں تم سے پوچھنے لگوں کہ چمڑے کا بھاؤ کیا ہے؟ آج کل فولاد خریدا تو نفع ہو گا یا نقصان؟ کپاس اور چاول کے نرخ کس طرف جا رہے ہیں؟ تو پھر؟"

واپسی پر منصُور بولا "ہمارا گاؤں بھی دجلے پر ہے لیکن وہاں اور یہاں کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے؟"

فرات کی طرح دجلہ بھی تُرکی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ کُردستان کی پہاڑیوں کے بعد جب میدانی علاقہ آتا ہے تو دجلے میں دو دریا گرتے ہیں۔ جو ذرا لمبا ہے اسے الزاب الاعلیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو الزاب الاسفل (محض پچاس ساٹھ میل کے فرق پر کسی دریا کو سِفلہ کہنا زیادتی ہے) شمال میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں

دجلہ و فرات تقریباً آپس میں مِل جاتے ہیں۔ میدانوں میں نہریں انہیں ملاتی ہیں۔ پھر قُرنا کے قریب دونوں واقعی مل کر شط العرب بن جاتے ہیں اور بالغ خلیجِ فارس میں جا گرتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ قریب قریب ہیں۔ دونوں میں طغیانی آتی ہے۔ دونوں گدلے ہیں۔ دونوں ویرانوں سے گزرتے ہیں۔ دونوں کے کناروں پر قدیم ترین تہذیبوں کے آثار ہیں۔۔۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرات اور اس کے انگریزی نام EUPHRATES میں تھوڑی بہت مطابقت ہے لیکن دجلے کا TIGRIS سے قطعاً کوئی تعلّق نہیں معلوم ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح اسی علاقے میں آیا تھا اور یہ بھی کہ باغِ عدن قرنا کے قریب واقع تھا۔ (لیکن عدن والے اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تھا۔) پرانے زمانے میں دجلہ و فرات سمندر میں الگ الگ گرتے تھے۔ آہستہ آہستہ گارے سے دہانے اَٹتے گئے۔ نئی زمین بنتی گئی اور سمندر دور ہو گیا۔ ان دریاؤں نے اور اس مٹی نے جو یہ ساتھ لاتے ہیں میسوپوٹیمیا یعنی دوآبے کو ہزاروں سال سے زرخیز بنائے رکھا۔

تقریباً چھ ساڑھے چھ ہزار سال پہلے دنیا کی قدیم ترین قوموں کی ملاقات غالباً خلیج

فارس کے ساحل پر ہوئی۔ تین مختلف قسم کے انسان آپس میں ملے۔ دراوڑ جو شاید ہندوستانی تھا مکران کی طرف سے آیا تھا۔ حامی افریقہ سے اور منگول وسط ایشیا سے۔ یہاں سبزہ تھا۔ پانی کی افراط تھی۔ ان دنوں نسل، رنگ اور نیشنلزم وغیرہ کا امتیاز نہیں تھا اور لوگ متحمل تھے لہٰذا اکٹھے رہنے لگے۔ اور خانہ بدوش انسان نے سب سے پہلے گاؤں دجلہ و فرات کے کناروں پر آباد کیے۔ بہت جلد دوآبے کی خوشحالی کی خبر اِدھر اُدھر پہنچ گئی اور اغیار کشاں کشاں آنے لگے۔

نسلِ انسانی آہستہ آہستہ مہذّب ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ چھوٹی موٹی جھڑپوں کی بجائے باقاعدہ جنگیں شروع ہوگئیں۔ ؁۴۰۰۰ قبل از مسیح کے لگ بھگ پہیہ ایجاد کیا گیا تاکہ حملہ کرنے اور بھاگنے میں آسانی رہے۔ تانبے کا استعمال شروع ہوا۔ آئینہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ میک اَپ کا سامان بھی تاکہ خواتین ہر جگہ لیٹ پہنچ سکیں۔

جنوبی علاقے میں سمیرین لوگوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور سیلاب عظیم کی کہانی بھی بیان کی (جو طوفانِ نوح کے تذکرے سے ملتی جُلتی ہے۔) پہلے اشیاء کا مبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا لیکن انہوں نے چاندی رائج کرکے زرکاریکٹ شروع کیا۔ زر کے ساتھ لکھا پڑھی بھی لازمی تھی چنانچہ میخنی رسم الخط جاری ہوا اور روپے

پیسے کے سلسلے میں انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا پڑھنا سیکھا۔

ان باتوں کے قصّے جہاں جہاں پہنچے وہاں سے حملہ آور لائے۔ شمال سے سامی لوگ آدھمکے۔ عکادیوں نے دیکھا دیکھی حملے شروع کیے جو چار سو برس تک جاری رہے (ایک دفعہ پہاڑوں کی سمت سے حملہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا)۔ آخر حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ تنگ آ کر سمیرین لوگوں کو باقاعدہ جنگِ آزادی لڑنی پڑی اور غیر ملکیوں کو بھگانا پڑا۔ دوبارہ آزاد ہو کر انہوں نے بابل شہر بسایا۔

بابل کے معنی تھے دیوتا کا دروازہ۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے بتایا کہ ان کی زبان میں بابل انتشار کو کہتے ہیں (یہودی ہمیشہ اُلٹا مطلب نکالتے ہیں)۔

بابل کی شہرت ہندوستان تک پہنچی تو حملہ کرنے کی بجائے ہندی بابل کے دیس۔ 'بابل مورا نیہر چھُوٹو جائے' وغیرہ گا کر محظوظ ہوئے۔

سمیرین لوگوں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے کے لیے پہلی مرتبہ ثالث مقرر کی (تنازعے چُکانے کا یہ طریقہ پانچ ہزار سال سے استعمال کیا جا رہا ہے اور ہر مرتبہ فیل ہوتا ہے۔) ان لوگوں کو جنّت و جہنّم کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ ان کا

مذہب فقط اسی دُنیا تک محدود رہا۔

اِن کے مشہور بادشاہ حُمورابی نے مٹی کی تختیوں پر اپنے ماتحتوں کو خطوط لکھوائے۔ اسے اپنی زندگی میں شُبہ تک نہ ہوا کہ مکاتیبِ حُمورابی، کے ذریعے وہ دنیا کے اوّل ترین قوانین وضع کر رہا ہے۔ ان دو سو بیاسی قوانین کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کافی تہذیب یافتہ تھے۔ کیونکہ ان کے ہاں انکم ٹیکس بھی تھا اور رشوت اور سفارشیں قبول کرنے والے افسر بھی۔

حُمورابی نے سماج کو تین حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔۔ آزاد افراد، نیم آزاد اور غلام۔ (یہ تقسیم مدّتوں تک رہی، بلکہ اب بھی ہے۔) ہر چیز کی قیمت مقرر کی گئ اور پبلک سے کہا گیا کہ ایک سے زائد شادی نہ کریں۔ قافلوں کا ٹائم ٹیبل اور کرایہ نامہ بنایا گیا۔ قرض کے سلسلے میں سود رائج کیا گیا۔ سزائے موت کی قسمیں واضع کی گئیں۔

مثلاً زہر دینا، دریا میں ڈبونا وغیرہ۔ ٹھیکیداروں، طبیبوں اور آفیشل کاروائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً مکان کے قبل از گارنٹی گر جانے سے رہنے والے کا بچّہ مَر جائے تو مکان تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار کے بچّے کو مار دیا جاتا تھا۔ بے توجہی بالا لچ کرنے پر طبیب کو فوراً حکام پکڑ کر لے جاتے تھے۔ طبیبوں کے پاس مُہریں ہوتی

تھیں جنہیں وہ نسخوں پر لگاتے تھے۔ (ویسے اس زمانے کے نسخے نہایت مختصر ہوتے تھے مثلاً دانت میں درد ہو تو سورج مکھی پیس کر لگاؤ۔ پیٹ میں درد ہو تو دودھ پی لو۔ گنجے پن کے لیے سَر پر شراب اور تیل کی مالش کرو۔ وغیرہ وغیرہ) کسی کے پاس رقم یا جائیداد ہو مگر اس کا دفتری ثبوت نہ ہو تو سزائے موت ملتی تھی۔ تہمت لگا کر ثابت نہ کرسکنے پر بھی سزائے موت۔ جرمانے امیروں کے لیے زیادہ تھے اور غریبوں کے لیے کم۔

آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت۔۔۔ والا مشہور قانون بھی حُمورابی کا ہی تھا۔ ان سخت قوانین نے (جن میں غالباً سب سے نرم سزا سزائے موت تھی) رعایا کے حقوق اور ان کی ملکیت کی پوری طرح حفاظت کی اور عورتوں کو مردوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ وہ مردوں پر مقدمے دائر کر کے ان سے طلاق لے سکتی تھیں۔ جائیداد پر قبضہ کرسکتی تھیں۔

اِن دِنوں ایک خاص وضع کی عمارت بنانے کا رواج عام تھا۔ پُختہ اینٹوں میں گھاس اور نرسل کی تہیں جما کر ایک نہایت چوڑا اور اونچا عظیم الشّان چبوترہ تعمیر کیا جاتا جس کی سات منزلیں ہوتیں۔ جو بُلندی کے رُخ سکڑتی چلی جاتیں۔ اسے زِگرت کہا جاتا۔ دن کو اس سے مندر کا کام لیا جاتا اور رات کو اُوپر والی منزل سے ستاروں کا

مطالعہ ہوتا۔ مشہور و معروف 'بابل کا مینار' جو عذاب آنے پر تباہ ہوا تھا اسی قسم کا تھا۔

چند زِگرت اب بھی موجود ہیں۔ ان کے کھنڈروں کی تہوں میں جمی ہوئی خشک گھاس اُونٹ کھاتے ہیں۔

بیسویں صدی قبل از مسیح میں پھر ہڑبونگ مچی۔ شمال سے خانہ بدوشوں نے ہلّہ بول دیا۔ حطیطی آئے۔ پھر کیستی آئے اور سمیرین حکومت تباہ ہو گئی۔

اس مرتبہ حملہ آور گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ بابل والوں نے پہلی مرتبہ اس جانور کو دیکھا تو اسے پہاڑی گدھا کہا (بابل والے شیر کو بڑا سارا کُتّا اور موتیوں کو مچھلی کی آنکھیں کہا کرتے تھے۔ غالباً انہیں غلط نام رکھنے کا شوق تھا)۔

ان ہی دنوں شمال میں دجلہ کے کنارے ایک بڑی مشقت پسند اور توانا قوم آباد ہو گئی۔ یہ ایشو کو دارالسلطنت بنا کر اشورین کہلانے لگے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہر وقت لڑتے رہنا ہی بہترین دفاع ہے۔ چنانچہ جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ وہ یہ کہ مار مار کر دُشمن کا بھُرکس نکال دو۔ پھر مفتوحہ شہروں پر اچھی طرح ہل چلا کر بیان دے دو کہ ہمیں تو دشمن سے خطرہ تھا۔ اسی ڈر سے ہم اپنا دفاع کر رہے تھے۔

شروع شروع میں تو یہ ڈنڈے مار نظریہ خاصا کامیاب رہا۔ بابل کو تلوار سے مطیع کرنے میں دیر لگی تو فرات کا رُخ بدل کر شہر میں پانی چھوڑ دیا۔ مکانوں میں پانی آیا تو لوگ بھاگ نکلے۔ اس پایۂ تخت کو تباہ کر کے نئے دارالحکومت کی فکر پڑی۔ افسوس بھی ہوا کہ اگر زیادتی نہ کی ہوتی تو مناسب ترمیم و اضافے کے بعد بابل اچھا بھلا اشوری شہر بن سکتا تھا۔ آخر دائیں شمال کی طرف گئے اور دجلے کے کنارے نینوا چُناجو معمولی سا گاؤں تھا۔

نئے شہر کی تعمیر کافی مہنگی پڑی، جگہ جگہ دیواروں پر لمبی لمبی داڑھیوں والے شیر بنائے گئے جن کے کندھوں پر بڑے بڑے پَر لگے ہوئے تھے۔(ان میں سے کچھ شیر برٹش میوزیم میں رکھے ہیں)۔ داڑھیوں والے صحت مند بیل بھی نصب کیے گئے۔(اشوریوں کو انسانوں سے زیادہ حیوان پسند تھے)۔

حُمورابی کے قوانین منسوخ کرنے کے بعد انہوں نے دنیا کو تباہ کرنے کا پروگرام بنایا(اشوریوں کے طرفدار کہتے ہیں کہ بیچاروں کو اتنا کڑا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا کہ ادائیگی کے سلسلے میں مجبوراً دوسرے ملکوں میں لوٹ مار کرنی پڑتی تھی)۔ لیکن دوسرے ملکوں کو بھی اشوری فلسفۂ حیات معلوم ہو چکا تھا چنانچہ اشوریوں کی سلطنت سو برس بھی نہ چلی۔

نینوا کی تباہی پر (جو اشوریوں کے پسندیدہ طریق سے شہر پر ہل چلوا کر کی گئی تھی) سارے ملک خوش ہوئے۔ اس واقعے کے دوسو سال بعد یونانی مؤرّخ زینوفن نینوا سے گزرا تو وہاں نہ نینوا تھا نہ کوئی اشوری۔ ویسے اشوری اتنے بُرے بھی نہیں تھے۔ جب کبھی جنگ و جدل سے فُرصت ملتی تو حطیطیوں کی لکھی ہوئی تختیاں اکٹھی کر کے فہرستیں بناتے۔ آخری اشوری بادشاہ اشور بنی پال نے دنیا کی پہلی لائبریری بنائی۔ لائبریری کے کھنڈر سے تقریباً اکیس بائیس ہزار پختہ مٹّی کی تختیاں ملیں (جن میں سے بیشتر حسبِ معمول برٹش میوزیم میں ہیں)۔ فہرست کے علاوہ لائبریری کے مختلف سیکشن تھے۔ مذہب، انسانی تاریخ، ادب (لیکن مصنّف اشوری نہیں تھے)۔ ہر تختی پر شاہی حکم درج ہے کہ اسے لائبریری سے باہر لے جانا منع ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی تصنیف چُرانا کافی مُشکل ہوتا ہو گا۔ اتنی وزنی چیز کو چھپا کر نہیں لے جاسکتے۔ خصوصاً جب کتاب کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا بھی ڈر ہو۔

اب مینڈین لوگوں کی باری آئی۔ یہ بڑی زبردست قوم تھی۔ جب ستھین

لوگوں نے ان پر حملہ کیا تو لگاتار لڑتے رہے۔ ہار نہیں مانی حتیٰ کہ اٹھائیس برس گزر گئے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر حملہ آور تنگ آکر واپس لوٹے۔ معلوم ہوا کہ عورتوں نے پہلے تو انتظار کیا پھر غلاموں سے شادیاں کر لیں جن سے ایک نئی نسل ظہور میں آچکی تھی۔ جب آقاؤں نے تلواریں نکالیں تو غلاموں اور غلام زادوں نے مقابلہ کیا۔ کئی دنوں کی شدید لڑائی کے بعد کسی جہاندیدہ بزرگ نے مشورہ دیا کہ اپنے غلاموں سے برابر کا سلوک کرنا نِری بے وقوفی ہے۔ کل تلواروں کی بجائے ڈنڈے، گالیاں اور دُرّے استعمال کرو۔ لہٰذا اگلے روز آقا گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھے اور غلاموں کو ڈنڈوں اور ہنٹروں سے زدوکوب کرنا شروع ک دیا۔۔ اس پر انہوں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور اس ذہنیت کا ثبوت دیا جو بعد میں غلامانہ مشہور ہوئی)۔

ساتویں صدی قبل از مسیح میں کلدانی آئے۔ کیونکہ کلدانی دستِ خاص سے نینوا پر ہل چلا چکے تھے اس لیے انہیں بھی دارالحکومت کی فکر پڑی۔ نینوا کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں جگ ہنسائی کا ڈر تھا اس لیے پرانے بابل کو چُنا۔

چنانچہ بابل جدید بنا جہاں سے ان کے بادشاہ بنوکدنذر دوم نے چالیس برس تک حکومت کی۔ جوانی میں کسی پہاڑی دوشیزہ سے شادی کر بیٹھا تھا جو اِن تپتے ہوئے

میدانوں میں وطن کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتی۔ بادشاہ نے بہترا سمجھایا بجھایا، آخر مجبوراً اسے ایک مصنوعی پہاڑی بنا کر اس پر HANGING GARDENS بنوانے پڑے جو بعد میں زمانۂ قدیم کے سات عجائبات میں شامل ہوئے۔ اِن معلّق باغات کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں کہ وہ درحقیقت کس وضع کے تھے۔ جو کُچھ عراق کے ماہرین بتاتے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے ملتے جلتے ہوں گے۔ (بعد کے حملہ آور جو ایران سے آئے تھے ان باغوں کو دیکھ کر بہت ہنسے کیونکہ ایران میں لاتعداد ایسے باغ تھے جو معلّق نہیں تھے۔ انہوں نے ان باغوں کو غیر فطری قرار دے کر تباہ کر دیا)۔

شاید ملکہ بھی معلّق باغوں سے مطمئن نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان میں پھُول، درخت، پرندے وغیرہ تو تھے لیکن خُنکی نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آکر بنوکدنذر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں علمِ ہئیت کو بڑی ترقّی ہوئی اور دنیا کا پہلا کیلنڈر مرتب ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے مزید بیزار ہو کر دوروں پر جانا شروع کر دیا اور مصریوں کو شکست دی۔ پھر یروشلم کو تباہ کر کے اتنے سارے یہودی غلام ساتھ لے آیا کہ بغداد میں اب تک یہودی ہیں۔ (یہودی ایک دفعہ کہیں پہنچ جائیں تو پھر واپس نہیں جاتے)۔

ویسے یہ لوگ اشوریوں سے مختلف تھے اور مقابلتاً صلح پسند تھے۔ ان کے ہاں ایک کہاوت تھی کہ لوگ لڑ رہے ہوں تو کان دبا کر چُپ چاپ نکل جاؤ۔ ورنہ گواہ بننا پڑے گا۔ اور عدالت میں جو درگت گواہ کی ہوتی ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ بنوکدنذر نے دجلے پر بند تعمیر کیا۔ بہت سی نہریں کھدوائیں۔ جہاں اس میں کئی خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا۔ وہ یہ کہ ہر وقت وہ بابل ہی کی توسیع کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ باقاعدہ آباد کر کے بسے بسائے شہر کو تین مرتبہ پھر بسایا۔ نئے محل بن رہے ہیں۔ عمارتیں ڈھا کر سڑکیں چوڑی کی جارہی ہیں۔ بلکہ اچھی بھلی سڑکوں کے اوپر بلاوجہ نئی سڑکیں بن رہی ہیں۔ رعایا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور شہر کی سطح اُونچی ہوتی گئی شاید گمنامی سے بچنے کے لیے اس نے ہر اینٹ پر اس قسم کے فقرے لکھوائے۔۔۔

”میں شاہ بنو پلیسر کا بیٹا شاہ بنوکدنذر حکمران بابل ہوں۔“

”کیا میرا تعمیر کردہ بابل دنیا کا عظیم ترین شہر نہیں ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔

یہ اینٹیں اب بھی موجود ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے سیّاح اور مؤرّخ کافی جلد متاثر ہوئے۔ زینوفن متاثر ہوا۔ پھر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس بھی (ہیروڈوٹس بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا تبھی اسے بابائے جھوٹ بھی کہا جاتا تھا۔ مثلاً اس نے

MARATHON کی مشہور لڑائی میں شکست خوردہ ایرانیوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی ہے۔ لیکن چند سال گزرے وہاں فوجی مشقیں ہوئیں تو مراتھان کے پورے میدانِ جنگ میں ایک بریگیڈ بھی اچھی طرح نہیں آسکا)۔ مگر اس ساری تشہیر کے باوجود فاتح کچھ اتنے متاثر نہیں ہوئے۔ ایرانیوں کے بنائے ہوئے طاقِ کسریٰ میں بھی یہی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ عربوں نے بھی تعمیر کے سلسلے میں بنوکدنذر کے شہر کا ملبہ استعمال کیا۔

بہرحال اتنی ساری اینٹوں پر آٹوگراف کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلدانیوں کے دیگر بادشاہوں کے پیچیدہ سے ناموں سے لوگ مانوس نہیں ہوئے، البتہ بنوکدنذر کو سب پہچانتے ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ اگر آج فرعون اپنے وطن مِصر میں آئیں تو اپنے پُختہ اہرام، مجسمے اور مندر دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے لیکن دجلہ و فرات کے قدیم بادشاہ اپنے دوآبے میں آئیں تو انہیں سخت مایوسی ہو گی۔ کیونکہ اُن کے دور کی ایک نشانی بھی تو باقی نہیں رہی۔ مصر میں پتھر تھا اور یہاں فقط اینٹیں تھیں وہ بھی آدھی کچّی آدھی پکّی۔ اور ساتھ ساتھ حملہ آوروں اور سیلابوں کی یلغار۔ مصری الگ تھلگ رہتے تھے اس لیے خوش تھے۔ انہیں مذہب اور اگلی زندگی کا شروع سے خیال تھا

(مِصری بلّیوں کو تبرّک مانتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حملہ آور جو کافی عقلمند ہوں گے، چار پانچ ہزار بلّیاں ساتھ لے آئے اور جنگ شروع ہوتے ہی بلّیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا تو مصریوں نے لڑنے سے انکار کر دیا)۔

اب دوآبے کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا زوال ناگزیر تھا۔ تقریباً تین ہزار سال گزرے وہاں کے ایک شاعر کی نظم سے اس انحطاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نظم کا عنوان تھا۔ "قنوطیت"۔

ایک آقا اور اُس کا غلام آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔

خادم! کچھ کہوں؟

ارشاد! آپ فرمائیں گے، بجا فرمائیں گے۔

محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ضرور کیجیے حضور! محبت دکھ درد بھُلا دیتی ہے۔

نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔

بہت اچھا کیا! محبت تو ایک پھندا ہے۔

ایک بھیانک عمیق غار ہے اور عورت ایسی تیز تلوار ہے

جو قریب آجائے تو موت یقینی ہے۔

خادم! کچھ کہوں؟

فرمایئے۔ میں حضور سے متّفق ہوں،

مقدس پانی لاؤ۔ عبادت کروں گا۔

ضرور کیجئے اور عبادت سے دل صاف اور دیوتا

خوش ہوتے ہیں۔

نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔

بہت اچھا کیا۔ بار بار گڑگڑانے سے دیوتا اکڑنے

لگتے ہیں اور پھر انہوں نے آپ کے لیے کیا کیا ہے

جو آپ احسان مند ہوں؟

خادم! کچھ کہوں؟

فرمایئے حضور! میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

غریبوں کو خیرات نہ دی جائے۔

ضرور دیجئے حضور! اس سے کئی گنا آپ کو واپس ملے گا۔

نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔

بہت اچھا کیا۔ سخی کا دیوالہ بھی نکل جائے تب بھی سائل مطمئن نہیں ہوتے۔ قبرستان میں جا کر دیکھیے سخی اور کنجوس ایک ہی زمین میں دفن ہیں۔

کئی موضوع آتے ہیں۔ لیکن یہ اکتاہٹ، یہ بیزاری نہیں جاتی۔ آخر طے ہوتا ہے کہ ہر شے بے معنی ہے، بیکار ہے۔ آقا تنگ آکر کہتا ہے

خادم کچھ کہوں؟

ارشاد! میں حضور سے متّفق ہوں۔

اگر یہی زندگی ہے تو کیا کریں خودکُشی کرلیں؟

ہم مجبور بندے ہیں۔ آج تک کسی نے دنیا کو بھی

محیط کیا ہے؟ انسان کو بھی چھُوا ہے؟

اچھا تو پھر آج میں تمہیں مارتا ہوں۔ بعد میں خود مرجاؤں گا۔

بجا فرمایا جناب نے۔ لیکن یہ خادم اپنے آقا کو دنیا

کی مصیبتیں برداشت کرنے کیسے چھوڑ جائے؟ کیوں نہ

ہم دونوں اکٹھے چلیں؟؟

کلدانیوں نے اُرہی بسایا تھا جو حضرت ابراہیم کا گاؤں تھا اور جہاں انہیں خدا تعالیٰ

کی موجودگی کا خیال آیا۔ اُرہی سے وہ اپنے طویل سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ (مغربی مؤرخوں نے شام اور دیگر ملکوں کے سفر کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن عرب جانے کے بارے میں عموماً خاموش رہتے ہیں)۔

اس مرتبہ جو حملہ آور آئے تو انہیں کلدانیوں سے کوئی خاص دُشمنی نہ تھی اور نہ نئے دارالحکومت کی تلاش۔ چنانچہ اخامینین (جنہیں ہیخامنشی بھی کہا جاتا ہے) بابل کے پندرہ بیس ہزار آدمی مار کر، دس بارہ مندر اور سات آٹھ محل وغیرہ تباہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ دراصل اخامینین لوگوں نے اپنی اصلی قوّت اور سارا جوش وخروش یونانیوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا(جس کا بدلہ بعد میں سکندر یونانی نے لیا)۔

ملک کی حالت بُری نہیں تھی۔ اصلاحات وغیرہ کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، مگر حملہ آور جو ایران سے آئے تھے اہلِ بابل کی بہتری وبہبودی کے خواہاں تھے (جیسے کہ سب حملہ آور بیان دیا کرتے ہیں)۔

انہیں جب کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو نہ ملی تو ناچار دُنیا کی پہلی گھوڑا ایکسپریس شروع کی۔ جگہ جگہ گھوڑے بدلے جاتے اور ایلچی ڈاک لے کر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ سات آٹھ دن میں طے کرتے۔ (ایلچی بھی بدلے جاتے ہوں گے) ساتھ ساتھ آدابِ محفل تکلّفات اور مسجع و مقطع عبارت کا رواج شروع ہوا۔ مُدّتوں بعد جب چنگیز خاں نے ایک ایرانی کاتب سے کسی گورنر کے نام مختصر سا حکم نامہ لکھوایا تو کاتب فوراً دوسرے صفحے تک پہنچ گیا۔ چنگیز کو شُبہ ہُوا اور بولا پڑھ کر سناؤ۔ کاتب نے بخدمت جناب، عالی مآب، بلند اقبال، حضور گورنر صاحب سے شروع کیا تھا۔ مزاج گرامی، موسم اور کُنبے کا حال پوچھنے کے بعد درخواست کرنے لگا تھا کہ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو ناچیز حقیر چنگیز کی اس معمولی سی گزارش پر غور فرمایا جائے۔ چنگیز جو مختصر چنگیزی حکم کا عادی تھا آگ بگولہ ہو گیا۔ کاتب کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ چنگیز نے آداب و القابات فوراً بند کرا دیئے جو اس کے جانے کے بعد فوراً واپس آ گئے۔ چنگیز نے یہ بھی نوٹ کیا ہر شام لوگ شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مہینے میں تین دفعہ سے زیادہ مدہوش ہونا جُرم ہے۔ اُس کے جانے کے بعد یہ حکم بھی ختم ہو گیا)۔

سکندرِ اعظم پہلی مرتبہ بابل آیا تو دارا کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ وہ دارا نہیں تھا جس کی

فتوحات مشہور ہیں۔ کتنے دِن آپ جیا کس لیے دارامارا۔۔۔ والا بادشاہ داراسوئم تھا جس کے دربار میں بے شمار خواجہ سرا تھے۔

سکندر جلدی میں تھا اس لیے بابل میں زیادہ نہ ٹھہر سکا (اگرچہ فوجی پریڈ اور سفیروں سے ملنے کے لیے اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا تھا۔ البتّہ جب ہندوستان سے واپس آیا تو فرصت ہی فرصت تھی لیکن اس عرصے میں پہلے سے کافی بدل چکا تھا۔ اب ایرانی لباس پہنتا۔ بات بات پر بگڑ جاتا۔ وہمی بھی ہو گیا تھا۔ جب اس کے اُستاد ارسطو کے پوتے کیلستھینز نے اِسے مشرقی انداز میں سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے مروا دیا۔ اس سے پہلے اپنے جگری دوست اور مُحسن کلائی ٹس کو غصّے میں آکر خود اپنے ہاتھوں قتل کر چکا تھا۔

دجلہ عبور کیا ہی تھا کہ بابل سے وفد آیا اور درخواست کی کہ دیوتاؤں کی طرف سے اشارہ ہوا ہے کہ آپ مغرب کی جانب نہ آئیں۔ کئی یونانیوں نے بھی پیشگوئی کی کہ یہ سفر آخری سفر ہے۔ سکندر بابل پہنچا تو فصیل پر کوّے لڑ رہے تھے۔ ایک کوّا سکندر پر ِگر پڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا کہ بُرا اشگون ہے۔ اتنا واویلا مچا کہ سکندر شہر میں داخل نہیں ہوا۔ کبھی دریا کے کنارے کیمپ لگاتا۔ کبھی کشتیوں میں اِدھر اُدھر پھرتا رہتا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ ذرا ذرا سی بات منحوس بن جاتی۔ ہر واقعے سے بد شگونی اخذ کی جاتی۔ شروع شروع میں اس نے ایسے بد گو لوگوں کو زدو کوب بھی کیا لیکن اس قماش کے انسان کبھی باز نہیں آتے۔ ان سب نے مل ملا کر سکندر کو یقین دلا دیا کہ آخری وقت قریب ہے۔

پھر جون کے مہینے میں بخار چڑھا۔ بخار پہلے بھی کئی مرتبہ چڑھا تھا لیکن تب اسے ایسی اوٹ پٹانگ پیشگوئیوں پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا۔

نقّاہت بڑھتی گئی۔ مرنے سے پہلے ساری فوج بسترِ مرگ کے قریب سے گزری۔ سکندر نے ہاتھوں سے ہر سپاہی کے سلام کا جواب دیا۔

پردیکاس نے مُہر نکالی اور پوچھا۔ ”شاہی مُہر کسی کمانڈر کو دی جائے؟“

”جو سب سے دلیر اور قوّی ہو۔۔۔۔اُسے۔“ یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

مغرب کے وقت سکندر انتقال کر گیا۔ چند روز بابل کے باشندے سہمے سہمے رہے کہ اب کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس جوانا مرگ فاتح کو بھول گئے جس نے اس زمانے کی دریافت شدہ دنیا کا بیشتر حصّہ فتح کر لیا تھا۔ اس زمانے میں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو۔ پھر بھی سکندر کا نام ہر شہر

قصبے میں بچّے بچّے کی زبان پر تھا۔ سکندر کو یاد کر کے جولیس سیزر اپنے گنجے سر پر ہاتھ مار کر کہا کرتا۔۔۔ ”میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ اس عُمر میں سکندر دنیا فتح کر چکا تھا۔“

سکندر کے جانشین سیلوکس نے سکندر کے آباد کیے ہوئے اٹھارہ اُنیس اسکندریہ دیکھے تھے۔ وہ مدّت سے انتظار کر رہا تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی بسائے۔

اس نے بابل کو خیر باد کہا اور فوراً دجلہ کے کنارے اپنا سلوکیا آباد کیا۔ لیکن یہ شہر زیادہ دیر تک نہیں چلا۔ دراصل سکندر کی عظمت سے سیلیوکس کا تحت الشُعور بالکل تباہ ہو چُکا تھا۔

یونانیوں نے دجلہ عبور کیا تھا اس لیے یہ ناممکن تھا کہ رومن پیچھے رہ جاتے۔ ویسے بھی اپنی تہذیب و تمدّن کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں پر حملہ کرنا دونوں کی پرانی عادت تھی۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی انتہائی شرافت تھی ورنہ پسماندہ ملکوں کو کون پوچھتا ہے لہٰذا مجبوراً انہیں دجلہ و فرات کی وادی میں آنا پڑا۔

ویسے اس زمانے میں چین اور ہندوستان سے اس دوآبے کے راستے گرم مصالحے، ریشم اور خوشبوئیں روم بھیجی جاتی تھیں۔

تب مؤرّخ PLINY نے لکھا تھا۔ ”آج کل روم میں لونگ، جائفل، دار چینی اور کالی مرچوں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ ادھر عورتیں ریشم اور سُرمے کی منتظر رہتی ہیں۔“

سلطنت روما کے اس رپورٹر نے اس سالانہ رقم کا بھی ذکر کیا ہے جو رومن لوگ گرم مصالحوں اور سامانِ آرائش پر صرف کرتے تھے۔۔ یعنی تقریباً دس گیارہ لاکھ پونڈ کے لگ بھگ رومن کرنسی (ان دِنوں بھی کُچھ کم خرچ نہیں ہوتا)۔

کہتے ہیں کہ رومن بادشاہ تراجن کو سکندر ثانی بننے کا بڑا شوق تھا۔ (یوسف ثانی بننے کی خواہش نے بہتروں کو خوار کیا ہے)۔

تراجن اسی راستے سے آیا جس سے سکندر آیا تھا۔ بالکل اسی سٹائل سے لڑتا ہوا دوآبے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے یاد آیا کہ سکندر ثانی بننے کے لیے ہندوستان پر بھی حملہ کرنا ہوگا۔

بیماریوں اور گرمی سے فوج کی بُری حالت تھی لیکن بادشاہ کے حکم پر حملے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ آخر وہی تراجن جس نے ڈینیوب کے کنارے چٹانوں پر جگہ جگہ یہ الفاظ کھدوائے تھے۔۔۔ ”اس کٹھن علاقے کے سرکش اور جنگجو

قبیلوں کو شہنشاہ تراجن نے اپنی تلوار سے زیر کیا" (یہ چٹانیں اور الفاظ اب تک موجود ہیں)۔ وہ تراجن خلیج فارس کے ساحل پر بھوں بھوں کر کے رو دیا۔ بادشاہ کے رونے کا ذکر مؤرخین نے بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ (واپس وطن جاتے وقت غالباً تراجن کو یہ اطمینان ضرور ہو گا کہ وہ پہلا رومن بادشاہ تھا جو اس علاقے میں تہذیب پھیلانے گیا تھا)۔

ساسانی اپنے عروج کے لیے کافی عرصے سے منتظر بیٹھے تھے۔ چنانچہ وہ سٹیج بھی آئی جب دجلے کے کنارے خسرو اعظم اپنے محل طاقِ کسریٰ میں سارے غیر ملکی سفیروں کو اکٹھا کر کے اپنی عظمت کے قصّے سُناتا۔ (سفیروں نے کہانیاں اتنی مرتبہ سُنی تھیں کہ انہیں کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ سچی ہیں)۔

طاقِ کسریٰ کی محراب اتنی اونچی ہے کہ آج تک اسے دنیا کی بلند ترین محراب کہا جاتا ہے۔ (نہ جانے اس میں کیا کشش تھی کہ ہر ایک کا یہی جی چاہتا تھا کہ اسے ڈھا

کر برابر کر دے۔ فتح کے بعد عربوں نے اسے مسمار کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن کسی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بعد میں خلیفہ منصُور نے قریب ہی بغداد بنانے کا پروگرام بنایا تو اینٹوں کے لیے اس محراب کو تڑوانا شروع کیا، لیکن فنانس والوں نے سمجھایا کہ اس طرح توڑ پھوڑ کر کے بیس میل سے اینٹیں منگوانے کی بجائے بغداد میں نئی اینٹیں بنانا سستا رہے گا۔ لہٰذا یہ محراب بچ گئی)۔

پھر ساسانی بادشاہ سردیاں یہاں گزارنے لگے اور گرمیاں ایران کے پہاڑوں میں۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ جب بادشاہ موسم کے اُلٹ پھیر میں دارالحکومت بدلنے لگیں تو ضرور کچھ ہو کے رہتا ہے۔ چنانچہ عرب آ گئے۔

خالد بن ولید نے تیرہ مہینوں میں پندرہ جنگیں لڑیں اور ہر بار فتح پائی۔

کچھ ساسانیوں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور خوش فہمی لے ڈوبی۔ ہرمز خالد سے لڑنے آیا تو بیشمار زنجیریں ساتھ لایا تاکہ سب قیدیوں کو پکڑ کر لے جانے میں آسانی رہے۔ دجلے کے کنارے آبلہ کے مقام پر نہ صرف ہُرمز کو شکست ہوئی بلکہ انہی زنجیروں سے ساسانی باندھے گئے۔ (جنگ قادسیہ میں ساسانیوں کا کمانڈر مشہور پہلوان رستم تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اکھاڑے کی پہلوانی ایک چیز ہے اور جنگ الگ چیز)۔ دلیری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ اصلی جنگ سے پہلے

SINGLES ہوا کرتے۔ کوئی سورما نکل کر مخالف کو للکارتا۔۔۔ ”ہل مبازر من کُم!“ یعنی کوئی ہے جو سامنے آئے۔ اُدھر سے بھی کوئی نکلتا۔ پھر دونوں فوجوں کے سامنے مقابلہ ہوتا۔

(یورپ نے نقل شروع کی تو DUEL رائج ہوئی۔ لیکن بعد میں انہوں نے ڈوئل کا مذاق بنا لیا اور جرمنی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نکلنے لگے۔۔۔ 'بہادرو! چہرے پر ڈوئل کے نشان لگوانا چاہتے ہو تو ہمارے سرجن کی خدمات حاضر ہیں جو آپ کے ماتھے یا رُخسار پر تلوار کے زخم بڑی مہارت سے بنا دے گا۔ ان دِلوں یورپ میں چاروں طرف یہ بانکے سورما جو KNIGHTS کہلاتے تھے پھیل گئے۔ ان میں سے بیشتر جعلی یعنی Bogus تھے۔ پبلک ان سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔ آخری ہسپانوی مصنّف CERVANTES کو DON QUIXOTE لکھ کر اِن سورماؤں اور شولری کی پیروڈی کرنی پڑی جس کا اثر خاطر خواہ ہوا اور شولری ختم ہو گئی۔

اس زمانے میں بادشاہ لڑتا تو اگلی صف میں ہوتا تا کہ سپاہیوں کے حوصلے بلند رہیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے یا مر جانے سے جنگ پر فیصلہ کُن اثر تھا۔ لیکن بعد میں بادشاہ غالباً اس لیے پچھلی صفوں میں رہنے لگے کہ کہیں ان کی موت پر اگر بد

دل ہو کر بھاگ نہ نکلے۔

عرب فاتح جلدی میں تھے۔ دوآبے کو عراق عرب اور عراق عجم میں بانٹ کر، بصرے اور کوفے میں چھاؤنیاں بنا کر تیزی سے شمال کی طرف نکل گئے۔

آرمینیا اور کاکیشیا میں عرب سپاہیوں نے پہلی مرتبہ سنہرے اور سُرخ بالوں والی لڑکیاں دیکھیں۔ بعد میں کاکیشیا کے پہاڑ کوہِ قاف اور یہ لڑکیاں کوہِ قاف کی پریاں مشہور ہوئیں۔ عربوں کی سلطنت پھیلتی گئی اور رومن سلطنت سے بھی بڑھ گئی۔

عرب خانہ بدوش تھے۔ اُونٹ کے بالوں سے بنا ہوا خیمہ ان کے لیے بہترین عمارت تھی۔ ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ عرب اپنے خیموں کے لیے مفتوحہ علاقے کی نفیس ترین عمارتوں کے شہتیر کھینچ لیا کرتے تھے۔

ابنِ خلدون نے بڑی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آرٹ کبھی تخلیق نہیں ہوتا جب تک کہ آرٹسٹ نہ ہوں۔۔۔ اور یہ کہ قوم بننے میں تین پُشتوں کا عرصہ یعنی تقریباً نوّے سو برس لگتے ہیں۔۔۔۔ اور فقط جفاکش اور جنگجو قوم ہی حکومت کر سکتی ہے۔ فتح کے بعد جب جاہ و حشمت اور مال و دولت اس قوم کو تن آسانی اور آداب و تکلّفات کی طرف لے جاتے ہیں تو فوراً کوئی توانا اور جیالی قوم ان سے

حکومت چھین لیتی ہے۔۔۔ اور یہ کہ مفتوح قوم فاتحین کی ہر بات کی نقل کرتی ہے۔ ہارے ہوئے لوگ فاتحین کا لباس، ان کی غذا، رسمیں، آداب، ہر چیز غیر شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں کہ شاید ان ہی کی بدولت جیتنے والوں نے انہیں شکست دی تھی۔

کھلی ہوا میں رہنے والے عربوں کو فتوحات شہروں اور قصبوں میں لے آئیں تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ پریشانی بجا تھی۔ کیونکہ آبادیوں میں کاشتکاری ہوتی تھی۔ پانی کی وجہ سے مچھر تھے جن سے بخار چڑھتا تھا اور شہروں میں شور و غُل تھا اور طرح طرح کی بیماریاں تھیں۔

خلفائے بنی اُمیّہ دمشق میں رہے لیکن صحراؤں اور نخلستانوں کی محبّت ان کے دِل سے نہ گئی۔ شکار یا دورے کے بہانے وہ اکثر ریگستانوں میں نکل جاتے۔ ان کے صحرائی محلوں کے آثار اب تک موجود ہیں لیکن عباسیوں نے بغداد بسا کر مکمل طور پر شہری سکونت اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ بود و باش طرزِ تعمیر، ہر چیز پر ساسانی رنگ آگیا۔ دیوانِ عام کی جگہ دیوانِ خاص نے لے لی۔ افسروں سے ملنے سے پہلے درخواست دینی پڑتی تھی اور ان کے سامنے درباری آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔

پھر بغداد بین الاقوامی شہر بن گیا۔

ہارون الرشید نے یورپ کے شارلمین کو ایک کلاک اور ہاتھی بھجوایا۔ مؤرّخ لکھتے ہیں کہ ہاتھی نے ۸۱۰ء میں جرمنی میں انتقال کیا (شارلمین کا انتقال بعد میں ہوا)۔

ہارون الرشید نے بازنطینیوں سے بھی جنگیں لڑیں۔ بازنطینی ہر بار صلح کر لیتے اور عرب فوج کے واپس بغداد پہنچنے سے پہلے صلح نامہ منسوخ کر کے پُرانی حرکتوں پر اُتر آتے (شاید اس لیے کہ یہ فاصلہ کافی طویل تھا اور کئی مہینوں میں طے ہوتا تھا)۔ عرب پھر حملہ کرتے۔ ایک اور صلح نامہ ظہور میں آتا جس کے بعد فوراً بازنطینی لڑکیوں کی شادیاں عربوں سے کی جاتیں (یہ موقع شناس لڑکیاں بڑے سلیقے سے سُسرال والوں کو رواداری کی تلقین کرتیں)۔

ایرانی سِول عہدوں پر تھے۔ عراقی تجارت یا طالب علم۔ اس لیے خلیفہ معتصم نے مجبوراً غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس نئی فوج کے لیے جو مملوکوں اور وسط ایشیا کے قبائلیوں پر مشتمل تھی، ساٹھ میل اُوپر دجلے کے کنارے سامرہ آباد کیا گیا جو بعد میں دارالخلافہ بن گیا۔ اِن دِنوں ریت سے اٹا ہوا سامرہ ہوائی جہاز سے بالکل ایک ماڈرن شہر دکھائی دیتا ہے۔۔۔ اس میں RACE COURSE بھی ہے۔ شاپنگ سنٹر ہیں۔ اور ماڈل ٹاؤن بھی۔ یہاں

دائرہ، اُدھر مربعہ، وہاں تکون۔۔۔ جگہ جگہ جیومیٹری کے خطوط نظر آتے ہیں۔

مؤرّخوں کا کہنا ہے کہ سامرہ کے بسنے کے ساتھ ہی خلافت کا زوال شروع ہو گیا۔

ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن آج تک جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں دو تین سو برس سے زیادہ نہیں رہیں۔ شاید قدرت نے اتنی ہی عُمر مقرر کر رکھی ہے۔ اس کے بعد اقتدار کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہانے سیکڑوں بن جاتے ہیں۔۔۔ باہمی خانہ جنگی کسی نئی قوم یا فرقے کا عروج، بعض اوقات تو کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی۔ سلطنتِ روما کے زوال پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل ہوا کیا تھا۔ کئی سلطنتیں تو بڑی بڑی جنگیں جیتتے جیتتے ختم ہو جاتی ہیں۔

تیرہویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے سولہ لاکھ کو قتل کیا۔ دریا رواں رہے۔ نہریں بہتی رہیں۔ لیکن ہَل چلانے والا کوئی نہ رہا۔ زرخیز زمین دوبارہ بنجر ہو گی (بیسویں صدی کے شروع میں مشہور ماہر سر ولیم وِلکاکس نے حکومت تُرکیہ کو رپورٹ بھیجی کہ عراق میں نئی نہریں کھودنے کی بجائے اَٹی ہوئی قدیم نہروں کو ٹھیک کر لیا جائے)۔

تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا۔ آخر خلافت بغداد سے قاہرہ منتقل کی گئی اور وہاں

سے قسطنطنیہ۔ اور پھر خلافت بالکل ختم ہو گئی۔

خلافتِ بغداد کو تباہ کرنے کے بعد ہلاکو کی اولاد نے پچاس سال کے اندر اندر اسلام قبول کر لیا۔ پھر ایرانی آ گئے۔ ان کے بعد ترک آئے جو کئی سو برس رہے۔ اُن ہی دِنوں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بصرے میں دفتر کھول لیا۔

رائل نیوی کا ایک جہاز SEA HORSE بصرہ پہنچا۔ اس کا ایک جہازراں گرمی کی شدّت سے اس قدر نڈھال رہنے لگا کہ ڈاکٹری مشورے پر مجبوراً اسے واپس انگلستان بھیجنا پڑا۔۔۔ یہ NELSON تھا جو بعد میں لارڈ نیلسن بنا۔

پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ تُرکوں کے خلاف لڑے۔ جب انگریز جنرل امین بی ALLENBY دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے اَل نبی! اَل نبی! کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا۔

۱۹۱۹ میں برطانوی ایجنٹ GERTRUDE BELL نے بغداد سے اپنے رشتہ داروں کو خط میں لکھا کہ "آپ حیران ہوں گے کہ مَیں بغداد میں اتنی مقبول ہوں کہ سب مجھے اُمّ المومنین کہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں میرا قیام بے حد ضروری ہے۔

فی الحال میں انگلینڈ نہیں آسکتی۔“

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی وقفے کے حالات ذرا پیچیدہ ہیں اور انہیں فقط سیاست دان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بغداد کا شہر دجلے کے ساتھ ساتھ یوں چلا گیا ہے کہ اس کے عرض و طول میں ایک اور تیرہ کی نسبت ہے۔ فقط شمالی حصّے کاظمین میں کہیں کہیں قدیم شہر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ورنہ بالکل بغداد الجدید بن چُکا ہے۔ پُرانی عظمت کی نشانیاں گِنی گِنائی رہ گئی ہیں۔ مُنہدم محل، چند مینارے یا وہ زمین دوز لائبریری جس میں ہلاکو نے دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا۔

مشہور جغرافیہ دان یعقوبی نے لکھا کہ خلیفہ منصُور دورے پر تھا کہ ایک گاؤں کے پاس رُکا اور اپنے ہمراہیوں سے گویا ہوا۔۔ ”یہ گاؤں بہت بڑی تجارتی منڈی بن سکتا ہے۔ دجلے کے ذریعے آرمینیا اور آذربائیجان سے سامان آئے گا اور فرات کے ذریعے شام، مصر اور شمالی افریقہ سے۔ ہند اور چین کے جہاز یہاں لنگر انداز

ہوں گے۔ اصفہانی اور خراسانی تجار سڑکوں سے پہنچیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے اہم شہر کا بسانا میرے سپرد ہوا ہے ورنہ مجھ سے پہلے کتنے یہاں سے گزرے اور کسی کو خیال تک نہ آیا۔"

منصُور نے دجلہ کے مغربی کنارے پر مدینۃ السّلام کی بنیاد رکھی۔ شہر آباد ہوا تو لوگ اسے منصوریہ کہنے لگے۔منصور کا شہر تھا تو دجلے پر لیکن پانی فرات سے آتا تھا)۔ پبلک نے فوراً سیٹیلائٹ ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن بنائے۔ مشرقی کنارے پر مہدیہ آباد ہوا پھر رصافہ۔۔۔ دیکھتے دیکھتے منصُور کا اصلی شہر بالکل گُم ہو گیا۔

لفظ بغداد کو کچھ لوگ تو نوشیر واں کے پرانے شہر باغِ داد سے ملاتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ بابل کے وقتوں میں یہاں ایک گاؤں بغدادُو آباد تھا۔

جب معتصم نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لیے سامرہ بسایا تو بغداد کی اہمیت کم ہو گئی (معتصم کے زمانے میں ہندوستان سے تقریباً سترہ ہزار جاٹ بغیر بُلائے یا اطّلاع دیئے آ گئے تھے۔ عربوں نے انہیں الزط کہا اور ان کی الٹی سیدھی حرکتوں سے تنگ آ کر سلیشیا کی سرحد پر بھیج دیا جہاں وہ خانہ بدوشوں میں غلط ملط ہو گئے۔۔۔ یا خانہ بدوش ان میں غلط ملط ہو گئے ہوں گے)۔

خلیفہ المتوکل نے سامرہ میں پونے تین سو گز لمبی اور پونے دو سو گز چوڑی مسجد تعمیر کی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ مسجد سے کہیں خوشنما اس کا مینار تھا جو بابل کے مینار کی نقل تھی۔ دو سو فٹ اُونچے مینار کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے سیڑھیوں پر مشتمل ایک بَل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی جس پر سوار گھوڑے سمیت اُوپر چڑھ سکتا تھا۔ یہ مینار اب بھی ہے لیکن کٹہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھتے وقت لوگوں کو چکر آتے ہیں۔

لیکن پھر المتوکل نے شمالی سمت میں ایک اور دارالخلافہ الجعفریہ تعمیر کر لیا تو سامرہ یکایک سنسان ہو گیا۔

نئ جبکہ دنگے فساد رہتے تھے۔ سال بھی نہ گزرا تھا کہ متوکل کو پھر سامرہ آنا پڑا اور وہاں سے پچاس سال اور آٹھ حکمرانوں کے بعد سب واپس بغداد آ گئے۔

بغداد نے بڑی ترقی کی۔ عرب ملّاح دُور دُور تک نکل گئے (چند سال ہوئے روس، سویڈن اور جرمنی کے ساحلی علاقوں میں قدیم عربی سِکّے ملے)۔

یونیورسٹیاں اور دارالحکما قائم ہوئے۔ یونانی علما کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ بغداد علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔

اس عہدِ زرّیں کے محققوں اور عالموں کے نام تاریخ کی دُھند میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔

بیسویں صدی میں سارٹن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخِ سائنس" میں الفارابی کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، ابو کامل (جس نے الخوارزمی کے الجبرے کی تکمیل کی) اور ابراہیم بن سنان کو سب سے بڑے ریاضی دان، المسعودی کو عظیم ترین جغرافیہ دان اور طبری کو سب سے ممتاز مؤرّخ قرار دیا ہے۔

عربوں کا رائج کردہ موتیے کا آپریشن اٹھارویں صدی تک جرمنی اور انگلستان میں مقبول رہا۔

یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترہویں صدی تک بو علی سینا اور رازی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

بو علی سینا کی معرکتہ الآرا تصنیف "القانون فی الطِّب" کو ڈاکٹر اوسلر نے طبّی انجیل کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی اور طبّی کتاب نے دنیا پر اس قدر اثر نہیں ڈالا جتنا کہ اس نے۔

اس زمانے کے جینئیس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے۔ بیک وقت سائنسدان،

مہدّس، فلسفی بھی ہوتے تھے۔ شاعری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا (آج کل کے انٹلکچوئل حضرات کی طرح نہیں کہ من ڈیڑھ من کتابیں پڑھ کر موٹی سی عینک لگائی، بال بڑھائے اور چڑچڑے بن کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی)۔ بغداد کی دھاک دُور دُور تک بیٹھ چکی تھی۔ یہاں سے حکم نامے جاری ہوتے تھے۔ خطابات عطا ہوتے تھے۔ شمس الدّین التمش نے ہندوستان سے اپنا نمائندہ بھیجا اور حکومت کرنے کی اجازت مانگی۔ جب خلیفے نے سیاہ عبا۔ انگوٹھی اور عصا بھیجے تب التمش نے اپنے نام کے ساتھ سلطان لگانا شروع کیا۔ مملوکوں نے خراساں فتح کیا تو خلیفے نے مبارکباد بھیجی اور یمین الدّولہ اور امین الملّت کے خطابات عطا فرمائے۔ بعد میں طغرل بیگ کو ملک الشرق والغرب کا اعزاز دیا (لیکن پتہ نہیں پبلک کو کیوں شُبہ ہے کہ اعزازات و خطابات محض انگریزوں نے شروع کیے تھے۔ مسلمانوں نے بھی تاج پہنے ہیں لیکن لوگ CROWN سے اب تک خفا ہیں)۔

بغداد میں کئی سیّاح گزرے۔ بارہویں صدی میں ابنِ جبیر آیا تو اسے گرد و نواح میں جگہ جگہ نہریں اور پُل ملے مگر بغداد میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ باشندے بھی

خشک سے لگے۔ لیکن وہ نسوانی حُسن سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے۔۔۔ ’’بغداد میں حُسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوفِ خُدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔‘‘

مارکو پولو نے پتہ نہیں کیوں موصل کے تجّاروں کو موصیلینی لکھا ہے (جو مسولینی سے ملتا جلتا ہے) اور بغداد کو بوداز، بصرے کو ملبصرہ اور ہلاکو کو الاؤ۔

افواہ ہے کہ مارکو پولو نے اس علاقے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سُنی سُنائی باتوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اس نے بغداد کے سامنے ایک بہت بڑے پہاڑ کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہاں اتنی سی پہاڑی بھی نہیں ہے۔ اور جو الاؤ کے حملے اور بوداز کی تباہی کی داستان بیان کی ہے وہ کسی سنسنی خیز جاسوسی ناول کا حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ اور مارکو پولو نے حقیقت نگاری تیرہویں صدی میں کی تھی۔ اس کے باوجود ابنِ بطوطہ کے سفر نامے کو مغرب میں شک و شُبے سے دیکھا جاتا ہے۔

ابنِ بطوطہ چودھویں صدی کے شروع میں اس طرف آیا۔ پہلے بصرہ پہنچا، پھر خلیج فارس کے ساحل پر۔ وہاں سے جب بغداد کا پروگرام بنانے لگا تو معلوم ہوا کہ اسی بصرے والے راستے سے دوبارہ گزرنا ہو گا۔ لہٰذا ایران کی طرف سینکڑوں میل کا فالتو چکر لگا کر بغداد پہنچا۔

"جس راستے سے ایک دفعہ گزر جاؤں اس پر دوبارہ قدم نہیں رکھتا۔۔۔" اس نے سفر نامے میں لکھا ہے۔ بغداد پہنچ کر دیکھا کہ قدیم عمارات مُنہدم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے غلط عربی بولنی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا کہ تاتاری اور تُرک حکمران فرمان جاری کرتے ہیں تو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ "سلطان اور خاتونوں (بیویوں) کے حکم سے جاری ہوا" (جیسے کہ دورِ جدید میں بھی ہوتا ہے)۔

ابنِ بطوطہ جیسا سیّاح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس نے جو سیاحت چودھویں صدی میں کی تھی اس پر بیسویں صدی میں بھی رشک آتا ہے۔ ایک دن گھر سے نکلا تو لگاتار بیس سال سیر کرتا رہا۔۔۔ مشرقِ وسطیٰ، ہندوستان، لنکا، چین، وسطِ ایشیا اور قسطنطنیہ دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو یاد آیا کہ سپین نہیں دیکھا اور افریقہ کے اندرونی علاقے بھی رہ گئے ہیں۔ چھ برس کے لیے پھر نکل گیا۔

بغداد میں اُن دنوں دو سلطان دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے قیام کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا کہ ان سلطانوں اور ان کی باہمی چپقلش کا۔ آخر ایک دن وہ سلطان ابوسعید (جس کی بیوی کا نام بغداد خاتون تھا) کے محلّے کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ محلّہ اُن دِنوں چلتے پھرتے کیمپ کو کہا جاتا تھا۔

دورانِ سیّاحت اس نے لیکچر دیئے۔ ملازمت کی۔ بادشاہوں کا سفیر بنا۔ جگہ جگہ

شادیاں کیں۔ لیکن جہاں کوئی باہر جانے والا قافلہ یا جہاز نظر آ جاتا فوراً رُتبہ، دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ساتھ ہو لیتا۔ سیاحت اسے سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھی۔

بصرے سے سند باد نکلتا اور خلیج فارس کا رُخ کرتا۔ اُن دِنوں سندھ السندھ تھا۔ ہندوستان الہند اور قلات کیکان۔ یہاں تک کہ دریائے اٹک نہرِ مہران تھا۔

نہ زرِ مبادلہ کی بندشیں تھیں اور غالباً CUSTOMS والے بھی اچھی طرح پیش آتے ہوں گے۔ تبھی سند باد اتنے سفر کر سکا ہو گا۔

ایک دن منصُور کسی مصنّف جعفر کی کتاب لایا جو الف لیلہ کی پیروڈی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ وہی جعفر ہے جو ہمارے ہاں جعفر ٹلّی کے نام سے مشہور ہے۔ ہمیں پہلے علم نہ تھا کہ الف لیلہ کی بھی پیروڈی ہو چکی ہے لیکن جعفر کی تحریروں میں وہی جانے پہچانے الف لیلوی کردار ملے۔۔۔ مثلاً ایک باغ میں کچھ لوگ پکنِک پر آئے ہوئے ہیں۔ دفعتاً ایک بیل بھاگا بھاگا آتا ہے جس کے تعاقب میں

ایک بوڑھا لگا ہوا ہے۔ باغیچے کو دیکھ کر تھکا ہوا بوڑھا ایک طرف بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگتا ہے اور بیل اگلے قطعے میں گھاس چرنا شروع کر دیتا ہے۔

لوگوں نے بوڑھے سے علیک سلیک کی کوشش کی لیکن اس نے مُنہ پھیر لیا۔ پھر کھانے کی دعوت دی۔ اس پر بھی خاموش رہا۔ آخر انہوں نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے بسورتے ہوئے جواب دیا کہ اس کی کہانی اس قدر غمناک ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہو گا۔

سب نے اصرار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں وزیر کی حسین و جمیل لڑکی پر عاشق تھے۔ لیکن لڑکی اتنی رحمدل تھی کہ کسی ایک سے شادی کر کے بقیہ دو شہزادوں کا دل دُکھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ تینوں لگاتار شادی کے طلبگار رہے اور لڑکی خاموش رہی۔

اتفاق سے تینوں شہزادے وجاہت، تعلیمی قابلیت، توانائی، شہ سواری، تیر اندازی اور فنِ سپہ گری میں ایک دوسرے کے ہمسر تھے۔ جب انہوں نے کام کاج چھوڑ کر آہ و بکا میں وقت ضائع کرنا شروع کر دیا تو بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور حکم دیا کہ اب شادی کا فیصلہ فوراً ہو جانا چاہیے۔ لیکن لڑکی بدستور خاموش رہی۔ اُدھر شہزادوں کی حالت اور خستہ ہوتی گئی۔ آخر بادشاہ کو طیش آیا اور اس نے وزیر کو

خبر دار کیا کہ اگر کل شام تک فیصلہ نہیں ہوا تو ایک نیا وزیر اس سے چارج لے لے گا۔ وزیر شہزادوں کو شہر سے باہر لے گیا۔ ان کا تحریری اور زبان امتحان لیا۔ تینوں برابر نکلے۔ پھر نیزہ بازی کرائی، چھلانگیں لگوائیں، دریا میں تیرایا۔ سارے جتن کیے لیکن اگلے سہ پہر تک تینوں کے نمبر یکساں تھے۔ کچھ اور ٹیسٹ بھی لیے مگر معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ جب سورج ڈوبنے لگا تو وزیر بہت گھبرایا۔ پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بچھڑا دکھائی دیا جو گھاس چر رہا تھا۔ وزیر نے بوکھلا کر نعرہ لگایا۔ 'جو اس بچھڑے کو پکڑ لے وہ جیت گیا۔'

تینوں شہزادے سرپٹ بھاگے۔ اُدھر بچھڑے نے ڈر کر زقند بھری اور تعاقب شروع ہو گیا۔ آگے گیلا کھیت تھا جس میں ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ پیچھے رہ گیا۔ پھر جنگل آیا۔ اس میں بچھڑے نے دونوں شہزادوں کو خوب چکر دیئے۔ اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک شہزادہ کسی اور رُخ میں نکل گیا۔ اب ایک شہزادہ رہ گیا جو پوری مستعدی سے تعاقب کر رہا تھا۔ اُدھر بچھڑا تھا کہ قریب نہ آنے دیتا تھا۔۔۔۔ "وہ دن اور آج کا دن مدّتیں گزر چکی ہیں۔۔۔ وہ بچھڑا پورا بیل بن چُکا ہے اور آپ کے سامنے گھاس چر رہا ہے۔ میری بھی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن تعاقب جاری ہے۔"

سب نے دیکھا کہ بیل گھاس چرنے کے بعد تازہ دم ہو کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اچھا تو خدا حافظ!" بوڑھے نے نعرہ لگایا اور بیل کے پیچھے ہو لیا۔

یہ اور ایسی کئی کہانیاں ہم نے پڑھیں۔

ایک دن میں اور دو مقامی حضرات ڈیوٹی سے واپس کیمپ آ رہے تھے۔ یکا یک انہوں نے گھبرا کر بتایا کہ ہم شدید خطرے میں ہیں۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

مَیں نے لاری کی رفتار تیز کرنی چاہی تو انہوں نے چلتی لاری سے کُودنے کی دھمکی دی۔ آخر رُکنا پڑا۔ چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

وہ دونوں جھاڑیوں میں چھُپ چکے تھے۔ میں نے ایک ٹیلے کے اُوپر لاری چڑھانی چاہی تا کہ اُونچی جگہ سے اچھی طرح دیکھ سکیں۔

"آگے مت جاؤ۔۔۔ خطرہ ہے!" وہ دونوں چلّائے۔

ٹیلے کے اُوپر چڑھ کر دیکھا تو دور ایک وادی سی نظر آئی جہاں کچھ درخت اور خیمے

تھے۔ ایک طرف سے غبار اُٹھا۔ نعرے سنائی دینے اور گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ریت کے بادلوں میں سب کچھ چھُپ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کچھ سوار بندوقیں لہراتے ہوئے تیزی سے ایک طرف نکل گئے اور غدر سا مچ گیا۔ پھر دس بارہ اُونٹ اور پانچ چھ گھوڑے دوسری سمت میں جاتے دکھائی دیئے۔ چند گولیاں چلیں اور گرد کے غبار میں سوار اور بھیڑیں نظر آئیں۔ کبھی اُونٹ اور آدمی سامنے آجاتے، کبھی بھیڑیں اور آدمی تو کبھی اُونٹ اور بھیڑیں۔۔۔ ساتھ ساتھ نعرے اور گولیوں کی آواز۔ پھر یہ سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد حب گرد صاف ہوئی تو ایک طرف اُونٹ کھڑے تھے۔ دوسری طرف بھیڑیں۔ اور آدمی گھوڑوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ کوئی زخمی نظر آیا نہ کسی کا انتقال ہوا تھا۔

کیمپ پہنچ کر یہ واقعہ منصُور کو سُنایا۔ وہ حقارت سے بولا۔ ''شہری ہوں گے۔ یہ لوگ ڈینگیں مارنے کی غرض سے بناوٹی لڑائیاں سٹیج کرتے ہیں جو در حقیقت لڑائی کی پیروڈی ہوتی ہے۔ کبھی تمہیں پہاڑ کے باشندوں کی اصلی لڑائی دکھائی گے۔ تم یقیناً خوش ہو گئے۔''

روز مجھ سے کہنے لگا'' عجیب اتفاق ہے۔ پچھلے ہفتے تم نے الف لیلہ کی پیروڈی پڑھی

تھی اور آج تم نے ایک اور پیروڈی کا نظارہ کر لیا۔"

"یہ فقط بغداد کے گرد و نواح ہی میں ہو سکتا ہے۔" منصُور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

اگلے سنیچر کی شام کو منصُور بھی ہمارے ساتھ بغداد گیا۔ آج خاص پروگرام تھا۔ پبلک کے پُرزور اصرار پر عفیفہ مجیدہ اپنے ہر دلعزیز نغمے سُنانے والی تھی۔

وہ مائکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں گانا کم تھا او مٹکنا اور تھرکنا زیادہ۔

مجید کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چُست۔ بازو تھرکتے، گردن ہلتی، کمر مٹکتی۔ سارا جسم بَل کھاتا اور کبھی کبھی نغمے کا کوئی چھوٹا سا مصرعہ بھی زبان پر آجاتا۔

"کیا جذبات ہیں! واللہ! کیا اظہار ہے۔۔۔!" جرجیس جھوم جھوم جاتا۔

"کون سے جذبات اور کون سا اظہار؟" میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

"یہ دجلے کا رقص ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہو رہا ہے۔ واللہ!" جرجیس نے جواب دیا۔

گانا ختم ہوا تو خاموشی طاری ہو گئی۔ مجیدہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اب شاباش ملے گی۔ اُدھر سارا ہجوم ایک اور خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجیدہ سے کہیں تندرست و توانا تھی جس نے اور بھی زیادہ پھنسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور جو کسی موزوں کُرسی کی تلاش کے بہانے بالکل آہستہ آہستہ اِدھر سے اُدھر جا رہی تھی اور اُدھر سے اِدھر آ رہی تھی۔

جب وہ کہیں بیٹھ گئی تو ہجوم دوبارہ مجیدہ کی جانب متوجہ ہوا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر آرکسٹرا کے سامنے والی میز سے ایک فلک شگاف ڈکار بلند ہوئی۔

یہ ڈکار اس امر کا زندہ ثبوت تھی کہ کوئی صاحبِ دل کسی آرٹسٹ کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہ سکتا۔ مجیدہ نے بیزار ہو کر ایک اور لَے چھیڑی اور کمر کے پٹھوں کی ورزش شروع کر دی۔

باہر دو شیخ اپنے اپنے اُونٹوں سے اُترے۔ اندر آئے اور گانے والی کا بغور معائنہ

کیا۔ کھڑے کھڑے کچھ دیر اُسے تکتے رہے۔ پھر آپس میں ہاتھ ملا کر ایک نعرہ لگایااور اُونٹوں کی طرف چلے گئے۔

"انہوں نے کیا کہا تھا؟" روز نے پوچھا۔

"انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ الحمد للّٰہ عفیفہ مجیدہ ابھی تک فربہ ہے۔" منصُور نے بتایا۔

"ضرور دیہاتی ہوں گے۔"

ہم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سلیم چند چکنے چپڑے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سلیم بتانے لگا۔ "اس پہاڑیئے کا قصّہ تو سُننا ہو گا جو عبادت کر رہا تھا کہ اچانک کوئی مُسافر نظر آ گیا۔ فوراً عبادت ملتوی کر کے بندوق سنبھالی اور مسافر کو لوٹ لیا۔ واپس آ کر پھر عبادت شروع کر دی۔ کوئی مہذب شخص دیکھ رہا تھا۔ اس نے بُرا بھلا کہا تو پہاڑیئے نے خفا ہو کر جواب دیا۔ 'یہ دین کا کام ہے اور وہ دنیا کا۔۔۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں'۔"

سلیم کے دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

منصُور نے جواب دیا"جی ہاں یہ قصّہ مَیں نے بھی سُنا ہے اور شہروں میں یقتل، قاتلون، مقتل والی گردان بھی سُنی ہے۔ ایک بالکل سچّا واقعہ بتا رہا ہوں۔ ایک شہری اور ایک دیہاتی چاء خانے میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً شہری کچھ دیکھ کر چونکا اور بولا۔۔۔'وہ دیکھو اس کونے میں میرا جانی دشمن چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہے'۔ دیہاتی کے تجسس پر اُس نے اشارے سے بتایا'میرا دشمن وہ ہے جس کی مونچھیں سیاہ ہیں۔' اتفاق سے ان پانچوں کی مونچھیں سیاہ تھیں۔'وہ جو موٹا اور گنجا ہے'۔ اس نے وضاحت کی لیکن وہ پانچوں موٹے اور گنجے تھے۔'وہ جس کی توند نکلی ہوئی ہے۔' اُدھر پانچوں کی توندیں نکلی ہوئی تھیں۔ آخر دیہاتی کو اپنا دُشمن دکھانے کے لیے شہری نے پستول نکالا۔ڈَذڈَذڈَذڈَذ کی آوازیں آئیں اور چشمِ زدن میں چار آدمی مرے پڑے تھے۔۔۔'وہ جو رہ گیا ہے وہ میرا دُشمن ہے اب سمجھے؟'شہری نے فاتحانہ انداز میں کہا۔۔"اس مرتبہ قہقہہ لگانے کی ہماری باری تھی

لیکن سلیم کے ایک اور دوست نے بات کاٹی۔۔۔"ویرانوں اور وسعتوں میں بسنے والوں کے دل ہمیشہ وسیع نہیں ہوتے۔ یہ سُنی سنائی نہیں ہے سچّا واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ صحرا کے ایک شیخ نے اپنے قبیلے کو کسی اور نخلستان پہنچانے کے سلسلے میں اپنے دوست سے اُونٹ اُدھار مانگے۔ جب جواب نہ آیا تو یاد دہانی کرائی۔ اس پر اطلاع آئی کہ اُونٹ تو اچھی حالت میں ہیں لیکن ان کی نکیل ٹھیک نہیں ہے ورنہ

ضرور بھیج دیئے جاتے۔ پہلا شیخ چپ ہو گیا مگر جب اگلے سال دونوں کی اتفاقاً ملاقات ہوئی تو بڑا اگلہ کیا کہ اے برادر کہاں اتنے قیمتی اُونٹ؟ اور کہاں چند سِکّوں کی نکیل؟ بھلا اس معذرت میں کوئی تُک بھی تھا؟ اس پر جواب ملا کہ یا برادر ایسے معاملوں میں اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جب نیّت نہ ہو تو بہانہ چھوٹا سا ہو یا بہت بڑا سمجھ لینا چاہیے۔"

اس پر منصُور نے جوابی حملہ کیا "شہری دکاندار صبح صبح مُنہ اندھیرے دودھ کے مٹکے میں پانی کی بالٹی ڈالنے لگا تو عادتاً دائیں بائیں جھانکا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس کے ایماندار ملازم نے اس کا مُنہ پکڑ کر آسمان کی طرف کر دیا اور مؤدبانہ عرض کی کہ دہنے بائیں تو کوئی ہو یا نہ ہو، اوپر والا ہمیشہ تکتا رہتا ہے۔ اس لیے اوپر بھی دیکھ لینا چاہیے۔"

مجیدہ کا گانا دفعتاً ختم ہو گیا۔ اندر ہال میں رقص شروع ہو چکا تھا اور لوگ اُس طرف جا رہے تھے۔ منصُور اور سعدہ کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چلے گئے۔

جرجیس تین پختہ عمر بنی ٹھنی خواتین کو لیے آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ جرجیس کی نئی محبوبہ تھی جو تین مہینے کی پروبیشن پر تھی۔

دراصل جر جیس کو فقط منگنی کا شوق تھا۔ جو لڑکی پسند آتی (اور اسے سب لڑکیاں پسند آجاتی تھیں) تو بار بار کہتا "بس تم میری منگیتر بن جاؤ۔ سدا محبّت رہے گی۔ بڑی قدر کروں گا۔ تم ہمیشہ میری عزیز ترین منگیتر رہو گی۔"

اور شادی سے اتنا ڈرتا تھا کہ جب لوئی زا سے بڑی مشکلوں کے بعد دوستی ہوئی اور دونوں اکٹھے نظر آتے تو روز ان کا ہمیشہ یوں تعارف کراتا "یہ ہے ہمارا دوست جر جیس اور اس کے ساتھ ہے اس کی ہونے والی مِس لوئی زا۔"

ایک شام وہ لوریتا کو ساتھ لایا "یہ ہے ہمارا دوست جر جیس اور اس کے ساتھ ہے آیندہ کی مِس لوریتا۔" روز بولا۔

اور جب کافی منت سماجت کے بعد دوناروزا آئی تو روز نے خوش ہو کر سب کو بتایا کہ اس وقت جر جیس کے ہمراہ مستقبل کی مس دوناروزا ہے۔

جر جیس نے پہلے تو اپنی نئی محبوبہ کی تعریف (اپنے مخصوص انداز میں) کی اور اس سے کہنے لگا "تمہارا منگیتر بڑا خوش نصیب ہے۔"

"مگر میری منگنی تو کہیں نہیں ہوئی۔" وہ شرما گئی۔

"تبھی تو خوش نصیب ہے۔" جر جیس نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"آج اس شدید قسم کے میک اَپ کی وجہ سے اتنی حسین معلوم ہو رہی ہو کہ پہلے تمھیں پہچان نہ سکا کہ یہ تم ہی ہو۔" وہ خاموش ہو گئی تو جر جیس نے ٹوکا۔ "کم از کم آدابِ مجلس کا ہی کچھ خیال رکھو۔ ابھی تم نے اپنی تعریف سُنی ہے۔ لہٰذا تھینک یو کہو۔۔۔"

روز نے جر جیس کی تینوں سہیلیوں کو غور سے دیکھ کر حساب لگایا اور اس کا کندھا ہلا کر بولا۔

"جانتے ہو؟ ان تینوں کی مجموعی عُمر تقریباً سوا سو برس ہو گی۔ اور تم صرف پچیس سال کے ہو۔"

"لیکن اگر ان کے جثے اور چہروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ خاصی کیوٹ ہیں۔ ویسے فی الحال میں ان تینوں میں سے دو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

روز نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور رقص کرنے چلا گیا۔

"جس لڑکی کو دیکھو کسی یورپین پر فریفتہ ہے۔۔" جر جیس نے جھلّا کر کہا۔

"روز انگریز ہے اور انگریز یورپین کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اتنی دیر کسی اور کے

ساتھ ناچ لو۔ "میں نے مشورہ دیا۔ لیکن وہ بار کی طرف چلا گیا اور جب غم غلط کر کے واپس لوٹا تو لڑکی پر برس پڑا۔ "یہ کیا حرکت تھی؟"

"حرکت ورکت کچھ نہیں تھی۔ ناچنا ہے تو چلو ناچتے ہیں، ورنہ اپنا راستہ لو۔" وہ بولی۔

جرجیس شام کو اسے چند قیمتی تحفے دے چکا تھا۔ اس لیے اپنا لہجہ بدلنا پڑا اور خوشامد شروع کر دی۔ "کاش کہ تمہیں احساس ہوتا کہ میں ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔"

"قاسم بھی یہی کہتا ہے۔" وہ بولی۔

"لیکن میں قاسم سے کہیں پہلے اٹھتا ہوں اور بہت دیر میں سوتا ہوں، لہٰذا تمہیں یاد کرنے کے گھنٹوں کا میزان کیا جائے تو میں جیت جاؤں گا۔۔۔ اور یہ قاسم ہے کون؟"

"یہ دیکھو۔۔۔ یہ آج ہی ملی ہے۔" اس لئے بایاں ہاتھ سامنے کر دیا۔ ایک انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔

"درمیانی انگلی میں انگوٹھی؟" روز حیران رہ گیا۔ "یہ انگوٹھی تو غلط انگلی میں ہے۔"

”منگنی بھی تو غلط آدمی سے ہوئی ہے۔۔۔ لیکن اگر یہ ہی ارادہ تھا تو تم نے مجھے غلط امیدیں کیوں دلائیں؟ اور دو ہفتوں سے میرے ساتھ کیوں پھرتی رہی ہو؟“

”میں قاسم کی محبت آزما رہی تھی۔“

”اس وقت تم دو انسانوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو اور ان میں سے ایک تم خود ہو۔۔۔“

”جرجیس! تمہیں کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا۔“

وہ اسے تعریف سمجھ کر مسکرانے لگا۔

لیکن لڑکی نے بات جاری رکھیں۔۔۔ ”کیونکہ تم پہلے ہی سے بے وقوف ہو۔“ ان کی تُوتُو مَیں مَیں شروع ہو گئی اور ہم باہر نکل آئے۔

منصُور ابھی تک بحث میں مشغول تھا۔ سعدہ بھی ساتھ بیٹھی تھی۔

وہ ایک اور واقعہ سنا رہا تھا۔ ”علی الصبح شہر میں یکا یک انقلاب آیا اور کافی غدر مچا۔ کسی ناکامیاب لیڈر کی ناکامیاب زندگی کو ختم کرنے کی ناکامیاب کوشش کی گئی۔ دوپہر کے بعد ایک اور انقلاب آیا۔ اسی افراتفری میں آدھی رات کے بعد جیل

کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں تین آدمیوں نے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کیا۔ چونکہ مکمل اندھیرا تھا اس لیے خاموش رہے۔ صبح کے دُھندلکے میں انہوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور گرفتاری کی وجہ پوچھی۔ ایک نے بتایا کہ مجھے اس لیے پکڑا گیا ہے کہ میں جبّار بن عطّار کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ مجھے اس لیے قید کیا گیا ہے کہ میں جبّار بن عطّار کا جانی دشمن ہوں۔ اب دونوں نے تیسرے سے پوچھا کہ آپ کی تعریف؟

'میں جبّار بن عطّار ہوں۔۔' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ حضرات یہ ہے شہروں کی سیاست۔۔۔ اگر اسے سیاست کہا جا سکتا ہے تو۔۔۔"

"لیکن دیہاتی اَن پڑھ ہیں۔" سلیم بھُنّا اُٹھا۔ "اور اَن پڑھوں کو نہ اچھّے بُرے کی تمیز ہو سکتی ہے اور نہ سچ جھوٹ کی۔"

"نہ ہمارے ہاں پولیس ہے نہ طرح طرح کے محکمے۔ پھر بھی ایمانداری اور انصاف ہے۔ شہری عدالت میں کوئی بڑی سے بڑی قسم کھا کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے لیکن اپنے گاؤں میں عزیزوں دوستوں کے سامنے غلط بیانی کافی مشکل چیز ہے۔ تبھی ہمارے ہاں پنچائیت منٹوں میں صحیح فیصلہ کر دیتی ہے۔ تمہاری خفیہ پولیس کی طرح نہیں کہ تین برس تک تفتیش ہوتی رہی۔ کیس ایک محکمے سے دوسرے اور

پھر تیسرے کے پاس جاتا رہا۔ آخر فائل میں یہ فیصلہ لکھا گیا کہ پوری تحقیقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"تمہارے امن و انصاف کے کیا کہنے؟ کسی صحرائی نے اپنے ہمسائیوں کی تعریف کی کہ بڑے نیک اور شریف ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر یہ درست ہے تو ہر وقت بندوق کیوں لیے پھرتے ہو؟ تو کہنے لگا کہ ہمسائیوں کو نیک اور شریف رکھنے کے لیے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ قبائلی ہر وقت بندوق کیوں لٹکائے پھرتے ہیں؟"

"اور شہری ہر وقت پستول کیوں چھپائے پھرتے ہیں؟" منصُور نے پوچھا۔

اتنے میں لوئی زا آگئی۔ جرجیس اسے دیکھتے ہی بھاگا بھاگا آیا لیکن تب تک روزا اسے رقص کے لیے بڑے ہال میں لے جا چکا تھا۔

جرجیس کو کوئی اور نہ ملا تو مجھ پر خفا ہونے لگا۔۔۔ "دیکھا تم نے؟ یہ انگریز ہر موقعے پر من مانی کرتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ رہ گئے تم، تو تم میں مشرقیت نام تک کو نہیں۔۔۔۔"

"کیا ہوا؟"

"انگلش منہ مروڑ کر انگریزوں کی طرح بولتے ہو۔ ایک لفظ پلّے نہیں پڑتا۔ چاء

انگریزوں کی طرح پیتے ہو۔ چھوٹی سی پیالی سے آدھ گھنٹے تک کھیلتے رہتے ہو۔ ناچنے بھی انہی کی طرح ہو۔ رقص نہیں پریڈ کرتے ہو۔ اور اپنے مشرقی ساتھیوں کا کوئی لحاظ نہیں۔ اس لیے کہ تمہارا نظریۂ حیات بھی انہی سے مِلتا جلتا ہے۔۔۔"

"یعنی۔۔۔؟"

"یعنی کہ میں خوبصورت یا بد شکل، نوعمر یا بوڑھی، یہاں تک کہ کالے چور کو بھی بہلا پھُسلا کر لاؤں تو روز اسے چھین کر لے جاتا ہے اور تم کچھ نہیں کہتے۔"

"لیکن وہ ایک یا دو ڈانس کے بعد اسے واپس بھی تو لے آتا ہے۔"

"مگر لے کیوں جاتا ہے؟"

"جرجیس تمہارے نام سے نسوانیت ٹپکتی ہے۔ ویسے بھی تم میں مردوں والی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جرجیس جیسے نام لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔"

لوئی زا واپس آرہی تھی۔ جرجیس سرپٹ بھاگا۔

اُدھر منصُور اور سلیم اینڈ کمپنی کی بحث جاری تھی۔

منصُور کہہ رہا تھا۔۔۔ "ہر ملک میں دو قسم کے باشندے ہوتے ہیں۔ شہری اور

دیہاتی۔ یعنی کسی بھی ملک میں ایک قوم نہیں دراصل دو قومیں رہتی ہیں۔“

مجھے دیکھ کر سلیم بولا ”آپ بھی کچھ کہیے۔ ہند کا کیا حال ہے ؟“

”ہند میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کم از کم چار پانچ دریا ہیں جو آپ کے دونوں دریاؤں سے کہیں چوڑے اور تیز رَو ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن آپ کے ہاں دجلہ ہے نہ فرات۔“

”اسے یہ بھی بتاؤ۔“ منصُور نے لقمہ دیا ”کہ ہند میں جب لوگوں کو جوش آتا ہے تو جلوس نکالتے ہیں۔ کھُلے میدانوں میں تقریریں ہوتی ہیں۔ پھر نعرے لگا لگا کر اور پیدل چل چل کر لوگ اتنے تھک جاتے ہیں کہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر سو جاتے ہیں۔ یہاں کے شہروں کی طرح نہیں کہ جب کچھ ہونا ہو تو پہلے سناٹا چھا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر مکمل خاموشی میں دفعتاً ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ بعد میں مدّتوں پچھتاتے ہیں۔ صدیوں سے یہاں یہی ہوتا آرہا ہے۔“

اچانک سب کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ جر جیس کو چڑھ رہی تھی۔ وہ سلیم سے تین چار مرتبہ اس طرح مِل چکا تھا جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اب وہ سلیم سے

پانچویں دفعہ بڑے تپاک سے مل رہا تھا۔ ''آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی۔ میرا نام جرجیس ہے۔ آپ کی تعریف؟''

پھر جرجیس نے ہم سب سے باری باری پہلی مرتبہ ملنا شروع کیا اور اپنا تعارف کرا کے رسمی گفتگو شروع کر دی۔

جرجیس اوٹ ہو چکا تھا۔ محفل برخاست ہوئی۔

ہماری لاری تیزی سے واپس کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔

موہن سرگوشیوں میں مجھے بتا رہا تھا۔ ''خان صاحب ایک مشورہ دوں۔ جن سے ہم ابھی ملے تھے یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ ہم پردیسی ہیں اور ہمیں محبّت یا نفرت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ سعدہ وغیرہ من موہنی لڑکیاں ہیں لیکن آپ یہاں مسافر ہیں۔ میں کافی اونچ نیچ دیکھ چکا ہوں۔ جہاں ایک ہستی سے محبت ہوتی ہے وہاں دس بارہ آدمیوں سے خواہ مخواہ نفرت کرنی پڑتی ہے اور نفرت نہایت ہی منحوس جذبہ ہے۔ اس سے سیدھی سادی زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کسی انوکھے مشاہدے یا عجیب و غریب واقعے پر کم از کم دیس میں متعجب نہ ہوا کریں۔ غیر ملک میں جو اوٹ پٹانگ

چیز نظر آئے۔ یوں مُنہ پھیر لیا کریں جیسے نظر ہی نہیں آئی۔ مجھے دیکھیں میں اہنسا، شانتی، عدم تشدّد، بھوک ہڑتال، آواگون، پرمودھرمایا، کا قائل۔۔۔ انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر عراق میں لڑنے مرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں سب استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں تاڑی، گانجا، افیم، بھنگ وغیرہ کھلم کھلا بِکتی ہیں۔ شمالی علاقوں میں نسوار بھی اتنی ہی مقبول ہے۔ اور ہر جگہ تمباکو جیسی مُضر چیز کو عوام پان کے بہانے کھاتے ہیں۔ یہ سب نشے معاف ہیں۔ لیکن جہاں شراب کا نام آجائے، لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ دیگر منشیات کہیں زیادہ غیر سائنٹیفک ہیں اس لیے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ لیکن پبلک کا نزلہ شراب ہی پر گرتا ہے۔ تان ہمیشہ یہیں ٹوٹتی ہے۔ بتایئے ایسا کیوں ہے۔۔۔؟"

موہن بھی تقریباً آؤٹ ہو چکا تھا۔

ہم خیمے میں تاش کھیل رہے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ خیمے کا پردہ ہلا اور جر جیس جھانکنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں تصویروں کا پلندہ تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں خمار۔

"اس تصویر میں ہم چاروں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے مُسکرا رہے ہیں۔۔۔ لیکن تصویر کیمپ میں لی گئی تھی۔ اگر بغداد میں اُتاری جاتی تو ایک دوسرے کی کمر میں خنجر جھونکتے ہوئے نظر آتے۔۔۔۔"

"کیا ہوا۔۔۔؟" سب حیران رہ گئے۔

"ابھی ابھی بغداد سے آرہا ہوں۔ جو جو باتیں سُنی ہیں تم سب سے نفرت ہو گئی ہے۔۔۔"

"کس سے سُنی ہیں؟"

"لڑکیوں سے۔۔۔"

اسے بہتیرا چُپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بکے گیا۔

آخر مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے وہ رقص گاہوں ہوٹلوں میں لی ہوئی تصویریں باہر

پھینک دیں۔

اس نے ہر ایک کو باری باری گھورا اور باہر نکل گیا۔

پردے سے جھانک کر دیکھا تو وہ تصویریں اکٹھی کر رہا تھا۔ ایک ایک تصویر کو جھک کر اُٹھاتا، رومال سے پونچھتا اور جیب میں رکھ لیتا۔

اس واقعے کے بعد جر جیس سے بول چال ختم ہو گئی۔ اسے دیکھ کر ہم راستہ کترا جاتے۔

ایک ہفتہ گزرا، دوسرا، پھر تیسرا۔۔۔۔

ایک دن وہ خود آیا۔ ہمیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بڑے عجز سے کہنے لگا۔

"آئندہ جر جیس دوستوں کو کبھی نہیں آزمائے گا۔ اتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ شاید دوستوں کو میری کمی محسوس ہو گی اور وہ مجھے منالیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں معافی مانگنے آیا ہوں۔۔۔۔"

شاید برٹن تک اس واقعے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ سنیچر کی شام کو جب ہم بغداد کے

دجلے کی جگہ کیمپ کے دجلے کو تک رہے تھے تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔۔۔ ’’کئی ہفتوں سے تم مُنہ پھُلائے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر ایک دوسرے کی بہبودگی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو نالائقو کم از کم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرا ہی لیا کرو۔‘‘

پھر مشورہ دیا کہ ’’اگر ایک لڑکی کے لیے چند مرد آپس میں لڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے جل کر چار پانچ مردوں میں ناچاقی کرادیں تو قصور مردوں کا ہے۔ بعد میں یہی لڑکیاں آپس میں ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہو جائیں گی اور مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے۔ لہٰذا آیندہ لڑکیوں کے گروہ میں فالتو باتیں مت کیا کرو۔۔۔۔‘‘

ساتھ ہی موسم بہتر ہو جانے کے بہانے برٹن نے سب کو ڈرِل اور پریڈوں میں جوت دیا۔ شام کو تھکے ہاروں کے سامنے ورزش کی تعریفیں کیا کرتا۔۔۔ ’’اضطراب دور کرنے والی، سکون اور طمانیت کرنے والی کوئی اور شے اتنی عُمدہ نہیں۔ ورزش دنیا کا بہترین ٹرانکولائزر TRANQUILLIZER ہے اور پھر مثل مشہور ہے کہ جو کھاؤ پیو اسے جلاؤ بھی۔‘‘

کبھی کبھی روز گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتا اور کہتا۔۔۔ ’’لگاتار مشقت اور پریشانی

سے ایسی خستہ حالت ہو جاتی ہے کہ پتہ چلا مشکل ہو جاتا ہے کہ آ رہا ہوں یا جا رہا ہوں۔"

ایک روز برٹن نے پوچھا "ریگستان کی ڈیوٹی نکلی ہے۔ کون جائے گا؟" جر جیس میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہاں کہہ دی اور اگلے روز نئی جگہ پہنچ گیا۔

چلنے سے پہلے منصُور بولا۔۔۔ "تمہارے جانے پر افسوس تو ہے لیکن اطمینان ہے کہ پھر نئے تجربے ہوں گے۔ فوجی زندگی کا یہ پہلو مجھے بہت پسند ہے۔ سپاہی کا بستر ہمیشہ گول رہنا چاہیے بلکہ سپاہی اور بستر دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ بھیڑیے نے دُم دبائی اور ستائیں کوس جا کر دَم لیا۔ غالباً اس لیے بھیڑیا ہلکا پھلکا تھا اور اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کچھ دیر رہنے کے بعد معمولی سے معمولی جگہ سے بھی اُنس ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کسی بہتر جگہ جانے کا موقع ملے تب بھی انسان پہلے ٹال مٹول کرتا ہے۔ جامد رہنے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بیشتر لوگوں کو جمود پسند ہے۔ میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنہیں ترقّی کے زینے پر بھی گھسیٹ گھسیٹ کر زبردستی چڑھانا پڑتا ہے۔"

یہ اصلی صحرا تھا جہاں دُور دُور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اوپر مٹیالا آسمان، نیچے ریت۔۔۔ اِکّے دُکّے جھُلسے ہوئے درخت اور جھاڑیاں۔۔۔ اور ہُو کا عالم!

میرے ساتھ جو چند آدمی تھے وہ کئی کئی دن کام پر باہر رہتے۔ جب کبھی لاری راشن اور دیگر چیزیں لاتی تو کچھ رونق ہو جاتی ورنہ چاروں طرف ہولناک سنّاٹا تھا اور دلدوز خاموشی۔۔۔ جو میرے لیے بالکل نئی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ میں صحرا اور تنہائی سے مانوس ہوتا گیا۔ کچھ فاصلے پر بستیاں تھیں وہاں جانے لگا اور صحرا کے اصلی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

تب معلوم ہوا کہ جسے میں اُجاڑ ویرانہ سمجھتا رہا تھا وہاں روئید گی اور زندگی کی کمی نہ تھی۔ جہاں ریت کے تودے تھے وہاں چند فٹ نیچے اچھی بھلی زمین تھی۔ کہیں سُرخ چٹانیں تھیں تو کہیں بھُوری اور کہیں سیاہ۔ کہیں لاوے کے جمے ہوئے ڈھیر تھے تو کہیں سوکھے ہوئے نالوں ندیوں کی گزرگاہ (جسے مقامی باشندے وادی کہتے)۔ سراب دیکھ دیکھ کر نظارے سے اعتقاد اٹھ جاتا۔ کبھی بہتے ہوئے دریا سامنے آجاتے۔ کبھی جھیلوں کی سطح پر درختوں کا عکس نظر آتا۔ لیکن یہ سب دُور

دُور رہتے۔ قریب جاؤ تو اور آگے چلے جاتے۔ میلوں تک یہ دوڑ جاری رہتی۔

سراب دکھ کر نہ جانے کیوں ایک شعر یاد آ جاتا (جو سراب کے بالکل اُلٹ ہوتا)۔

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اِک دشتِ سراب

ریت کا ہوتا ہے دھوکہ دیکھ کر پانی مجھے

صحرا کی لڑائیوں کو سراب اس قدر پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ کبھی محض پانچ چھ جھاڑیاں دُشمن کی پوری پلاٹون معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی چرتی ہوئی بھیڑوں پر دشمن کے PATROL کا گمان ہوتا ہے۔ جہاں فقط تیس چالیس آدمی کئی سو کا جتھّا دکھائی دیتے ہیں وہاں بعض اوقات دشمن کی پوری بٹالین پانچ چھ سو گز سے بھی نظر نہیں آتی۔

کبھی اُفق سے ایک سیاہ بادل اُٹھتا۔ اس سے پہلے کہ آندھی کا شُبہ ہو نصف سے زیادہ آسمان تاریک ہو جاتا۔ کالے مرغولے اِٹھلاتے، کھیلتے، یُوں آتے جیسے لاتعداد غبارے ہوا میں چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ ان کے نیچے ریت کے ٹیلوں سے

بگولے اُٹھتے اور جیسے چاروں طرف ستون ہی ستون اُگ آتے۔ پھر سیٹیاں بجاتے ہوئے تیز جھکڑ پہلے تو اِن ستونوں کو مُنہدم کرتے۔ اس کے بعد ان ٹیلوں کو بھی اُڑا لے جاتے۔

یہاں سے وہاں تک تِیرہ و تاریک پردہ پھیل جاتا۔ بھُورے بھُورے فوّارے، اُبلتے اور ریت کی پھواریں پڑتیں۔ آہستہ آہستہ پردہ ہٹتا تو جیسے متلاطم سمندر میں سورج کی چھوٹی سی ٹکیا تیرتی ہوئی نظر آتی۔ ساتھ ساتھ طرح طرح کی شبیہیں اور ہیولے دکھائی دیتے۔۔۔۔ ایک سمت میں بھاگتا ہوا ہجوم۔۔۔ تھرتھراتی کانپتی ہوئی عمارتیں۔۔۔ زلزلے کی زد میں آیا ہوا گھنا جنگل۔۔۔ کبھی یوں لگتا جیسے ساری کائنات کانپ رہی ہے۔۔۔ کبھی ذرا سی دُھند رہ جاتی۔۔۔ اور پھر سب صاف ہو جاتا۔ جیسے ابھی کچھ نظر آیا تھا، ابھی غائب ہو گیا۔

یہ شدید طوفان میں تیزی سے آتا اسی طرح اُتر جاتا۔ ٹیلے، اُفق، آسمان سب دوبارہ دکھائی دینے لگتے اور ذرا سی دیر کے بعد سب کچھ یُوں ساکن ہو جاتا کہ یقین نہ آتا کہ ابھی ابھی آندھی آئی تھی۔

ریگستان میں دن کا درجۂ حرارت ایک سو تیس پینتیس فارن ہائٹ ہو جائے لیکن راتیں بیحد خوشگوار ہوتی ہیں۔ دن بھر جانور غاروں اور بلّوں میں چھُپے رہتے ہیں۔

سہ پہر کے بعد جب دھوپ پیلی پڑتی ہے تو ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ گلہریاں جھانکنے لگتی ہیں۔ پرندے نکل آئے ہیں۔ پھر سب کچھ سنہرا ہو جاتا ہے۔۔۔ ریت کے ٹیلے آسمان اور ڈھلتے سورج کی کرنیں۔۔۔ ہر طرف سونا برسنے لگتا ہے۔

غروبِ آفتاب اپنی تمام سادگی کے باوجود بے حد حسین ہوتا ہے۔ پہلے بڑی ساری چمکیلی گیند افق کی کسی جھاڑی میں اُلجھ جاتی ہے۔ پھر یکلخت کوئی اسے نیچے کھینچ لیتا ہے۔

اگر کوئی بھولا بھٹکا بادل مغرب سے گزر رہا ہو، تو شفق پھولتی ہے۔

اب تارے نکلے ہیں۔۔۔ لرزتے، ٹمٹماتے، سہمے سہمے سے۔ پھر ایک ایسا مختصر وقفہ آتا ہے جس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شام کا دُھندلکا ہے یا صبح کا اُجالا ہے۔

کچھ دیر کے بعد زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلے بڑے بڑے تارے شعلوں کی مانند ہالہ بناتے ہیں، پھر لاتعداد ننّھے مُنّے تارے خودرَو پھولوں کی طرح ہر طرف نکل آتے ہیں۔

جوں جوں رات بڑھتی ہے یہ جگمگ جگمگ کرتا چراغاں زمین سے قریب تر ہو جاتا ہے۔۔۔ جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور تاروں کو چھُو لو۔

سب تارے روپہلے نہیں ہوتے۔ کئی نیلے ہوتے ہیں، کئی سبز، تو کئیوں سے سُرخ رنگ جھلکتا ہے۔ جب سارا صحرا آباد ہو جاتا ہے تو قسم قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی ہوتی ہے۔ آسمان کا نور چِکنے پتھروں اور ریت کے ذرّوں سے منعکس ہوتا ہے اور چاروں طرف روشنیاں نظر آتی ہیں۔ ساکن روشنیاں، ٹمٹماتی، جھلملاتی روشنیاں اور کچھ ایسی قندیلیں جو بجھ بجھ کر روشن ہوتی رہتی ہیں۔

اگر چاند ہو تو چاند کی طرح طرح کے رُوپ دھارتی ہے۔ آج کی مخزون چاندنی نے تاروں کو بھی اداس کر دیا۔ کل شوخ اور مست چاندنی تاروں سمیت نظارے پر اس طرح چھا جائے گی کہ نہ افق کی تمیز رہے گی، نہ زمین آسمان کی۔۔۔ سب مل کر ایک ہو جائیں گے۔ کسی دن چنچل سی چاندنی فضاؤں کو یوں مخمور کر دے گی کہ جامد و بے حِس چیزیں رقصاں ہو جائیں گی۔ افق پر تنہا کھجور کا درخت۔۔۔ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا۔۔۔ ڈوبتا یا اُبھرتا چاند۔۔۔ مٹیالی اُجڑی اُجڑی سی رات اور اس کے بے نور تارے۔۔۔ یہ اور کئی ایسی تصویریں ذہن میں یوں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مدّتوں نہیں بھولتیں۔

پھر پچھلے پہر دُھند سی چھا جاتی ہے۔ آنکھیں پھر سراب دیکھتی ہیں۔ اسی دُھند کے

پیچھے کبھی برسنے والی گھٹا جھومتی ہے۔ کبھی پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے تو کبھی آبادیاں۔

صبح کاذب کی آمد پر مشرق میں مدھم سی روشنی یوں پھیلتی ہے کہ یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ واقعی اُجالا ہے یا اندھیرا کچھ دیر کے لیے کم ہو گیا ہے۔ فوراً ہی یہ جھلک غائب ہو جاتی ہے اور تاریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ستارۂ صبح طلوع ہونے پر جو نُور کل شام مغرب میں جا سمایا تھا اب مشرق سے ہویدا ہوا ہے۔ ہوا کے خُنک جھونکے اپنے ساتھ کبھی ریت پر جمی ہوئی شبنم کی خوشبو لاتے ہیں تو کبھی گیلے کانٹوں کی مہک۔ نسیمِ سحری آہستہ آہت سارے ستاروں کو بجھا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر صحرا میں ہلچل مچی ہے۔ پرندے فضاؤں میں زقندیں بھرتے ہیں۔ ہرن اوس چاٹتے ہیں۔ سب جاندار دن بھر کی قید کی تیاریاں کرتے ہیں۔

کسی ٹیلے کے پیچھے سے سورج جھانکنے لگتا ہے۔ بے حد دلکش اور سُہانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا تھا وہ دیکھ رہا ہے۔

جب جنگلوں، پہاڑوں اور آبادیوں میں دن چڑھتا ہے اور مخلوق جاگتی ہے تو صحراؤں میں خاموشی طاری ہونے لگتی ہے۔ تپش بڑھتی جاتی ہے اور سہ پہر تک جمود طاری رہتا ہے۔

لیکن دن بھر کی کلفتوں کا انعام صحرا کی رات ہے۔۔۔ ایسی رات اور کہیں نہیں آتی۔

ویرانے کو البادیہ کہتے ہیں۔ اور جو وہاں گھومتا ہوا نظر آئے وہ لازمی طور پر البادو یا البدوی ہو گا۔ لیکن بدّووٗں کو یہ نام پسند نہیں۔ وہ اپنے آپ کو عرب کہلانا پسند کرتے ہیں۔

بدّو کی زندگی کافی کٹھن ہے۔ لیکن بین الاقوامی ماہرین کی رائے کے مطابق اس کی غذا نہایت قوّت بخش ہوتی ہے (اگر اِن ماہرین کو عُمر بھر اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر گزارا کرنا پڑے تو یقیناً یہ اپنی رائے بدل دیں گے)۔ دنیا بھر میں جتنی

کھجوریں کھائی جاتی ہیں ان میں سے پچھتّر فیصد دجلہ و فرات کے کنارے اُگتی ہیں۔

گرمیوں میں جب صحرا تنور کی طرح دہکتا ہے تو بدّو کو اتنی پروا نہیں ہوتی، لیکن سردیوں میں جب منجمد کر دینے والی ہوا چلتی ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے۔

تبھی وہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔ کوئی بدّو کمزور یا وہمی ہو تو صحرا میں نہ وٹامن کی گولیاں ملتی ہیں نہ مقوّی معجون۔۔۔ چنانچہ جو بدّو بچپن میں بیماریوں کے حملوں کا مقابلہ کر لیں وہ واقعی توانا ہوتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ بدّو محض تفریحاً خانہ بدوشی پر تُلے رہتے ہیں، حالانکہ گرمیوں میں قبیلوں کو کنوؤں، چشموں اور نخلستانوں کے گرد ضرورتاً جمع ہونا پڑتا ہے اور سردیوں میں اُونٹوں اور بھیڑوں کی خاطر چراگاہوں کا مجبوراً طواف کرنا پڑتا ہے۔

لڑائی جھگڑا عموماً گرمیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ہر قبیلہ جانتا ہے کہ کون سا قبیلہ کہاں سے پانی لیتا ہے۔ لہٰذا اس موسم میں سردیوں کے تنازعے چکانے کا موقعہ ملتا ہے۔ موسمِ گرما بے شک تبدیل ہو جائے، لیکن بدّوؤں کے لیے گرمیاں آفیشلی

تب ختم ہوتی ہیں جب علی الصبح آسمان پر ستارہ سُہیل نظر آنے لگتا ہے۔ سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ایک اور گرمی بخیر و عافیت گزر گئی۔

نومبر سے اپریل تک چراگاہوں کے چکّر لگتے ہیں۔ عموماً دس بارہ دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہتے۔

بدّوؤں کی شاعری اور موسیقی عموماً محبت اور جنگ کے متعلق ہوتی ہے۔

مثلاً۔۔۔۔

آدھی رات کی ہوائیں، چمکتے ہوئے تارے مجھے جانتے ہیں

صبح صادق کا اُجالا، تپتا ہوا سورج اور بادِ سموم مجھ سے آشنا ہیں۔

جلتی چٹانیں، اُڑتا ریت اور نخلستان کا سبزہ، میرے گھوڑے کے سُموں کو پہچانتے ہیں۔۔۔

کبھی کبھی ایسی نظموں سے یہ پتہ چلا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار ایک جنگجو نے لکھے ہیں یا کسی بے قرار صحرا نورد عاشق نے (ویسے عشق کے سلسلے میں بھی کافی خون خرابہ ہوتا ہے)۔

گھوڑے کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔۔۔۔

”تیری پیشانی میدانِ جنگ کی طرح کشادہ ہے

تیری پیاری آنکھیں جواہر کی مانند چمکتی ہیں

تیری حسین گردن کے بال ریشم جیسے ملائم ہیں

تیرے کانوں کی نوکیں بالکل جڑواں بھائیوں۔۔۔

میرے پاس ہتھیار ہیں زرہ بکتر ہے۔

مگر تو بے ہتھیار ہوتے ہوئے بھی اتنی پھرتی سے مجھے رزم گاہ میں پہنچاتا ہے۔

تو میرا گھوڑا ہی نہیں بلکہ بھائی بھی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تو مجھے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“

اور عنطارا کی وہ نظم۔۔۔

”وہ رہا عنطارا! دیکھو جانے نہ پائے۔۔۔!! دشمنوں نے نعرہ لگایا اور مجھے

گھیر لیا۔۔۔

کئی نیزے میرے سیاہ گھوڑے کے سینے میں اُتر گئے۔۔۔

اس کی گردن اور چھاتی سے خون کے چشمے اُبل رہے تھے

پھر بھی اس نے باربار دشمنوں پر تابڑ توڑ حملے کیے

بہتے ہوئے خون نے جیسے اسے سُرخ قبا پہنا دی

اور وہ بالکل نڈھال ہو گیا

اگلے ہلّے پر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور چہرے پر کرب

اگر وہ بول سکتا تو تجھے اپنا دُکھ بتاتا

اور انسانوں کی طرح روتا۔۔۔!"

صحرا میں تقریری ریکارڈ یا رجسٹر نہیں رکھے جاتے۔ اس لیے اپنے نام کے ساتھ بزرگوں اور اولاد کا ذکر ابن ابو وغیرہ لگا کر کیا جاتا ہے۔ تبھی نام لمبے ہو جاتے

ہیں۔ منصُور نے بتایا کہ اس کے علاقے میں عموماً پہلے بڑے لڑکے کا نام آتا ہے پھر اپنا اور بعد میں والد کا نام۔ مثلاً ناصر کچھ یوں کہلائے گا۔ ابو ابراہیم ناصر بن عبد الرّحیم۔

بدّو کافی پی کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہ بے حد گاڑھا، تلخ اور رقیق مادہ جانی پہچانی نارمل کافی سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور محض دو تین گھونٹوں ہی سے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور پھر بھُوک نہیں لگتی۔۔۔ اور یہی دونوں کیفیتیں بدّوؤں کو پسند ہیں، چنانچہ جب موقع ملے اِس کافی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

ان کے ہاں کہاوتوں کا استعمال بہت ہوتا ہے اور کہاوتوں میں کافی بے ساختگی ہے۔۔۔ ''کتّے کو پیٹو تو شیر دُم ہلانے لگتا ہے''۔۔۔۔ ''میرے دشمن کا دشمن در حقیقت میرا دوست ہے''۔۔۔۔ ''دشمن کنویں کے قریب کھڑا ہو تو اُسے فوراً دھکیل دو''۔۔۔۔۔ ''شہروں سے بچو۔ بابل کا مینار اس لیے تباہ ہوا تھا کہ اس کے گرد شہر آباد تھا''۔۔۔۔ ''دشمن کو ہمیشہ خوار کرو۔ اگر ابھی توفیق نہیں تو حالات ساز گار ہوتے ہی اُسے ذلیل کرو۔''

کسی بات کو اہم ثابت کرنا ہو تو پہلے ایک آدھ قصّہ ضرور بیان کریں گے۔ ''مثلاً کسی نے اُونٹ کو بد دُعا دی کہ خدا کرے تجھے چور لے جائیں۔ اُونٹ بولا۔ بے شک

لے جائیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو ہر جگہ محنت کرنی پڑے گی۔ اور جو محنت کرائے گا وہ چارہ بھی دے گا۔۔۔!تو حضرات کچھ اسی قسم کے حالات میرے بھی ہیں۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔۔"

دورانِ گفتگو انکساری دکھاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو الفقیر کہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مخاطب کو انہیں جنابکم کہنا پڑتا ہے۔

کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو لوگ ملنے آتے ہیں اور فقط ایک فقرہ کہتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ اگلی مرتبہ آپ پر کرم فرمائے۔"

دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی معلومات کچھ ایسی ویسی ہی ہیں۔ مجھ سے خوش ہوتے تو اکثر دُعا دیتے۔۔۔

"خُدا کرے تمہارا قبیلہ فتح یاب ہو اور دشمن قبیلے جلد از جلد غارت ہوں۔ تمہاری چرا گاہیں اور چشمے آباد رہیں اور تمہارے اُونٹوں کی تعداد ایک ہزار ہو جائے۔"

بدّو اور اُونٹ کی یاری بہت پرانی ہے۔ لیکن اُونٹ پاگل ہو جائے (اور سردیوں میں اکثر اُونٹ تھوڑے بہت پاگل ضرور ہو جاتے ہیں) تو ساربان ارواحِ خبیثیہ کا اثر سمجھ کر اُونٹ کو زدو کوب کرتے ہیں۔ (جو کہ بالکل غلط علاج ہے)۔

طویل سفر سے پہلے جیسے موٹر کے پٹرول، انجن، ٹائروں وغیرہ کو چیک کیا جاتا ہے، اسی طرح اُونٹ کی بھی چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں ٹٹولے جاتے ہیں۔ مُنہ کا معائنہ ہوتا ہے۔ کھال پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔

اُونٹ میں پچیس چھبیس گیلن پانی سما سکتا ہے۔ لیکن وہ اتنا سارا پانی کبھی خوشی سے نہیں پیتا لہٰذا خشک صحرا عبور کرنے سے پہلے اُونٹ کو ڈھا کر بالٹیوں سے اس کے مُنہ میں پانی ڈالا جاتا ہے (اور اس کے بعد اس سے شُتر غمزوں کی توقع بھی کی جاتی ہے)۔

رات کا سفر تاروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ حُدی خوانی بھی کی جاتی ہے (کہا جاتا ہے کہ رات کو جب ساربان اُونٹ کے کانوں کے قریب بلند آواز میں گاتا ہے تو اُونٹ خوش ہوتا ہے۔ اور غالباً جاگتا بھی رہتا ہے)۔

بظاہر اطمینان سے چلتا ہوا اُونٹ دفعتاً چُست ہو کر بھاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ نخلستان قریب ہے۔ کیونکہ نخلستان تلاش کرنے میں اُونٹ سے بہتر گائیڈ کہیں نہیں مِل سکتا۔ تبھی وہ خود صحرا عبور کر لیتا ہے۔

ایک مرتبہ رات کے سفر پر میں نے ساربان سے پوچھا کہ ”کون سا ستارہ چُنا

ہے؟"

اس نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ستارہ کیسا؟ اُونٹ جانے اور منزل۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

آسمان صاف ہو تو رات کو قُطبی ستارے سے سمت معلوم ہو سکتی ہے لیکن گرد و غبار میں کچھ پتہ نہیں چلتا (اگر اُونٹ ساتھ نہ ہو)۔ صحرا میں انسان دن کو بھی راستہ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ناک کی سیدھ میں چلے تب بھی بدّوؤں کی تھیوری ہے کہ جیسے دونوں بازوؤں کی لمبائی بالکل ایک جتنی نہیں ہوتی اسی طرح دونوں ٹانگوں میں بھی ذرا سا فرق ہوتا ہے۔۔۔ خواہ تہائی یا چوتھائی انچ ہی کی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ پیدل چلتے وقت انسان آہستہ آہستہ مقابلتاً چھوٹی ٹانگ کے رُخ میں گھومتا جاتا ہے۔ اگر پانچ چھ میل میں نصف فرلانگ کا فرق بھی پڑ جائے تب بھی منزل پر پہنچنا مشکل ہے۔

صحرا میں جگہ جگہ کھنڈر ملتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی دریا نے رُخ بدل لیا۔ کبھی گزرتی ہوئی فرج کچھ عرصے کے لیے ٹھہر گئی، کبھی چشمے سوکھے گئے۔۔۔۔ اور صحرا کا ایک اور قصبہ اُجڑ گیا۔ پھر آندھیاں اور ریت کھنڈرات کو یوں دفن کر دیتے ہیں کہ وہاں سے گزرنے والے کو شُبہ تک نہیں ہو سکتا کہ یہاں کبھی آبادی

تھی۔ البتہ صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو پانچ چھ ہزار فٹ اُونچے اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز سے اُجڑے قصبوں، شہروں کے نقشے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب تو بستے ہوئے گاؤں اور کھنڈرات اس قدر خلط ملط ہو چکے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے۔ (پچھلی صدی میں ایک کشتی میوزیم کے لیے اشوریوں کے زمانے کی برآمد شدہ چیزیں لیے جا رہی تھی کہ دجلے میں ڈوب گئی۔ قریب کے گاؤں والوں نے دریا سے سب کچھ نکال لیا اور ان ہزاروں برس پُرانے، بیلچوں، کلہاڑیوں، ہَلوں اور سہاگوں کو مدّتوں استعمال کیا بلکہ اپنے بنائے سامان سے انہیں کہیں زیادہ مضبوط پایا)۔

بارشوں کا مختصر سا موسم آتا ہے۔ کتنی دفعہ نیلے نیلے بادل ترسا ترسا کر چلے جاتے ہیں۔ آخر بوندیں پڑتیں ہیں اور ایسی بارش ہوتی ہے کہ خشک جھُلسی ہوئی وادیوں میں ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ مدّتوں کے پیاسے درخت گردوغبار اُتار کر تروتازہ ہو جاتے ہیں۔ سوکھی زمین سے طرح طرح کی خوشبوئیں آتی ہیں۔

پانی طرح طرح کے تماشے کرتا ہے۔ کہیں مچلتے ہوئے بھنور بنائے۔ کہیں تالاب بنا کر ساکن ہو گیا۔ خاردار جھاڑیوں سے موتی ٹپکائے۔ یہاں آبشار گرائی، وہاں دلدل بنائی۔۔۔ اور پھر غائب ہو گیا۔ لیکن نگاہیں سراب کی اس قدر عادی ہو چکی

ہیں کہ پانی کے وجود پر یقین ہی نہیں آتا۔

بہار آتی ہے تو میلوں تک رنگ و بو کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ رنگ برنگ کے خودرو پھول کھلتے ہیں۔ کہیں سے بے شمار تیلیاں آ جاتی ہیں۔ نیلے پھُولوں پر گلابی تتلیاں، زرد کلیوں پر قرمزی تتلیاں۔۔۔ رنگوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ رونق صرف چند دنوں تک رہتی ہے، پھر بھی اس مختصر سے وقفے میں جو کچھ نظر آ جاتا ہے وہ سال بھر کے لیے کافی ہوتا ہے۔

بدّوؤں کو ساری نباتات میں فقط کھجور سے الفت ہے۔ اس کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں کہ حضرت آدم کے ساتھ بہشت سے زمین پر تین پودے آئے تھے۔ گیہوں، چنا اور کھجور۔ اور کھجور سارے پودوں اور پھلوں میں افضل ہے۔ اور یہ کہ کھجور کا درخت تب خوش رہتا ہے اگر اس کی چوٹی جہنم میں ہو اور جڑیں بہشت میں (ماہرین کا خیال ہے کہ اس علاقے میں جتنے درخت تھے آہستہ آہستہ سب برباد ہو گئے۔ کھجور اس لیے رہ سکی کہ یہ بکریوں اور اُونٹوں کے لیے ذرا اُونچی تھی)۔

ہزاروں برس سے کھجور سے آٹا، سِرکہ اور نبیذ بنائے جاتے ہیں۔۔۔ نبیذ کے متعلّق مختلف روائتیں ہیں لیکن مقامی حضرات کا اصرار ہے کہ یہ قطعاً بے ضرر

ہے۔(یعنی اگر اسی دن پیو تو کچھ نہیں کہتی۔ لیکن چوبیس گھنٹہ یا زیادہ عرصہ پڑی رہے تو پینے سے کچھ ہوتا ہے)۔

جنوبی علاقے کے ریگستان میں جھیلیں اور دلدل ہیں۔ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو سرکنڈوں، کشتوں اور بھینسوں پر فریفتہ ہیں (انگریزوں نے ہمیشہ بھینسوں کو WATER BUFFALO کہا ہے۔۔ یعنی آبی بھینس! لیکن انہوں نے کبھی برّی یا ہوائی بھینس کا ذکر نہیں کیا)۔

یہ سرکنڈے تیس سے چالیس فٹ تک اُونچے ہوتے ہیں اور دلدل بیحد خطرناک ہیں۔۔۔ اُوپر سے یوں لگتا ہے جیسے ریت کا معمولی ٹیلہ ہو۔ غلطی سے وہاں پاؤں پڑ جائے تو پھر محسوس ہوتا ہے کہ زمین افق اور سب کچھ اوپر کی طرف جا رہے ہیں (حالانکہ انسان دھنستا ہوا نیچے کی طرف جا رہا ہوتا ہے)۔

ایک دن لاری سے خط آیا جس میں میرے تبادلے کا ذکر تھا۔

واپس کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک یونٹ کے ساتھ محاذ پر جاؤں گا۔ روانگی کے

متعلق اطلاع بغداد سے آئے گی۔ موہن نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے دسویں جماعت پاس کر لی ہے اور بڑا اچھّا خط لکھا ہے۔ اس نے لڑکے کی تصویر دکھائی۔۔۔۔ ''والد صاحب مجھے بہت چاہتے تھے مگر جب یہ پیدا ہوا تو انہوں نے مجھے بالکل بھُلا دیا۔ ہر وقت پوتے کو اُٹھائے اُٹھائے پھرا کرتے۔ مثل مشہور ہے کہ اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ کاش کہ یہ لڑکا مجھ سے بہتر ثابت ہو۔۔۔۔'' منصُور اور مَیں لمبی سیروں پر جاتے۔ وہ کہتا۔۔۔ ''مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ محاذ پر جا رہے ہو۔ میں اپنی پُر امن زندگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ خطروں اور حریفوں سے نبرد آزمائی کیے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسے دو یا تین تجربے ہی کافی نہیں ہوتے۔ جب موقع ملے الجھ جانا چاہیے ورنہ اپنی خامیوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نہ خوبیوں کا۔ جہاں تم جا رہے ہو وہاں انتظار اور تشویش سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے۔ لیکن جونہی پہلی گولی چلے گی تو سب کچھ بھول جاؤ گے۔ ماضی یاد رہے گا نہ مستقبل۔ بس ایک دُھن سوار ہو گی کہ اگر اس وقت ذرا سی چُوک ہوئی تو کہیں خود اپنی نظروں میں نہ گِر جاؤ۔ اگلی آزمائش مقابلتاً آسان ہو گی اور پھر ماحول کے اتنے عادی ہو جاؤ گے کہ خطرہ خطرہ نہیں رہے گا۔۔۔۔''

اس نے ایک واقعہ سُنایا۔ ''کُردستان کی پہاڑیوں میں سات گڈریے طوفان میں گِھر گئے۔ وہ سب ایک وادی میں تھے اور باہر نکلنے کا فقط ایک راستہ تھا جو درّے سے ہو

کر جاتا تھا۔ دوپہر سے شام تک درّے پر بجلی کڑکتی رہی لیکن طوفان کی تیزی میں کمی نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ عُمر کے گڈریے نے کہا بجلی آج ہم میں سے کسی کی جان لے کر ٹلے گی۔ اس لیے یہاں انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ باری باری وادی سے نکلیں۔ جو درّہ عبور کر گیا وہ بچ جائے گا۔۔۔

قُرعہ اندازی ہوئی۔ جس گڈریے کا پہلا نمبر آیا تھا وہ اپنا ریوڑ لے کر ڈرتا ڈرتا نکلا اور وادی عبور کر کے درّے سے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسرا گڈریا بھی کانپتا ہوا گزر گیا لیکن بجلی نہیں گری۔ تیسرا، چوتھا، پانچواں، سب نکل گئے۔ پھر چھٹا لرزتا ہوا روانہ ہوا اور چلنے سے پہلے اس نے ساتویں کو خدا حافظ کہا۔ وہ بھی درّے سے گزر گیا۔ بجلی پھر بھی نہیں گری۔ جب درّے کو عبور کر کے وہ چھ کے چھ قہقہے لگا رہے تھے تو ساتواں موت کا انتظار کر رہا تھا۔ یکایک بجلی کڑکی۔ زور کا دھماکا ہوا۔۔۔ درّے کے اس طرف چھ گڈریے مرے پڑے تھے۔ ساتواں بچ گیا۔ لہٰذا جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ نہ تو ایک لمحے پہلے ہوتا ہے اور نہ ایک لمحے بعد میں۔۔۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

بغداد سے اطلاع آ گئی اور میں یونٹ کے سات ایک طویل سفر کے بعد محاذ پر پہنچا۔

محاذ کا پہلا تجربہ نہایت عجیب تھا۔

جب بٹالین کو حملے کا حکم ملا تو مَیں اور دوسرے ناتجربہ کار رات بھر جاگتے رہے۔ اور ساری رات ہم نے پرانے سپاہیوں کے خرّاٹے سُنے۔ صبح پانچ بجے بتایا گیا کہ حملہ دو گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں رابرٹسن کے چلّانے کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہ خندق میں بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا ہے۔ شور اس لیے مچا رہا تھا کہ چاء میں چینی کم تھی۔

دوپہر تک لڑائی ہوئی۔ پھر سہ پہر کو دشمن کی توپوں نے ایسی شدید گولہ باری کی کہ دُور دُور تک زمین ہلنے لگی۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے اور درمیان میں کمانڈنگ افسر ایک اُونچی ٹیکری پر کھڑا پائپ پی رہا تھا۔ کبھی کبھی دوربین سے اِدھر اُدھر تاک لیتا۔ پھر بڑے مزے سے لمبے لمبے کش لگاتا۔

گولہ باری ہلکی ہوئی تو زخمیوں کو دیکھنے آیا۔ بار بار گلِہ کر رہا تھا کہ آج کل اچھّی دیا سلائیاں نہیں ملتیں۔ پائپ سُلگاتے سُلگاتے آدھی ڈبیہ ختم ہو جاتی ہے۔

شروع شروع میں تو بڑی حیرت ہوئی۔ دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کر رہے ہیں یا مارٹر چل رہے ہیں اور خندق میں فلپ بڑے انہماک سے اپنی ایڈنبرا والی جائیداد

کے انکم ٹیکس کا حساب لگا رہا ہے۔ ٹام ایک لڑکی کو رومان انگیز خط لکھ رہا ہے کہ تین ماہ کے بعد جو دس روز کی چھٹی ملے گی تب ملاقات کون سے شہر میں ہونی چاہیے۔ سیکنڈ اِن کمانڈ بڑی حیرت سے ہمیں بتا رہا ہے کہ اسے کبھی شُبہ تک نہیں ہوا تھا کہ گبسن DRUNK رہا کرتا۔۔۔ حتیٰ کہ ایک دن اس نے گبسن کو SOBER حالت میں جا پکڑا۔۔۔۔ تب یہ غلط فہمی دور ہوئی۔۔۔۔

لڑائی کی حِدّت اور شور و غل میں ایڈ جوڈنٹ ایک ایک RETURN کو غور سے پڑھتا۔ ہجّوں اور گرامر کی غلطیاں درست کر کے انہیں دوبارہ ٹائپ کراتا۔ میرے تجسس پر وہ مُسکراتے اور کہتے کہ بہت جلد تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔

چنانچہ آہستہ آہستہ میں لڑائی کے میدان اور لڑائی کی آوازوں سے مانوس ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک اور یونٹ کے ہمراہ بغداد جانے کا موقع ملا۔

اس مرتبہ بغداد پہنچ کر یوں لگا جیسے چھوٹی سی بستی میں آ گیا ہوں۔ اور کیمپ تو بالکل ہی سنسان جگہ معلوم ہوئی۔ پرانے رفیق اب تک وہیں تھے۔ محفلیں بھی

اسی طرح جمتی تھیں لیکن ان کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔ اب میں شریک ہوتا تھا مگر طالبعلم کی حیثیت سے نہیں۔

منصُور کہتا۔۔۔ "اب تمہیں بھی لڑائی کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم بھی تو کچھ بتایا کرو۔" لیکن میں دوسروں کی باتیں سُنتا رہتا۔

کیمپ میں ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ سامرسٹ (جس کا ہندوستانی اردلی اسے سمہ سٹہ صاحب کہا کرتا۔ اردلیوں نے چند اور انگریزوں کے نام بھی رکھے ہوئے تھے۔ میجر میکنامارا کو میجر اللہ مارا کہا جاتا۔ لیفٹیننٹ کیلیہان لیفٹیننٹ کالے خاں تھا اور کرنل CHELMSFORD کرنل چلم پھوڑ)۔۔۔ سارجنٹ ہر وقت مُنہ لٹکائے اپنے خیمے میں چُپ چاپ بیٹھا رہتا۔ شام کی محفل ہو یا کوئی خاص تقریب اس کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ جب کبھی بولتا تو فقط اپنے ماتحتوں کی شکایت کرنے کے لیے۔ اپنے ایک لیفٹیننٹ کے پیچھے تو خاص طور پر پڑا رہتا اور برٹن سے اس کی برائیاں کیا کرتا۔ ایک دن خاص طور پر اس کے خلاف رپورٹ لکھ کر لایا اور برٹن سے کہا کہ زبانی شکایت کا تو آپ نوٹس نہیں لیتے ہیں اب اس تحریری شکایت پر تو آپ کو ضرور ایکشن لینا پڑے گا۔

برٹن مسکرانے لگا۔۔۔ "اس وقت میرے پاس عینک نہیں ہے۔ تم ہی پڑھ کر سُنا

دو۔"

رپورٹ میں درج تھا کہ یہ لڑکا اکثر گُستاخی کرتا ہے۔ قدرے کام چور بھی ہے۔ ہر ہفتے دو مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے بغداد جاتا ہے۔ چند مرتبہ کلب میں ہاتھا پائی پر بھی اُتر آیا تھا۔ بڑا فضول خرچ ہے۔ تبھی مقروض رہتا ہے۔ گھڑ دوڑ کا بھی شوقین ہے۔

"بس اتنا ہی؟ یا اور کچھ بھی کرتا ہے؟" برٹن نے پوچھا۔

"یہ کیا کم ہے؟" سامرسٹ نے چلا کر کہا۔ "اس مرتبہ اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔"

"اسے کیونکر سزا دوں جب کہ اس کی عُمر میں مَیں اس سے بھی کہیں زیادہ اُلٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا تھا۔" برٹن نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی لڑکا ہی تو ہے۔ بڑا ہو گا تو زمانہ خود اسے سیدھا کر دے گا۔"

پھر برٹن نے اس کی گہری خاموشی اور بیزاری کی وجہ پوچھی اس پر سامرسٹ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کچھ کچھ مُسکراہٹ سے ملتی تھی۔ اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ چند سال پہلے وہ بالکل مختلف تھا۔۔۔ موسیقی کا

شوقین۔۔ رقص کا رسیا۔ سیر سپاٹے، پینے پلانے، پولو، گھڑ دوڑ اور پارٹیوں کا دلدادہ، مگر ان سب مشغلوں میں ساری تنخواہ ضائع ہو جاتی۔ آخر ایک دن اس نے ہمّت کر کے توبہ کر لی اور سب کچھ ترک کر دیا۔ چنانچہ اب اس کا بینک بیلنس کافی ہے۔

”اب آپ ایک بالکل نئے سامرسٹ کو دیکھ رہے ہیں جس میں ایک بھی بُرائی نہیں ہے۔“ اس نے چھاتی پھُلاتے ہوئے کہا۔

”سوائے اس کے۔۔۔۔۔ کہ اب تم مکمل طور پر نیم مردہ ہو اور تقریباً ختم ہو چکے ہو۔ ایسی توبہ کس کام کی جس میں سے انسان میں زندگی کی اتنی سی رمق بھی باقی نہ رہے۔ میرے خیال میں اس توبہ سے پہلے تم یقیناً بہتر انسان ہو گئے۔ اور یہ تمہیں کس نے سمجھایا تھا کہ فوج میں دولت کمانے کے لیے بھرتی ہوتے ہیں؟“

سینچر کی شام کو بغداد جاتے تو وُڈ سے ملاقات ہوتی۔ ورنہ ہفتے بھر نظر نہ آتا۔

کسی شام کو کوئی پچھ بیٹھا کہ وُڈ نہیں آیا تو برٹن کہتا ”وہ اپنے آپ کو اسکاٹس مین بتانا

ہے۔ تبھی سنیچر کی شام کی خاطر بقیہ چھ روز کنجوسی کرتا ہے۔"

وُڈ کے الگ تھلگ رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کیمپ میں بیشتر افسروں کا کمیشن ایمر جنسی تھا اور وہ REGULAR تھا۔ لہٰذا مزید ترقّی اور شاندار کیریئر کا مستقل خواہش مند۔ اکثر بتایا کرتا کہ جب میں بریگیڈ کمانڈ کروں گا تو یوں ہو گا۔ جب ڈویژن کا کمانڈر بنوں کا تو یہ یہ کروں گا۔

عموماً اس کی گفتگو کا آغاز سکاٹ لینڈ سے ہوتا۔ بڑے فخر سے کہتا کہ سکاٹ لوگ اتنے زندہ دل ہیں کہ اپنی شہرہ آفات کنجوسی کے قصّے خود ہی گھڑتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ شروع ہوتی۔۔۔ "نپولین کا قول ہے کہ بار بار دشمن سے مت لڑو، ورنہ وہ تمہاری ساری چالیں سمجھ جائے گا۔" اور دشمن کے بارے میں برناڈ شانے کہا ہے کہ "ہمیشہ اس کی قدر کرو کیونکہ وہ تمہیں چُست رکھتا ہے۔ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔"

اتنی دیر میں نشہ چڑھنے لگتا۔ مخمور ہو کر اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا اور بڑی طنز آمیز باتیں کرتا۔۔۔ "مشرق مشرق ہی ہے۔ یہاں کے باشندے فقط شاعری، منشیات، کاہلی اور قدیم عظمت کے سہارے زندہ ہیں۔ میں پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو سونے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور پان دیکھ کر بہت حیران ہوا

کہ یہ لوگ ملک کا سارا سونا چاندی تو اس طرح کھا جاتے ہیں، غربت کیوں نہ ہو۔ انگریز جب ہندوستان پہنچے تو باشندوں کو خُون تھوکتے دیکھ کر بہت گھبرائے کہ کیسا ملک فتح کیا ہے جہاں کا بچّہ بچّہ تپِ دق میں مبتلا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سب پان کی پیک تھوکتے تھے۔"

اس کی گستاخ باتیں دُہرے پن کی غمازی کرتیں۔ بیشتر لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس زندگی میں نیک کام کر کے اگلی دنیا میں صِلہ چاہتے ہیں۔ "حضرات! کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم سب جاندار یعنی درخت، پودے، کیڑے مکوڑے، جانور، پرندے، انسان بالکل ایک جیسے ہیں۔ ہمیں اپنے وجود میں آنے سے پہلے کی باتوں کا کوئی علم نہیں۔ پیدائش بھی اتفاقاً ہوئی۔ ہم سب کی زندگی کی میعاد مقرر ہے۔ فنا ہوتے ہی سب جسمانی طور پر قطعاً مفقود ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اگلی دنیا میں فقط انسان ہی کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ سارے درندے، کیڑے، نباتات، پرند۔۔۔ یہ سب بھی کیوں نہیں جِلائے جائیں گے؟ خصوصاً وہ جن کو حادثوں، قحط سالی، وباؤں اور شکاریوں نے عُمرِ طبعی سے پہلے ختم کر دیا تھا۔ انسان اپنے لیے قبرستان بنا کر، قبروں پر کتبے لگا کہ یہ توقع رکھتا ہے کہ فقط وہی اگلی زندگی کا حق دار ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر وہ سب جاندار بھی زندہ ہونے چاہیں جو دنیا میں ایک مرتبہ سانس لے چکے ہیں۔۔"

"بہت اچھا" برٹن ہنس کر کہتا۔ "اگلی دنیا میں وُڈ کے پیچھے لگنے کے لیے دو تین شیر، چند چیتے اور پانچ چھ سانپ لازمی طور پر پھر سے زندہ ہوں گے۔"

برٹن کو اس کی باتیں ذرا نہ بھاتیں۔ اسے بتاتا "وُڈ تمہارے چہرے پر ہر وقت بیئرنگ لگانے والا اظہار رہتا ہے۔ تم اس نکمّے باورچی کی طرح ہو جو ہر کھانے کو خراب کر دیتا ہو، یہاں تک کہ دودھ اور CORNFLAKES تک کو بگاڑ کر رکھ دے۔ ہر ہفتے تم سے دُور رہ کر گزارے ہوئے یہ چھ دن اتنے خوشگوار ہوتے ہیں جیسے بحیرۂ روم کی کسی خوشنما بندرگاہ پر گزارے ہوئے کئی مہینے۔ خدا تمہارے گناہ معاف کر دے۔ لیکن تمہاراNERVOUS SYSTEM کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور طنزیہ گفتگو جاری رکھتا۔۔۔ "ایک اور دلچسپ بات سنیے۔ موصل کے شمال مشرق میں یزیدی رہتے۔ بارہویں صدی میں ان کے شیخ نے تلقین کی تھی کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ یہاں تک کہ شیطان کو بھی بُرا بھلا نہ کہو۔ اور یہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فی الحال شیطان زیرِ عتاب ہے۔ کسی نہ کسی دن اسے معافی مل جائے گی، تب وہ گِن گِن کر بدلے لے گا۔"

"لیکن اپنے دوست وُڈ کو کچھ نہیں کہے گا۔" برٹن نے بات کاٹی۔

مگر وہ بولتا رہا۔ ”یہ یزیدی سلاد اور مُولیوں سے نفرت کرتے ہیں۔“

”بہت سے اور لوگوں کو جو یزیدی نہیں ہیں سلاد اور مُولیوں سے چِڑ ہے۔“ کسی نے کہا۔

”پچھلے ہفتے بغداد میں روز نے ایک قالین کی قیمت پوچھی۔ پھیری والے نے پچاس پاؤنڈ مانگے۔ روز نے کہا دو پاؤنڈ دوں گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بحث کے بعد پانچ پاؤنڈ پر فیصلہ ہوا۔ دراصل یہ جوڑی کا قالین تھا۔ دوسرے قالین کے لیے میں نے بھی پانچ پاؤنڈ نکالے تو پھیری والے نے خفا ہو کر کہا کہ یہ سودا تو ان صاحب سے ہوا ہے۔ آپ سے ازسرِ نو بحث ہوگی۔“

ہمیں غیر متوجہ پا کر وہ چِڑ جاتا۔۔۔ ”کچھ تو بولا کرو۔“

”تم درست ہی کہتے ہوئے“ ہم اسے ٹالتے۔

”میں تمھیں ہم خیال نہیں بنانا چاہتا۔ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ باقاعدہ جرح کیوں نہیں کرتے؟“

”وُڈ تم ہر چیز کے خلاف ہو اور آئرلینڈ کے اس باشندے کی طرح ہو جو سمندری جہاز کے غرق ہونے کے بعد ایک تختے پر لیٹ کر بہتا بہتا تیسرے روز کسی نامعلوم

جزیرے کے کنارے پہنچا۔ مقامی باشندوں نے اس کی دیکھ بھال کی تو ہوش میں آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا یہ کون سا ملک ہے؟ اور اگر یہاں کوئی حکومت ہے تو میں اس کے خلاف ہوں۔" موہن بہت جھنجلاتا۔۔۔ "خان صاحب، جن لوگوں کو موافق نہیں آتی وہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ لعنت ہے ایسے نشے پر۔۔۔"

وُڈ بغداد جاتا تو کباڑیوں کی دکانوں کے چکر ضرور لگاتا۔ کئی گھنٹوں کی چھان بین کے بعد کوئی سستی سی کتاب خریدتا۔ اور لائبریریوں میں جاکر ایسی کتابیں تلاش کرتا جن سے سنیچر کی شام تباہ کرنے کے مواد مِل سکے۔ منصُور اسے بتاتا کہ "مغرب نے مشرق سے بہت کچھ لیا ہے، اس لیے مغرب کے غیر جانبدار مصنّفوں کو بھی پڑھا کرو۔ مثال کے طور پر انگلش میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ ایڈمرل جو پرسوں کلب میں دیکھا تھا دراصل امیر البحر تھا۔ الکحل جسے پی کر واہی تباہی بکتے ہو عربی لفظ ہے۔ اسی طرح الکیمیا، جسے سکول میں کیمسٹری کے نام سے پڑھا تھا۔ موسیقی وہی میوزک ہے جس کی دُھنوں پر ناچنے کی ناکام کوشش کیا کرتے ہو۔ یہاں تک کہ پاجامہ جو رات کو پہنوگے مشرقی لفظ ہے۔"

"نہیں پاجامہ تمہارا ہر جگہ نہیں ہو سکتا۔ باقی باتیں میں مان لوں گا، لیکن پاجامہ

ہمارا ہے۔" اس نے جھلّا کر کہا۔

لڑکیوں کے معاملے میں بھی وُڈ بالکل نکمّا تھا۔

ایک دفعہ سڑک پر جاتی ہوئی یہودن نے اسے متوجہ کرنے کے لیے پہلے اشارے کیے، پھر مجبوراً اپنا رومال گرا دیا۔ وُڈ نے (جسے زکام تھا) رومال اُٹھایا۔ اس میں چھینک ماری اور ناک پر پھیر کر رومال یہودن کو بڑی حفاظت سے واپس لوٹا دیا۔

اسی طرح ایک نرس، جو نہایت مختصر عرصے کے لیے وُڈ کی منگیتر رہی، اسے کھینچ کھینچ کر انگوٹھی کے سلسلے میں ایک جوہری کی دکان میں لے گئی۔ دیر تک انگوٹھیوں کا معائنہ ہوتا رہا۔ آخر ایک انگوٹھی نرس کو بہت اچھّی لگی۔

"واقعی یہ تمہیں پسند ہے؟" وُڈ نے پوچھا۔

"ہاں!" نرس خوش ہو کر بولی۔

وُڈ نے انگوٹھی خریدی۔ پھر بڑے اطمینان سے اسے انگلی میں پہن لیا۔ دُکان سے باہر نکلے ہوئے وہ آگے آگے تھا اور نرس پیچھے پیچھے۔

جرجیس پُل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا۔۔۔۔ ''یہ حسین ہے مگر فربہ ہے۔۔۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ عینک بہت موٹے فریم کی لگا رکھی ہے۔۔۔ اور اسے ضرور احساسِ کمتری ہو گا جو اس قدر اونچی ایڑی کے جُوتے پہننے پڑے اور اتنا میک اَپ تھوپنا پڑا مگر وہ جو مٹک مٹک کر چل رہی ہے واللہ خوب ہے۔''

''جرجیس یوں دُور دُور سے دل خوش کرنا بے کار ہے۔ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ساتھ چلے۔'' منصُور بولا۔ اور میرا ماتھا ٹھنکا۔۔۔۔ فوراً سعدہ کا خیال آیا!

''ان دس گیارہ مہینوں میں کچھ ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔'' اور مسکرانے لگا۔

''پھر یہ فقرہ کیسے زبان پر آ گیا؟ ویسے ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ ہمیشہ بھرے ہوئے میلے سے رخصت ہونا چاہیے۔'' منصُور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شام کو رقص گاہ میں سب خاموش تھے سوائے جرجیس کے۔ منصُور چُپ تھا۔

سعدہ نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ سلیم اپنے پلے ہوئے دوستوں سمیت دو تین مرتبہ آیا لیکن ہم نے بھگا دیا۔

منصُور رقص کرنے گیا تو سعدہ نے مجھ سے پُوچھا۔ ”ان چند مہینوں میں تمہیں فلسفی کون بنا گیا؟ کیا ہوا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بلکہ تم بتاؤ۔ منصُور سے تو ایک معنی خیز فقرہ ابھی ابھی سُن چُکا ہوں۔“ اس کی نظریں نیچی ہو گئیں۔

پھر اس کی سہیلیاں آ گئیں۔ لوئی زا نے ہتھیلی سامنے کر دی۔ ”جنگل گردی اور صحرا نوردی کر کے آئے ہو۔ ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کرو۔“

جرجیس سرپٹ بھاگا آیا۔ ”اب پتہ چلا کہ تمہاری تکنیک کیا ہے۔ نرم اور نازک ہاتھوں کو دیکھ چکے، سخت اور کھردری ہتھیلیاں بھی تھامو۔“

”جرجیس یہ لکیریں کہتی ہیں کہ خدانخواستہ تمہاری شادی ہو گی۔“

”مرحبا! کس سے ہو گی؟ اس کا نام کیا ہو گا؟“ اس نے لوئی زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی سے ہو گی، جس کا نام مسز جرجیس ہو جائے گا۔ اور یہ کہ تمہاری شادی شدہ زندگی کے پہلے دو تین سال زیادہ خوشگوار نہیں گزریں گے۔"

"پھر؟"

"پھر تمہیں رنج و غم کی عادت پڑ جائے گی۔"

جرجیس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پروگرام بنا کہ دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ بڑی سُہانی رات تھی۔

لولیتا ایک نئی لڑکی کو لائی اور مجھ سے کہا "ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گی۔"

منصُور نے بتایا کہ یہ گُلنار ہے۔ سعدہ کی چھوٹی بہن۔ ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔

"اور یہ التفات اس لیے ہے۔" وہ میرے کان میں بولا "کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں۔ آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل بے رُخی پر ریجھ جائیں گی۔"

جرجیس کو سواریاں نہیں مل رہی تھیں۔ لوئی زا کی منتیں کر رہا تھا۔ ”انکار مت کرو۔ خدا کے لیے کچھ چاند تاروں کا ہی لحاظ کرو۔ آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ایسی حسین رات سے کچھ فائدہ نہ اٹھاؤ گی؟ کیا تمہیں قدرتی نظاروں کا اتنا سا بھی پاس نہیں؟“

میں نے چپّو سنبھالے۔ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ گُلنار نے کہا۔ ”ذرا کنارے تک چلیے میں کچھ بھول آئی ہوں۔“

واپس گئے۔ دونوں میں کھُسر پھُسر ہوئی اور لولیتا اُتر گئی۔

میں نے چپو سنبھالے لیکن کشتی کے رُخ کے متعلق ہدایتیں ملنے لگیں۔

اس طرف موڑیے۔۔۔ ذرا اس طرف چلئے۔۔۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس کا منہ چاند کے سامنے رہے، لیکن اس طرح کشتی غلط رُخ میں چلی جاتی۔

”جگمگاتے چہروں کو چاندنی کی کیا ضرورت ہے؟“ مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔

”کیا میں صحیح ہے کہ لڑکیاں زیادہ تخیّل پرست ہوتی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”صحیح تو ہے مگر درست نہیں۔“

”کیوں؟“

”سنا ہے کہ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جھاڑیوں میں پرندے تلاش کرنے کی بجائے کھیل شروع ہوتے ہی پتّے میز پر رکھوا لیتی ہیں۔“

”یہ بتائیے محبت کے لیے حُسن و دلکشی کے علاوہ اور کیا کیا خوبیاں ضروری ہوتی ہیں؟“

”موقعے پر موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر فرصت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ہوا بھی تو بہت دیر میں ہو گا۔“

اس نے سعدہ کا ذکر چھیڑا۔۔۔ ”حالانکہ وہ میری سگی بہن ہے لیکن ہم بچپن سے دُور دُور ہی رہی ہیں۔ تبھی ایک دوسری کے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ میری بہن ہے بھلا یہ کیسے بتاؤں کہ اسے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کے منع کرنے پر بھی وہ سلیم سے ملتی ہے اور یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو؟“

”کنارے کی طرف۔“

”سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔“ وہ چِڑ گئی۔

"سب عورتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

کنارے پر منصُور بولا۔ "جب کبھی دونوں بہنوں یا دو عزیز سہیلیوں سے واسطہ پڑ جائے تو ٹل جانا چاہیے۔ ورنہ بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعدہ کی نظریں تمہاری کشتی پر تھیں۔"

"میں اس مقولے کو جانتا ہوں اور ابھی ابھی اس پر عمل کیا ہے۔۔۔ لیکن جہاں تک سعدہ کی نگاہوں کا تعلق ہے وہ تمہارے لیے مخصوص ہو چکی ہیں۔"

"ایک کہاوت ہے کہ مرد اور عورت کی محبت کو چاند سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن دوستوں اور بھائیوں کی محبت تاروں کی طرح ہے۔ اگرچہ جگمگاہٹ کم ہے لیکن ہمیشہ صادق اور قابلِ یقین ہے۔۔۔" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

ایک شام کو کیمپ میں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں وُڈ آ گیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس نے حسبِ معمول پہلے تو سکاٹ لینڈ کی باتیں

کیں۔ جب نشہ چڑھا تو مقامی لوگوں کا ذکر شروع کر دیا۔ ”خلافت کے آخری دنوں میں یہاں کے ایک حکمران نے قسم کھائی کہ جب تک حریف ملک منگولیا کی خاک پاؤں تلے روند نہ لوں گا، چین سے نہ بیٹھوں گا۔ فوجی کامیابی تو کیا ہونی تھی مگر درباریوں کی ہر روز شامت آتی۔ آخر تنگ آکر وزرا اُمرا نے منگولیا سے مٹّی کی بیس پچیس بوریاں منگوائیں۔ یہ مٹّی دربار میں بچھائی گئی جسے روند کر حکمران مطمئن ہو گیا۔۔۔ ایسی ہی باتوں سے چِڑ کر ہلاکو نے حملہ کیا تھا۔“

”اس مرتبہ بغداد سے کون سی کتاب لائے ہو؟“ برٹن نے ہنس کر کہا۔

”تاریخ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے جس میں لکھا ہے کہ بغداد کے بستے ہی دو نئی شخصیتیں نظر آئیں۔ وزیر اور جلّاد۔ وزیر خلیفہ اور رعایا کے درمیان آکھڑا ہوا اور جلّاد دربار میں تلوار لیے منتظر رہتا۔“

”وزیر اور جلّاد کس مغربی بادشاہ کے پاس نہیں تھے؟“ برٹن نے پوچھا ”اور پھر مجرموں کو سیدھا بھی تو کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وُڈ کی تقریر جاری تھی۔ حالانکہ عربوں کی سلطنت بحرِ اوقیانوس تک پھیل چکی تھی۔ تاہم یورپ کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔“

"یورپ میں اُن دِنوں کچھ تھا ہی نہیں۔" منصُور بولا "لٰہذا جاننے نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

دسویں صدی میں جغرافیہ دان مسعودی نے لکھا کہ "شمال کے باشندے ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سورج نصف النہار پر کبھی نہیں آتا۔ شدید سردی، نمی اور برفباری نے ان لوگوں کو گرمجوشی اور تپاک سے محروم کر دیا ہے۔ قوّی الجثہ شمالی باشندے نہ لطیف جذبات سے آشنا ہیں نہ آدابِ گفتگو سے۔"

"یوں لگتا ہے جیسے مسعودی نے وُڈ کی تصویر کھینچی ہے۔" برٹن نے قہقہہ لگایا۔

"پھر گیارہویں صدی میں طلیطلہ کے قاضی نے کہا کہ یورپ کے باشندوں کے رنگ پیلے ہیں اور جسم بے ڈھنگے۔ وہ حجامت نہیں کراتے، نہ نہاتے ہیں۔ ان میں ذہانت، مستعدی، مفاہمت اور وسیع النظری کی کمی ہے۔ اور وہ جہالت، تعصّب اور بدتمیزی کی طرف مائل ہیں۔۔ طلیطلہ کے قاضی کو یہ خیال نہ آیا طلیطلہ سپین میں ہے اور سپین یورپ میں ہے۔ لٰہذا وہ خود بھی یورپین تھا اور ایک طرح سے اپنی ہی برائیاں کر رہا تھا۔"

"قاضی نے یہ بیان وُڈ جیسے آدمیوں کو مدِّ نظر رکھ کر دیا ہو گا۔" ایک طرف سے

آواز آئی۔

برٹن نے پہلے کسی مخمور کو نہیں ڈانٹا تھا لیکن اس رات غصّہ ضبط نہ کر سکا اور بڑے تلخ لہجے میں بولا ''وُڈ اوّل تو تم اسکاٹس مین نہیں ہو کیونکہ تمہارے بزرگ لگاتار جنوبی افریقہ میں رہے ہیں اور پھر تمہیں علم نہیں کہ اگر لوگ کسی دوسرے ملک کا اندازہ فقط وہاں کے ان چند باشندوں سے لگاتے ہیں جن سے اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تمہیں دیکھ کر یہاں کے یا کہیں اور کے رہنے والے ہم انگریزوں کے متعلق کیا لکھتے ہوں گے؟ میں جانتا ہوں کہ انسان متضاد عناصر سے بنا ہے۔۔۔ بے وقوفی، دانائی۔۔۔ بزدلی، دلیری۔۔۔۔ رذالت اور شرافت۔۔۔ کا مرکّب ہے۔ اصل چیز ہے امتزاج۔۔۔۔ کہ ان عناصر کا توازن کیا ہے؟ اور اس کے لیے وہ خود ذمّہ دار ہے۔ وہ چاہے تو اپنی خوبیوں میں اضافہ کر سکتا ہے اور برائیوں کو دبا سکتا ہے۔ خدا کے لیے تم بھی کبھی کوشش کیا کرو۔ رہ گیا تمہارا ریگولر کمیشنڈ افسر ہونا اور ترقّی کے لیے بے چینی کہ جلد از جلد بریگیڈیر اور پھر جنرل بن جاؤ۔۔۔۔ اس سلسلے میں پُورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کبھی کسی بریگیڈ سے تمہارا تعلّق ہو تو وہ فائر بریگیڈ سے ہو گا۔ اور اگر کسی قسم کے جنرل بنے تو یا جنرل مرچنٹ بنو گے یا جنرل پریکٹیشنر، اور زیادہ سے زیادہ جنرل مینجر۔ بہرحال اگر برٹش آرمی کا خاتمہ قریب ہی ہے اور انہوں نے تمہیں کسی

ڈویژن کی کمانڈ دے دی تو تم یقیناً ایسے جنرل بنو گے جس کا نالج صفر ہو گا۔۔۔۔“

اگلے ہفتے برٹن نے ٹیلیفون کیا اور رُوڈ کا تبادلہ ہو گیا۔

کچھ عرصے پھر ریگستان میں گزارنا پڑا۔ واپس کیمپ میں پہنچا تو روز نے بتایا کہ جرجیس لاپتہ ہے۔ اس کے محکمے والوں نے اسے موصل کی طرف ڈیوٹی پر بھیجا تھا۔ تب سے نہ کوئی خبر آئی نہ خط۔

مجھے یونہی وہم سا رہنے لگا کہ نہ جانے بیچارہ کس حال میں ہو گا؟ سب کہتے کہ خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، وہ کہیں مزے کر رہا ہو گا۔ لیکن میری تشویش نہ گئی۔

آخر ایک دن میں روز کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے گاؤں کو تلاش کیا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں پہنچے۔ گھر تلاش کر کے آواز دی۔ سفید بالوں والی معصوم سی ضعیفہ باہر نکلی۔ بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔

"آپ جرجیس کے دوست ہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

ہمارے ہاں کہنے پر اُس نے بتایا "وہ تو کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ہر آہٹ پر چونک کر پوچھتا ہے کہ امّی میرے دوست تو نہیں آئے؟ جب بتاتی ہوں کہ نہیں آئے تو خفا ہونے لگتا ہے کہ امّی وہ ضرور آئیں گے۔ میرے دوست ایسے نہیں کہ میں انہیں یاد کروں اور وہ نہ آئیں۔۔۔"

ضعیفہ رونے لگی۔ اس کی پُر شفقت آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے۔

جرجیس اندر لیٹا ہوا تھا۔ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔

"دیکھا امّی میں نے کہا تھا کہ یہ آہٹ میرے دوستوں کی ہے۔"

میں نے بازوؤں کا سہارا دے کر اسے اُٹھایا۔۔۔ "کیا ہوا جرجیس! میرے عزیز دوست! یہ کیا حالت بن گئی؟" یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہڈیوں کا پنجرہ وہی کھلنڈرا زندہ دل لڑکا ہے جسے ہمیشہ بہتر دنوں کی توقع رہی تھی۔ اور اب یہ اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی طبیب نہیں تھا۔ بوڑھی بیچاری کو جو کوئی الٹا سیدھا مشورہ دیتا اس پر عمل کرتی۔ جڑی بوٹیاں، ٹونے ٹوٹکے سب آزما چکی تھی لیکن لمبا

بخار نہیں اُترتا تھا۔

ضعیفہ رات بھر باتیں کرتی رہی ''عمر بھر کی پونجی چار بچّے تھے۔ ان میں سے تین بچپن میں سدھار گئے۔ اور خدا گواہ ہے کہ میری غفلت یا لاپروائی سے نہیں مرے۔ جب رُخصت ہوئے تو موٹے تازے تھے۔ پھر ان کے والد کا بلاوا آیا۔ مرتے وقت انہوں نے میری خدمت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں۔ جرجیس کو جن مصیبتوں سے پالا ہے میں ہی جانتی ہوں۔ اس کی تنخواہ سے بھی کچھ نہیں لیا۔ بلکہ اپنی محنت مشقت کی کمائی سے کچھ نہ کچھ اسے بھیج دیا کرتی کہ پردیس میں اسے کہیں تکلیف نہ ہو۔ جب سے یہ باہر گیا مجھے لمحہ لمحہ اس کا انتظار رہتا۔ اسے دیکھنے کے لیے بے قراری رہتی۔ لیکن یہ مدّتوں نہ آتا۔ اس کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتی کہیں لوگ اس کا مذاق نہ اُڑائیں کہ یہ افسر ہے لیکن اس کی ماں مزدوری کرتی ہے۔ یہ نہایت ہی اچھا بچّہ تھا لیکن جب سے بیمار ہوا ہے بالکل بدل گیا ہے۔ جو کچھ اسے سکھایا تھا بھُلا بیٹھا ہے۔ پہلے سچّا اور نیک تھا، اب جھوٹ بولنے لگا ہے۔ بے ادبی، چُغلیاں، خدا سے نہ ڈرنا، نئی نئی باتیں سیکھ گیا ہے۔۔۔'' اس کے پژمردہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں اور ان پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔

مصیبتیں۔۔۔۔۔ صدمے سہمی سہمی امیدیں۔۔۔۔ مادرانہ خوش فہمیاں۔۔۔ صبر و تحمّل۔۔۔ ایک ماں کی ساری زندگی سامنے آگئی۔

"تم تو اس کے دوست ہو، بتاؤ یہ کیوں اتنا بدل گیا ہے؟"

"بیماری بڑی ظالم چیز ہے۔ جہاں یہ جسم کو پھونکتی ہے وہاں ذہنی تبدیلیاں بھی لاتی ہے۔ خیالات اور عادتوں کو بدل ڈالتی ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور بہت جلد تمہارا پُرانا جرجیس واپس گھر آجائے گا۔۔" اسے ہسپتال لائے۔ خاصے طویل علاج کے بعد وہ تندرست ہوا تو پوچھنے لگا "تمہارا شکریہ ادا کرنا تو مشکل ہے۔ دوستو کوئی حکم دو، میں بجالاؤں گا۔"

"اب سے اپنی ماں کی خدمت کیا کرنا۔" ہم نے کہا۔

جب روز اور میں جرجیس کو لے کر گاؤں پہنچے تو ضعیفہ نے ہمیں دُعائیں دیں۔

"تم نے میرا بُجھتا ہوا چراغ روشن کیا ہے۔ اگلے جشنِ چراغاں میں تم دونوں کے لیے دیئے جلاؤں گی اور جرجیس کی اولادیں میں دو لڑکوں کے نام تمہارے ناموں پر رکھوں گی۔"

دجلے کے کنارے کرسمس منایا جارہا تھا۔ کیمپ میں بڑی رونق تھی۔ دن میں افسروں اور سارجنٹوں کے درمیان فٹ بال کا میچ ہوا۔ مگر اس طرح کہ افسروں کے گول میں مشین گن نصب تھی اور سارجنٹوں کے گول میں بھی گول کیپر ان دونوں مشین گنوں کے پیچھے مستعد تھے۔ چنانچہ کھیل ختم ہونے تک کوئی گول نہیں ہوا۔ پھر افسر سارجنٹوں کے میس میں گئے جہاں انہیں سوائے کرسمس کے سال بھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میس ایک معمولی سا خیمہ تھا۔

شام کو روشنیاں جلائی گئیں۔ باجے بجے۔ بڑی شاندار محفل منعقد ہوئی۔ لیکن وُڈ موجود تھا۔ وہ اپنے نئے اسٹیشن سے تہوار منانے آیا تھا۔

سب شور مچارہے تھے اور وہ خامش بیٹھا تھا۔

"وُڈ مُنہ کیوں پھُلار کھا ہے؟ ٹھیک تو ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو اپنے چہرے کو بھی مطلع کردو۔"

گانے شروع ہوئے۔۔۔۔ سب سے جونئیر افسر نے پہل کی۔ پھر منصُور نے عربی کا ایک شعر گایا جس میں فضیلتہا آتا تھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ کیا کہ۔۔۔۔

''کیا واقعی میرے محبوب ہمیں دنیا بھر کی فضیلتیں اکٹھی ہو گئی ہیں؟

یا پھر میری ہی عقل ماری گئی ہے۔۔۔؟''

موہن کی باری آئی تو کچھ دیر سوچتا رہا پھر مالکوس میں یہ گایا۔

''بالک ڈھول۔ پشو اور ناری ہیں سب تاڑن کے ادھیکاری''

اس کے معنی بیان کیے گئے تو دیر تک تالیاں بجیں۔ سب سے زیادہ انگریز خوش ہوئے۔

آخر میں سب نے اصرار کیا کہ برٹن بھی کچھ سُنائے۔ وہ ترنگ میں تھا۔ اُٹھ کر OPERA کے گویّوں کے انداز میں نغمہ سنایا۔۔۔

خواب میں دیکھا کہ ایک خوشنما جزیرے میں ہوں

جہاں پھول ہی پھول ہیں، خمار ہے اور موسیقی

جہاں فقط لڑکیاں ہی لڑکیاں آباد ہیں؟

تین چار سو حسین چنچل خوش گلو لڑکیاں،

اس کے باوجود مجھے بار بار رونا آتا!

کیونکہ خواب میں مَیں بھی ایک لڑکی تھا۔

اس پر پٹاخے چلائے گئے۔ غبارے چھوڑے گئے۔ جام بھرے گئے اور اگلا راؤنڈ شروع ہوا۔

کچھ دیر شکار کے قصّے ہوتے رہے۔ موضوع بدلا اور آباؤ اجداد کے تذکرے ہونے لگے۔نشے میں ہر ایک اپنا شجرہ کسی مشہور نام سے ملا رہا تھا۔

آخر تنگ آکر روز نے پوچھا حضرات آپ نے DEAD SEA کا نام تو سُنا ہو گا۔

”سنا ہے۔۔۔ دیکھا ہے۔۔۔ جانتے ہیں۔۔۔۔“ آوازیں آئیں۔

”اسے میرے دادا جان کے ماموں نے ہلاک کیا تھا۔۔“ روز نے بڑے فخر سے بتایا۔

"وُڈ خاموش ہے۔ اس سے بھی کچھ سنو۔" کسی نے فرمائش کی۔

"پروفیسر وُڈ کی جگہ آج پروفیسر روز لیکچر دیں گے۔ طلبا ٹائم ٹیبل میں ترمیم کر لیں۔" ایک طرف سے نعرہ سنائی دیا۔ روز گلاس تھامے اُٹھا اور ایک میز پر چڑھ گیا۔

"میں نے بھی کباڑیوں سے کچھ بوسیدہ کتابیں خریدی ہیں لہٰذا مجھے بھی حق حاصل ہے کہ تاریخ پر گوہر افشانی کروں۔ میرا نام روز ہے، اس لیے کہ میرے باپ کا نام روز تھا۔ میرا مذہب بھی وہی ہے جو میرے باپ دادا کا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں مغرب میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ کس مذہب میں اور کس برِّاعظم یا ملک میں جانا پسند کرو گے؟ پھر بچپن سے سننے میں آیا کہ مشرق کے باشندے کمزور اور سست ہوتے ہیں۔ وہمی اور ماضی پرست بھی ہیں۔ یہ بھی پڑھا کہ مشرق میں قالین اُڑتے ہیں۔ رسّے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بوتلوں میں سے جِن نکلتے ہیں۔ ہر دوسرا شخص سادھو ہے، ہر تیسرا فقیر، ہر چوتھا علی بابا، ہر پانچواں نواب ہے یا مہاراجہ ہے۔ چپّے چپّے پر سانپ سنپولیے اور شیر چیتے گھات میں رہتے ہیں۔ ہر چوراہے کے قریب خزانہ دفن ہے۔ دُعا نری خوش فہمی ہے لیکن بددُعا فوراً لگ جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ یہ تاثرات ان

لوگوں کے تھے جنہیں ایسی باتیں لکھنے کا خاص شوق تھا۔ جو پہلے مشرق کے لوگوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر واپس انگلستان یا امریکہ پہنچ کر ایسی کتابیں لکھ مارتے تھے۔ ان دِنوں بھی میں نے مغربی حضرات کو فقط خاص خاص نظاروں کی تصویریں اُتارتے دیکھا ہے۔ فوٹوگرافی میں تضحیک کا پہلو ہوتا ہے۔ گرم سہ پہر کو اونگھتے ہوئے دکاندار۔۔۔ تھکے ہوئے کمزور جانور۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا حجّام۔۔۔ لولے لنگڑے اپاہج۔۔۔ غرضیکہ ہم فقط وہی تصویریں کھینچتے ہیں جو کھینچنا چاہتے ہیں۔ ان کی روٹی کو ملائم پلیٹ اور شلوار کو چھوٹا سا خیمہ کہ کت ہمیں بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ہمارے سرسبز و شاداب ملکوں میں دن بھر تپش ہو، لُو کے تھپیڑے ہوں، پیاس سے بار بار پانی پینا پڑے، تیز شعاعوں اور ریت کے ذروں سے آنکھوں کی چمک جاتی رہے، مکھّیاں، مچھّر، جراثیم جان کے لاگو ہو جائیں۔ ہماری روح پرور آب و ہوا بدل جائے تو کیا ہم کمزور اور سست نہیں ہو جائیں گے۔ یہاں کی چوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اپنے اخبافروشوں کا حوالہ دیتے ہیں جو اخباروں کے ڈھیر اور سِکّے ڈالنے کے لئے اپنا ہیٹ سڑک پر چھوڑ کر اطمینان سے شراب خانے میں جاتے ہیں اور کوئی اخبار نہیں چُراتا۔ لیکن اگر سب کی جیبیں بھری ہوئی ہوں تو تانبے کے چند سِکّوں کے لیے کوئی کیوں بے ایمانی کرے گا؟ کیا وہاں ڈاکے نہیں پڑتے؟

بینک نہیں لوٹے جاتے؟ یہاں کے ظلم و تشدّد پسندی کے قصّے بناتے وقت وُڈ جیسا مؤرّخ بھی بھول جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں سوا دو سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی۔ شلجم چُرانا۔۔۔ خانہ بدوشوں سے میل جول۔۔۔ درخت کاٹنا۔۔۔ بلا اجازت شکار کھیلنا۔۔۔ ان شدید جرائم کی فہرست میں شامل تھے۔ اور اٹھارویں صدی کے شروع میں انگلستان میں پولیس تھی نہ جیل خانے تھے۔ سن اٹھارہ سو چھ میں سر رابرٹ پیل نے اعتراف کیا تھا کہ جتنی وحشیانہ سزائیں انگلستان میں رائج ہیں، دنیا کسی اور حصّے میں نہیں دی جاتیں۔ صلیبی جنگوں کو مدّتیں گزر چکی ہیں لیکن ہمیں وہ شکست اب تک یاد ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جب یروشلم فتح ہوا تو ہمارے وزیرِ اعظم نے ساری دنیا کے سامنے بیان دیا کہ جو کام ہمارے سورما صلیبی جنگوں میں نہ کر سکے وہ ہم نے کر دکھایا ہے۔ اور یہ بیان اسی صدی میں دیا گیا تھا۔ جس رفتار سے عربوں نے ملک پر ملک فتح کیے، دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ کبھی حساب لگایئے کہ کسی اور قوم نے اتنے قلیل عرصے میں کبھی اتنا وسیع رقبہ آج تک فتح کیا ہے؟ لیکن مغربی مؤرّخ ان کارناموں کو سراہنے کی بجائے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے ہیں کہ سلطنتِ روما پہلے ہی زوال پذیر تھی۔ ہسپانیہ کے اندرونی حالات دِگرگوں ہو چکے تھے۔ رچرڈ شیر دل کو وطن واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ بازنطینیوں کا دھیان کسی

اور طرف تھا اور اس پر طُرّہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو اسپورٹس مین سمجھتے ہیں۔ ہم انہیں قبر پرست اور ماضی پرست کہتے ہیں جنہیں صدیوں پہلے تلقین کی گئی تھی کہ بہترین قبر ہو ہے جو ہاتھ کی ہتھیلی سے مٹائی جا سکے۔ مذہب کے نام پر جنگ اور مذہبی تعصّب کا الزام ان پر لگاتے ہیں جنہیں تعلیم دی گئی تھی کہ سب سے اچھا جہاد وہ ہے جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرے۔ ہم انہیں عورتوں کی تعظیم نہ کرنے کا طعنے دیتے ہیں جنہیں بتایا گیا ہے کہ عورت کو کبھی ایذا نہ پہنچاؤ، یہاں تک اسے پھول تک نہ مارو۔ آخر میں مَیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مشرقی ممالک نے کب درخواست کی تھی کہ مغربی تہذیب پھیلانے کے سلسلے میں ان پر حملہ کیا جائے؟ اور انہیں زیر کر لیا جائے؟ اب مَیں اپنے مؤرّخ دوست سے درخواست کروں گا کہ میز پر تشریف لائیں اور پرانے واقعات پر روشنی ڈالیں۔۔۔''لیکن وُڈ خاموش رہا۔

موہن نے میرے کان میں کہا۔۔۔''خان صاحب! میں نہ کہا کرتا تھا کہ وہسکی جہاں اُلٹی سیدھی باتیں کراتی ہے، وہاں کبھی کبھی سچ بھی بلوا دیتی ہے۔''

برٹن ریگستان سے واپس آیا تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے تو پاؤں میں کانٹا چُبھا۔ پھر

پاؤں سوجتا گیا۔ ٹانگ سوج گئی۔ ہسپتال جانے سے اسے نفرت تھی۔ بڑی مشکلوں سے منایا۔ بار بار یہی کہتا۔۔۔ ”خدا کے لیے زیادتی مت کرو۔ میں پرانا سپاہی ہوں۔ آج تک ہسپتال میں نہیں لیٹا۔“

چند دنوں کے بعد میرے تبادلے کا خط آگیا۔

برٹن سے ملنے گیا۔ اس کا بخار پہلے سے زیادہ تیز تھا لیکن مونچھیں اور بھویں اسی طرح تنی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تکیے کے پیچھے چھپایا ہوا سگار نکالا۔۔۔ ”اسے سلگا کر پیو۔ میرے لیے اس کی ممانعت ہے۔ کم از کم اس کی خوشبو ہی سونگھ لوں۔“

اتنی تکلیف اور نقّاہت کے باوجود اس کی آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ ”مجھے قدیم چینیوں کا فلسفہ بہت پسند آیا کہ جب تک تندرست رہے ڈاکٹر کو باقاعدہ فیس دیتے رہے۔ جونہی بیمار ہوئے فیس بند۔ چینیوں کی ایک اور کہاوت بھی خوب ہے۔۔۔ کہ سُنی سُنائی پر تو قطعاً بھروسہ مت کرو اور جو کچھ آنکھوں کو دکھائی دے اس پر بھی فقط پچاس فیصد یقین کرو۔“ میں نے تبادلے کا ذکر کیا۔

”بہت اچھا ہوا۔ یہ اور آس پاس کا علاقہ دیکھ چکے ہو۔ جاؤ دوسرے ملک دیکھو۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو تبادلے پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ہیڈ کوارٹر والے مجھے

بھولے نہیں۔ ایک جگہ دیر تک رہنے سے دیمک سی لگ جاتی ہے۔ جب میں چھٹّی پر وطن جاتا تو دیکھتا کہ جن ساتھیوں کو گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا وہ کوشش کرتے کرتے شہروں میں پہنچ چکے تھے۔ اِدھر شہر والے دوستوں کی سب سے بڑی یہی خواہش تھی کہ دیہات میں کوئی باغ ہو یا فارم۔ لیکن فوج میں سپاہی یہ سب جگہیں دیکھتا ہے۔" درد سے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرے پر کرب کے آثار بھی نمایاں ہو گئے۔ لیکن لبوں پر مُسکراہٹ بدستور تھی۔

"ڈاکٹر نااُمّید ہو چکے ہیں۔ لیکن مَیں موت اور اگلی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا۔ کیونکہ مجھ سے پہلے مجھ سے کہیں بہتر اور کہیں دلیر اور اعلیٰ انسان اسی راستے سے چُپ چاپ گزر گئے۔ جو کچھ ان پر بیتی ہو گی۔ بے شک مجھ پر بھی بیت لے۔"

اتنے میں ایک سُرخ بالوں والی چھریری حسینہ آئی۔ برٹن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تھرمامیٹر سے ٹمپریچر لیا۔ نبض گنی۔ دو چار مذاق کیے اور چلی گئی۔

"یہاں لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں۔ خصوصاً یہ گریس۔ یہ تو دس دس منٹ کے بعد آجاتی ہے۔ تبھی میں ہسپتال میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں ڈاکٹروں اسے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ نرسوں سے۔ تم ہی بتاؤ، بھلا اس عمر میں چہلیں کرتا ہوا کچھ

اچھا لگوں گا؟ جس دور سے یہ گریس گزر رہی ہے اس سے مَیں برسوں پہلے گزر چکا ہوں۔ تمہاری روانگی کب ہے؟“

”آج جانا تھا۔ لیکن آپ تندرست ہو جائیں تب۔۔۔“

”نہیں۔ آج ہی روانہ ہو جاؤ اور نئی جگہ پہنچ کر ان کی دیکھ بھال کرو جو نو عُمر ہیں اور جن سے ابھی اُمّیدیں وابستہ ہیں۔ پُختہ عُمر والوں کے مقابلے میں ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔“

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو مُسکرا کر بولا ”ہمیشہ پھُرتیلے رہنا۔ جو سمارٹ نہیں وہ سولجر نہیں۔ ایک ترکیب بتاؤں۔۔۔ جو وردی ان دِنوں پہنتے ہو اس کا ایک جوڑا کسی بکس میں محفوظ کرلو۔ ہر سال پہلے جنوری کو یہ وردی پہن کر دیکھنا۔ جب تک یہ فِٹ آئی تم بھی فِٹ رہو گے۔“

منصُور اسٹیشن پر چھوڑنے آیا۔ کچھ افسردہ سا تھا۔ پچھلے تبادلے پر اس نے کچھ اور طرح کی باتیں کی تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ جب کبھی مشرقِ وسطیٰ سے گزرا ضرور آکر ملوں گا۔

”اب تم دور چلے جاؤ گے۔ بس بے جان خط رہ جائیں گے۔ لیکن تم نظر نہیں آؤ

گے۔ نئی نئی جگہوں میں نئے نئے دوست بنیں گے اور دجلہ کے کنارے گزارے ہوئے یہ دن تمہیں یاد بھی نہیں رہیں گے۔ آہستہ آہستہ خط وکتابت سست ہوتی جائے گی۔ خطوط مختصر ہوتے جائیں گے۔"

سعدہ آتی ہوئی دکھائی دی۔

منصُور نے جلدی سے کہا "تم ناتجربہ کار ہو۔ ایسے لمحے بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنا دل پتھر کا بنالو۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ ان دِنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو گا اور کون کہاں جائے گا۔ ہمت سے کام لو۔۔۔"

اور مَیں نے منصُور کو بڑی حیرت سے دیکھا جو سعدہ کے لیے ایسے فقرے کہہ رہا تھا جن کی شاید مجھے توقع نہیں تھی۔ سعدہ نے سلام کیا اور ایک ڈبّہ دیا جس میں کھجوریں تھیں۔

"پھر کب آؤ گے؟" اس کے ہونٹ ہلے۔ تِل اور بھی نمایاں ہو گیا۔

"پتہ نہیں۔۔۔ شاید اب موقع نہ مل سکے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

”اس لیے کہ وطن دُور ہے۔“

”تم وطن تو نہیں جارہے۔ وطن سے اور دُور جارہے ہو۔ واپسی پر آؤ گے نا؟“

مَیں نے منصُور کی طرف دیکھا۔ اس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”جنگ کا زمانہ ہے۔ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو گا اور کون کہاں جائے گا۔“ مَیں نے منصُور کا فقرہ دوہر دیا۔

”لیکن تم تو کہا کرتے تھے کہ جدائی کا اثر مختلف طبیعتوں پر جُدا جُدا ہوتا ہے۔ وہی ہوا کے جھونکے جو ذرا ذرا سے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں تیز آگ کے شعلوں کو کئی گن بھڑکاتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ یہ کسی مفکّر کا مقولہ ہے۔“

”جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرو گے؟ یاد ہے نا وہ گیت؟“

گاڑی چل دی۔

کئی برس کے بعد اتفاق پھر مجھے دجلہ کے کنارے لے گیا لیکن اس دفعہ میں سیّاح کی حیثیت سے آیا تھا اور قیام محض گِنے گنائے دنوں کا تھا۔

سیدھا کیمپ پہنچا۔ جاننے والوں میں فقط چند آدمی ملے۔ باقی کے سب جا چُکے تھے۔ برٹن کے دور کا سارجنٹ میجر ابھی تک وہیں تھا اور اب مقامی زبان فَر فَر بولتا تھا۔ وہ میرے ساتھ بازار جاتا۔ جب کبھی ہمیں کوئی اوٹ پٹانگ بے مصرف چیز خریدنے کو کہتا تو وہ بڑے عجز سے "انا مسکین معاِفش فلُوس" دوہراتا۔ اس نے محاورے بھی سیکھ لیے تھے۔ کسی کو لمبی مدّت کے لیے ٹالنا ہوتا تو بڑے اعتماد سے دونوں ہاتھ اٹھا کر بتاتا۔۔۔ "بقرہ المِش مِش!"

سڑک پر گرد اُڑتی تو فوجی لاریوں کی جگہ خوبصورت بھڑکیلی کاریں نظر آتیں۔

بغداد کے دجلے میں روشنیاں اسی طرح جھلملاتیں۔ کناروں سے موسیقی کی تانیں بند ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل رخصت ہو چکی تھی۔ شور و غُل تھا لیکن قہقہے کہیں کہیں سنائی دیتے تھے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد تھا۔ کیمپ سے شمال کا رُخ کیا اور منصُور کے گاؤں پہنچا۔

"دوست مجھے افسوس ہے کہ زیادہ چھُٹی نہیں مل سکی۔ جلد واپس جانا ہو گا۔" میں نے معذرت کی۔

"ملاقات ایک دن کی بھی اچھی ہوتی ہے۔" وہ بہت خوش تھا۔ بار بار شکریہ ادا کرتا۔

اس کے چہرے پر تفکّرات نے لکیریں کھینچ دیں تھیں۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ پہلے تو مہمان نوازی میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا بعد میں اس کے ساتھ ایک لڑکا اور لڑکی آئے۔

"میرے بچّے ہیں۔"

"اور سعدہ کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں کہاں ہے۔ شاید بغداد میں ہو۔ کیوں؟" اسے بڑا تعجب ہوا۔

منصُور اور سعدہ کے متعلق میرا قیاس بالکل غلط نکلا۔

پُرانے دنوں کی طرح سہ پہر کو ہم لمبی سیر پر نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد

اور بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔

جس روز والد صاحب سدھارے اسی دن منصُور کا لڑکپن کہیں بھی ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ سَر سے سایہ اُٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اپنی باری ہے۔ ”وہ میرے نہایت عزیز اور گہرے دوست بھی تھے۔ تنہائی سے ڈر کر رفاقت چاہی اور شادی کی۔ پھر دو بچّے چھوڑ کر وہ بھی چلی گئی۔“

میرے اظہارِ افسوس پر مُسکرا کر بولا۔ ”اور تو اور وہ سب جولانیاں بھی چلی گئیں۔“

کئی مرتبہ جی چاہا کہ مرحومہ کے متعلق پوچھوں۔ کون تھی؟ کیا ہوا تھا؟ لیکن الفاظ ہونٹوں پر آکر رُک جاتے۔

”کبھی کبھی مجھے اپنی زیادتیاں یاد آتی ہیں جو اُن لوگوں سے کیں جو مجھ سے محبت اور شفقت کی توقع رکھتے تھے لیکن تب محسوس تک نہ ہوتا تھا کہ یہ زیادتیاں ہیں۔“

”یاد ہے؟ بوڑھا برٹن نوعُمروں کی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”میرے خیال میں یہ تجربے کی کمی نہیں احساسات کی کمی تھی۔ حال ہی میں مَیں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے گرم کپڑا دیا تو عجز سے بولی۔ ”نہیں مجھے کوئی سستا سا چیتھڑا یا ٹاٹ دے دو۔ میرے اصرار پر کہنے لگی گرم کپڑے تو خوش نصیب پہنتے ہیں۔ میرے لیے ٹاٹ ہی بہت ہے۔ میں تھرّا اُٹھا۔ پہلے بھی ضرورت مندوں کو دیکھا تھا، بلکہ انہیں دیکھے بغیر تقریب سے گزرا تھا۔ لیکن اب کسی ضعیف محتاج کو دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق بھی تو نہیں۔۔۔ اور اچھّے دن بدلتے ہوئے کوئی دیر نہیں لگتی۔ شکار کا شوق بھی نہیں رہا۔ کبھی کبوتروں کے جھُرمٹ یاد آتے ہیں۔ میں فائر کرتا تو جو چھرّوں سے بچ جاتے وہ اپنے زخمی اور مُردہ ساتھیوں کے اُوپر منڈلانے لگتے اور اگلے فائر کی زد میں آ جاتے۔ کبھی کبھی بے شمار آنکھیں سامنے آ جاتی ہیں۔ ہرنوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جن سے آنسو نکل رہے تھے۔۔۔ پرندوں کی متحیّر آنکھیں۔۔۔ جانوروں کی دہشت زدہ آنکھیں۔۔۔ کچھ ایسی جیسے معصوم بچوں کی آنکھیں ہوں اور پوچھ رہی ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا؟۔۔۔ قطار در قطار یہ آنکھیں سامنے سے گزر جاتی ہیں۔

تم پھر بیٹھ کر غروبِ آفتاب دیکھنے لگے۔

شاید اس نے میرا تجسس بھانپ لیا تھا۔ ”تم بالکل نہیں بدلے۔ آج تک تم نے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی جس کے بتانے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچّوں کی خاطر دوسری شادی کر لو۔ لیکن میں اُس مخلص اور وفادار رفیق کو کیسے بھُلا دوں جس نے میرے جھوٹ کو بھی سچ مانا۔ ہمیشہ میری ضد، لاپرواہی اور تلخ رویّے کو ادائے دِلبرانہ سمجھا۔ جس کی نگاہوں میں مجھ سا کوئی اور زمانے بھر میں نہیں تھا۔ اس کی علالت طویل ہوتی گئی۔ میں کچھ دیر پاس بیٹھا تو کہتی جاؤ کسی سے مل آؤ، کہیں سیر کر آؤ، جی بہلے گا۔ مرنے سے دو روز پہلے اس نے میرے سارے کپڑے قرینے سے رکھوائے۔ ملازم کو تاکید کی کہ بغیر ناشتے کے مجھے کبھی باہر نہ جانے دے۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دوں۔۔۔ مجھے یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں بچوں میں زندہ ہے۔۔۔“

مَیں نے بیماری کے متعلق پوچھا۔

”ان دیہاتوں میں طبیب بہت کم ہیں۔ عطائی مریض کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ غلط علاج سے موت واقع ہو جائے تب بھی عزیز و اقارب عطائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے تو پوری کوشش کی تھی لیکن

تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔۔۔ تبھی میں اپنے بچوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں کہ جہاں انہیں تعلیم دینی ہے وہاں انہیں تندرست بھی رکھنا ہے۔ کہیں اپنی مرضی کے خلاف میدانوں میں نہ جانا پڑ جائے۔"

پھر اس نے محاذ کے دوسرے تجربے کے بارے میں پوچھا۔

"پہلے تجربے سے ملتا جُلتا تھا۔"

"اب تم ملک ملک پھر آئے ہو، بحث مباحثوں میں حصّہ لیتے ہو گے ؟"

"نہیں۔۔۔"

"موہن کو بھی یہی شکایت تھی کہ تم اپنی رائے چھپا جاتے ہو۔۔"

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے دنیا ضرور دیکھی تھی لیکن زندگی کی بھٹّی اُسے کُندن بنا رہی تھی۔ میرا ہم سفر مجھ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

"کبھی ضرور بتاؤں گا۔۔۔ وعدہ رہا۔" میں نے کہا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ آسمان شفق سے جگمگانے لگا۔

”زندگی کے رنج والم کے متعلق کسی مدبّر نے کہا تھا کہ اگر دن کے اختتام پر اداس پیلے بھورے، مٹیالے بادل افق پر نہ ہوں تو غروبِ آفتاب رنگین کیونکر ہو گا۔“

صبح صبح مجھے رخصت کرتے وقت اس نے دُور میدانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید مَیں ان پُرشور آبادیوں میں جابسوں اور کچھ عرصے کے بعد ان لوگوں جیسا ہو جاؤں۔ تب ملے تو شاید تم منصُور کو پہچان نہ سکو گے۔“

مَیں روانہ ہوا اور آسان میلا سا تھا۔ جیسے آئینے پر کئی دنوں کی گرد جمع ہو۔ دُھندلاہٹ بڑھتی گئی۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں تو زرد دُھند چھا گئی اور سہ پہر شام میں تبدیل ہو گیا۔

”آندھی آنے والی ہے۔“ ڈرائیور بولا۔

دیکھتے دیکھتے سب کچھ تاریک ہو گیا۔ موٹر کی روشنی فقط چار پانچ فٹ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ہم سڑک پر بالکل آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ پھر دَم گھٹنے لگا۔

”بادِ سموم معلوم ہوتی ہے۔“ ڈرائیور نے بتایا۔

موٹر روک کر ہم دونوں نے مُنہ سر لپیٹ لیا۔ تیز جھکڑوں کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں، گھاس پھونس، کنکریاں نہ جانے کیا کیا اُڑا جا رہا تھا۔ اتنی تیز ہوا کے

باوجود سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

کافی دیر میں آندھی کی شدّت کم ہوئی اور ہم روانہ ہوئے لیکن تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ کچّے پکّے راستے پہلے ہی اَٹ چُکے تھے۔ ہم صحرا میں اندھادُھند چکر لگا رہے تھے۔

گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے۔ اس وقت ہمیں کیپ میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاید ہمارا رُخ غلطی سے پھر پہاڑیوں کی طرف بدل چکا تھا۔ سوچا کہ اب کہیں ٹھہرنا چاہیے۔

دور ایک روشنی نظر آئی۔ قریب پہنچے تو دو لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں جن کے شیشے ہماری موٹر کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سامنے چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں۔

کواڑ کھلے اور ایک گول مٹول چہرہ نظر آیا۔ جلتی ہوئی موم بتّی ہوا کے جھونکے سے بجھ گئی۔ اسے دوبارہ روشن کیا گیا تو دو چہرے اور دکھائی دیئے۔

جس نے دروازہ کھولا تھا اس کے دو ساتھی فرش پر بوتلیں تھامے بیٹھے تھے۔ وہ تینوں تقریباً ایک سے تھے۔ پھُولے ہوئے جسم اور موٹے موٹے نقش۔

ڈرائیور نے مجھے چاۓ کی تھرماس اور سینڈوچز کا تھیلا دے دیا اور خود موٹر میں جا بیٹھا۔

باہر آندھی پھر شروع ہو چکی تھی۔ جھونکے تیز ہوتے تو ان تینوں کی باتیں ہوا کی سیٹیوں اور چیخوں میں گم ہو جاتیں۔۔۔ اس عجیب ماحول میں وہ غول بیابانی معلوم ہو رہے تھے۔

انہوں نے بہت سارا کھانا نکالا۔ میری طرف بھی دیکھا لیکن میں نے سینڈوچز نکال لیں۔

تقریباً سوا ڈیڑھ گھنٹے تک وہ بے تحاشا کھاتے رہے۔ پھر نئی بوتلیں کھول کر باتیں شروع کر دیں۔ وہ جلدی جلدی بولتے اور بار بار قہقہے لگاتے۔

کچھ آندھی کا شور، کچھ اُن کا۔۔۔ ان کی گفتگو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔ لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جو اپنے بھتیجے کا واحد نگران تھا کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکے کا لاکھوں کا بیمہ کرا چکا ہے اور لڑکے کو دانستہ طور پر خطرناک کام دیئے جاتے ہیں، پُر خطر جگہوں پر بھیجا جاتا ہے لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد مجبوراً اس سے وہی سلوک کرنا پڑے گا جو

اس کے بھائی سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ بتا کر وہ زور سے ہنسا۔

دوسرے نے یتیم خانوں اور ایسے دیگر منافع بخش اداروں کی باتیں کیں۔ دولت اور شہرت کے سلسلے میں امیر عورتوں اور بیواؤں کو ورغلانے کے قصّے سُنائے۔ جعلی دستخطوں، جعلی معاہدوں، مصنوعی دوستیاں، عارضی شادیوں اور دیگر چالوں کے متعلق بتایا۔

میں تھکا ہوا تھا۔ دیوار کے سہارے اونگھنے لگا۔

پھر جیسے خرّاٹوں نے چونکا دیا۔

آندھی کا شور ختم ہو چکا تھا۔ دروازہ کھولا تو چاندی اندر آ گئی۔ باہر سب کچھ ساکن تھا۔ آسمان چاند تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ چاند میں وہ تینوں نظر آ رہے تھے۔ ان کے مُنہ کھُلے ہوئے تھے۔ سانس لیتے تو انہیں پھُول جائیں۔ سانس نکلتا تو بڑی بھیانک آواز آئی۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے تین مُردہ جسم شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔

باہر نکل کر دیکھا تو دُور دُور تک قبریں ہی قبریں تھیں۔ آندھی سے بچ کر جہاں پناہ لی تھی وہ اس قبرستان کی کوٹھڑی تھی۔ دفعتاً آنکھوں کے سامنے محاذ کا ایک نظارہ

کوند گیا۔

محاذ پر ایک قبرستان بمباری کی زد میں آ گیا۔ دھماکوں کے ساتھ قبریں کھُل گئیں۔ مُردے دُور دُور جا پڑے۔ کچھ دیر کے بعد جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ ان سپاہیوں کی تھیں جو ابھی ابھی مرے تھے، کچھ برسوں پرانی تھیں۔ نئ پرانی لاشیں، زخمی اور بے ہوش، سب آپس میں اُلجھے ہوئے پڑے تھے۔

موت کیسے کیسے رُوپ بدل کر آتی ہے؟ کبھی پہلے بیماری بھیج کر جسم کو اچھی طرح بھسم کر دیتی ہے۔ کبھی بے خبری میں آن دبوچتی ہے۔ کبھی ایذائیں دے کر ترسا ترسا کر جان لیتی ہے۔ لیکن سب سے ذلیل موت وہ ہے جو زندہ جسم میں یوں حلول کر جاتی ہے کہ سانس آتا رہتا ہے۔ حواس درست رہتے ہیں، لیکن دل و دماغ مر جاتے ہیں، ضمیر مر جاتا ہے، انسانیت مر جاتی ہے۔ قبرستان کی یہ تین زندہ لاشیں بھی طبعی موت سے پہلے مر چکی تھیں۔

دُور افق پر روپہلی لکیر بنی ہوئی تھی۔ یہ دجلہ تھا۔

مَیں اس سمت میں چلتا گیا۔ حتیٰ کہ کنارہ آ گیا۔ دریا کی شفاف سطح پر تاروں کا عکس جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پانی یوں ساکن تھا جیسے لہروں اور گرداب سے ناآشنا ہو۔

ہلکی ہلکی دُھند اُٹھ رہی تھی۔

دوسرا کنارہ اوجھل ہو گیا۔ چاند بے نور ہو کر چھپنے لگا۔ نظارہ سمٹتے سمٹتے محدود ہو تا گیا اور میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہ گیا۔ مشرق سے روشنی پھیل رہی تھی۔ خنک ہوا کے جھونکے آئے۔ طیّور چہچہانے لگے۔

تخلیق تو روشنی، زندگی، رنگ و بُو اور لطافتیں لے کر آئی تھی۔ انسان سے ہمدردی، پاکیزگی اور حُسن و نفاست کی توقعات تھیں۔ دریا خشک ویرانوں کو سیراب کرنے کے لیے بہائے گئے تھے پھر کیا ہوا کہ صدیوں سے ان کا پانی بھی انسان کے خون سے سُرخ ہوا ہے، کبھی کتابوں کی سیاہی سے گدلا بہا ہے اور ان کے کناروں نے ہریالی کی جگہ مایوس کُن نظارے دیکھے ہیں۔

میں واپس پہنچا تو لمبی لمبی کاریں جا چکی تھیں۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ ایک طرف چبائی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں، دوسری طرف خالی بوتلیں۔

ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔

بغداد میں سعدہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس نے سادے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بال بکھرے ہوئے، ننگے پاؤں، میک اَپ کے بغیر۔۔۔ اس حلیے میں وہ چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"سکول سے آئی ہو؟ تمہارا بستہ کہاں ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "میں تو اسی طرح رہتی ہوں۔ آرائش سے مجھے نفرت ہے۔ اُن دِنوں پارٹیوں دعوتوں کے لیے مجبوراً بننا سنورنا پڑتا تھا۔"

مَیں نے منصُور کا ذکر کیا۔

"وہ بھی چلا گیا۔ دوسرے بھی چلے گئے۔"

"لیکن میں تو سمجھتا تھا کہ منصُور اور تم۔"

"منصُور سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

پرانے ساتھیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ "برٹن نے گریس سے شادی کر لی تھی جو اسے زبردستی اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی۔ حب برٹن تندرست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو اسے خود بھی علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے مگر مہینے کے اندر اندر

شادی ہو گئی۔ اس کا جوان بھتیجا قاہرہ سے تقریب میں شرکت کرنے آیا تو کئیوں نے مغالطے میں اسی کو دولہا سمجھا۔ موہن اپنے لکھ پتی خُسر کے انتقال پر چھُٹی لے کر ہندوستان گیا۔ واپس آیا تو اور بھی زیادہ غمگین تھا۔ خُسر اتنا مقروض نکلا کہ ساری دولت قرضوں کی ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ موہن کو امید تھی کہ بیوی کے سَر سے امارت کا بھوت اُتر چکا ہو گا لیکن مفلسی میں بھی بیوی کا رویہ اتنا ہی تلخ تھا۔

جرجیس بڑے مزے میں ہے۔ کہیں جا رہا تھا کہ موٹر اُلٹ گئی۔ اتفاق سے جس نے ترس کھا کر تیمارداری کی وہ بڑے مالدار شخص کی اکلوتی بیٹی نکلی۔ ترس دوستی میں تبدیل ہوا اور دوستی محبت میں۔ آخر لڑکی کے باپ نے جرجیس کو بیٹا بنا کر لڑکی اور دولت اس کے حوالے کر دی۔ اب وہ دوستوں اور جاننے والوں کو خوب قرض دیتا ہے۔ چند مہینے ہوئے بازار میں مل گیا۔ بار بار پوچھتا تھا کہ قرض لو گی؟ ان دنوں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے یورپ گیا ہوا ہے۔ روز نے ولایت پہنچ کر بزنس شروع کی تھی۔ بڑے فارمولے لگائے، ساری ریاضی صرف کر دی لیکن کچھ نہ ہوا اور اکثر جواب غلط نکلے۔ اور بزنس چھوڑنی پڑی اور ان دنوں کسی سکول میں حساب پڑھاتا ہے۔ جرجیس نے بتایا تھا کہ وُڈ اس قدر مذہبی ہو گیا ہے کہ سب محلّے والوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ اور یہ کہ اس نے جرجیس سے تمہارا اور روز کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ اگر وہ کہیں اتفاق سے مل جائیں تو بتانا کہ

اب میں بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ خالق نے جس صنّاعی سے انسانی جسم بنایا ہے اس کی تعریف ڈاکٹر زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور یہ کہ جس ہنرمندی سے کائنات اور نظامِ شمسی کو ترتیب دیا گیا ہے، کسی عظیم ریاضی دان کا کام ہی ہو سکتا ہے۔"

"اور سلیم؟"

"سلیم کروڑپتی ہے اور پہلے سے کہیں فربہ۔"

"اور تم؟"

"سلیم اور دوسرے اکثر مجھ سے جذباتی قسم کی باتیں کیا کرتے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ ان جذبات کی تہہ میں تنہائی کارفرما ہے یا شراب کا نشہ۔ تم بتاؤ، تمہارے ہونٹوں سے کبھی ایک لفظ تک نہ نکلا؟"

"نہ تنہا تھا، نہ نشے کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"کون ہے جس نے تمہاری قوتِ گویائی سلب کر رکھی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔۔۔ سچ مچ!"

"اب بھی سوچ رہے ہو۔۔۔ کچھ تو کہو۔"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ کبھی مشاہدے میں غلطی ہو جاتی ہے کبھی فکر و عمل میں مطابقت نہیں رہتی تو کبھی نظریے بھٹکنے لگتے ہیں۔"

دیر تک خاموشی رہی۔

سلیم کا ذکر پھر آ گیا۔ وہ افسردہ آواز میں بولی۔ "جس سے واقفیت رہ چکی ہو اُسے کیا بُرا بھلا کہنا۔ میں نے تو اوروں کے خلاف بھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس اندھیرے میں کبھی کبھی جگنو چمکتے تھے۔ چنگاریاں بھڑکتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں۔"

اگلے روز مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آئی۔

"یاد ہے؟ یہی پلیٹ فارم تھا، یہی وقت تھا۔ تب تم نے چھوٹا وعدہ تک نہ کیا اور اب تو تم وطن جا رہے ہو۔"

ٹرین چلنے لگی۔

"میں تمہیں بصرے سے خط لکھوں گا۔"

"سب یہی کہتے تھے۔ کسی نے دجلے کے کناروں سے خط نہ لکھا۔ بصرے سے تو

سمندر شروع ہو جاتا ہے۔"

بصرے میں دریا کے کنارے ایک دکان سے چند کارڈ لیے جن پر دجلے کی رنگین تصویر تھی۔ ان پر سعدہ، منصُور اور پرانے ساتھیوں کے پتے تحریر کیے، ٹکٹ لگائے۔ سوچنے لگا اور کیا لکھوں؟

کئی فقرے ذہن میں آئے لیکن قلم ساکن رہا۔ سٹیمر کی روانگی میں فقط چند منٹ رہ گئے تھے۔

دفعتاً حکیم بقراط کا وہ قول یاد آ گیا۔۔۔

زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں۔ تجربہ خام ہے، اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل!